قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2015، قیمت -/15 ₹

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

بھارت کے انمول رتن

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

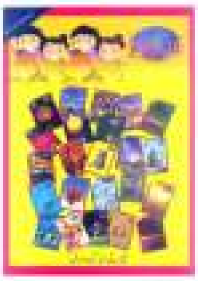

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

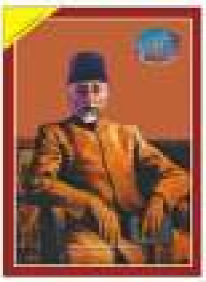

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

ماہنامہ اردو دنیا

(Monthly) URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:10 اکتوبر 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

رتن سنگھ سے گفتگو — ریحانہ سلطانہ 8

گوشہ سرسید احمد خاں

سرسید ماہ و سال کے آئینے میں — خلیق احمد نظامی 10

سرسید کا نظریۂ دین و دنیا — افتخار عالم خاں 11

متحدہ قومیت اور سرسید — عبداللہ سلمان 13

سرسید اور بنارس کی اصلاحی سرگرمیاں — جاوید اختر انصاری 17

اردو زبان اور اس کی ترقی — سرسید احمد خاں 20

اردو زبان اور اس کا بیان — سرسید احمد خاں 21

زبان و تعلیم

اردو لفظیات تفہیم نو کی ضرورت — اقتدار حسین خاں 22

برٹن کالج کی اردو خدمات — ریاض احمد 24

ادبی مباحث

فلسفۂ وجودیت کے اساسی محرکات — وحید الظفر خاں 27

مابعد جدید تنقید پس منظر و پیش منظر — قدوس جاوید 30

تانیثیت کے بنیادی مقدمات — ابوالکلام قاسمی 34

نقد و نظر

دنیائے ادب کی دس عظیم کتابیں — غلام نبی خیال 37

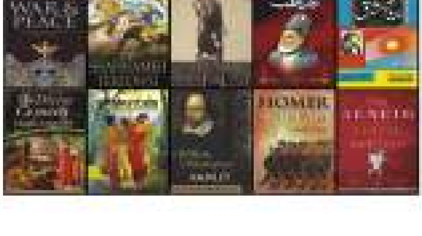

ظفر کی شاعری میں ہندوستانی رنگ — نجمہ رحمانی 44

اردو کے ہندو مرثیہ گو — مظفر عباس 46

مراثی انیس اور جذبات کے گیارہ رس — بھیجے کمار 48

خراج عقیدت

گاندھی جی کے تعلیمی افکار — محمد نعمان خان 51

مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد — آفاق حسین صدیقی 54

پروفیسر نصرالدین شاہ ثاقب — عبیدالرحمن ہاشمی 56

مجروح سلطانپوری کا تخلیقی بانکپن — انور ظہیر انصاری 58

بازیافت

ایک گمنام ڈراما نگار: عشرت — احمد وصی 60

شخصیت

تاجیکی ادب کا درخشاں ستارہ ابوالقاسم لاہوتی — عابدہ خاتون 62

صد سالہ یوم پیدائش

ایک روشن خیال شخصیت بھیشم ساہنی — انیس امروہوی 65

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 69

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 78

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 79

ہماری بات

زبانوں کو زندگی جذبے اور جنون سے ہی ملتی ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانیں اسی جنون کی وجہ سے زندہ ہیں ورنہ ہر روز کوئی نہ کوئی زبان مرتی ضرور ہے۔ ایک سروے کے مطابق تقریباً سیکڑوں زبانیں دنیا سے ناپید ہو چکی ہیں۔ دنیا کی بڑی زبانوں کے ساتھ اردو زبان بھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس زبان کو نئی نئی زمینیں مل رہی ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ایک سخت جان زبان ہے جس نے ہزار کشاکش اور تلاطم کے باوجود بھی اپنے وجود کو باقی رکھا ہے۔ اب اس زبان نے سائبر اسپیس میں بھی اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے ہیں اور تکنیکی و سائنسی ترقیات سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ اردو کے اس پھیلتے دائرے اور وسیع ہوتے رقبے کی ایک وجہ اس کی انجذابی قوت بھی ہے۔ اس زبان نے کسی بھی زبان کے لفظ کو اخذ کرنے میں کبھی کوتاہ نظری کا ثبوت نہیں دیا بلکہ ہر خوب صورت اور معنی خیز لفظ کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اپنی شیرینی کی وجہ سے اس زبان نے ان علاقوں میں بھی اپنی محبوبیت قائم کی ہے جو اس زبان کی نزاکت اور لطافت سے نابلد ہیں۔ اردو زبان نے عالمی سطح پر نئی بستیاں بھی آباد کی ہیں اور ان بستیوں میں اردو کے رسائل و جرائد بھی شائع ہوتے ہیں۔ تخلیق کاروں کی بھی ایک کہکشاں ہے۔ جن کا اردو سے صرف خلوص اور محبت کا رشتہ ہے۔ ان لوگوں کے لیے اردو مادّی منفعت کا ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اردو کو اپنی تہذیبی روایت اور ثقافتی مظہر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ نامانوس اور اجنبی علاقوں میں اردو کی خوشبو پھیل رہی ہے مگر وہ زمینیں جو کبھی اردو کے لیے زرخیز تھیں اب وہاں اردو کی حالت یا تو خستہ ہے یا وہاں اردو کے فروغ کے امکانات محدود ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ جو بھی رہی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک زبانوں کے فروغ کا کوئی مضبوط میکانزم تیار نہیں کیا جائے گا۔ تب تک زبان کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے گو کہ بہت سی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، بہت سے ادارے بھی سرگرم ہیں، تحریکیں بھی وجود میں آ چکی ہیں لیکن عملی طور پر کوئی ایسا مربوط نظام قائم نہیں ہو سکا ہے جس سے اردو زبان کو فروغ دیا جا سکے۔ جبکہ اردو کے لیے اب بہت سے امکانی علاقے بھی ہیں جہاں پہ دستک دینے سے اردو کے لیے بہت سے دروازے کھل سکتے ہیں۔ ان امکانی علاقوں کی جستجو اب اردو سے وابستہ تنظیموں اور اداروں کا فرض ہے۔

قومی اردو کونسل بھی اس تعلق سے سنجیدہ ہے اور وہ زبان کے فروغ کے لیے ممکنہ نکات پر غور و فکر کر کے ایک لائحۂ عمل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی کونسل کی ان کوششوں سے فروغ اردو کے مفید نتائج سامنے آئیں گے اور مختلف سطحوں پر جو جمود اور تعطل ہے اس کا خاتمہ ہوگا۔ اس سلسلے میں اردو تنظیموں سے جڑے ہوئے احباب بھی اپنے مشوروں سے نوازیں تو کونسل کو فروغ اردو کے لیے ایک مستحکم میکانزم تیار کرنے میں آسانی ہوگی۔

قومی اردو کونسل کا ترجمان 'اردو دنیا' کے شمارے میں فروغ اردو کے تعلق سے بھی کچھ مضامین شامل کیے گئے ہیں، خاص طور پر ان علاقوں کی اردو خدمات کو بھی روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے جو اردو کے لیے غیر مانوس ہیں۔ مگر وہاں بھی اردو سے محبت کرنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ گو کہ اردو زبان کا ان کی تہذیب اور ثقافت سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہے مگر اردو کی مٹھاس اور شیرینی نے انھیں بھی اپنا اسیر کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں روزگار کے مواقع کے حوالے سے بھی تحریر شامل کی جا رہی ہے کہ موجودہ صارفی دور میں اردو کو روزگار سے جوڑ دیا جائے تو اس کے فروغ کی راہیں روشن ہو سکتی ہیں۔

اکتوبر کے مہینے سے باپائے قوم مہاتما گاندھی (پیدائش: 2 اکتوبر 1869) اور سرسید احمد خان (پیدائش: 17 اکتوبر 1817) کا تعلق ہے۔ اس لیے ان دونوں عظیم شخصیات سے متعلق مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔ جن کی قوت فکر و عمل سے ہمیں روشنی ملتی ہے۔ ان دونوں ہی ہستیوں نے ہندوستان کی سماجی، تعلیمی، فلاح و بہبود کے لیے جو جدوجہد کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ سرسید کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک مختصر گوشہ بھی شریک اشاعت کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اہم ادبی مباحث بھی شامل کیے گئے ہیں جن سے نقد و نظر کے نئے دروازے کھلیں گے۔ ان تمام مضامین میں کوشش کی گئی ہے کہ قاری کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو۔ یقینی طور پر یہ تمام مضامین ذہنوں پر نئی دستک دیں گے اور زبان و ادب کی نئی لہروں سے آشنا کریں گے۔

ہمیں امید ہے کہ اردو دنیا کا یہ شمارہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

ڈاکٹر ریحان حسن
شعبۂ اردو و فارسی گرو نانک دیو یونیورسٹی، امرتسر (پنجاب)

'اردو دنیا' ستمبر 2015 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ بلاشبہ یہ رسالہ علمی، تحقیقی اور معلوماتی مضامین کی بدولت تشنگان اردو کی پیاس بجھانے میں ممد و معاون ہے۔ اکثر مشمولات معلوماتی اور مفید ہیں گوشۂ راجندر سنگھ بیدی میں شائستہ فاخری، شکیل احمد، حاذق فرید، محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے بیدی اور افسانوں کے حوالے سے اہم نکات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں پنجابی عناصر کے حوالے سے بھی اگر کسی قلمکار کا مضمون شامل ہوتا تو گوشۂ بیدی میں چار چاند لگ جاتے اس لیے کہ ان کے افسانوں میں پنجابی تہذیب ہی نہیں بلکہ پورا پنجاب بولتا ہے۔

گوشۂ عبداللہ حسین کے بیشتر مشمولات بہت ہی وقیع اور معلومات افزا ہیں۔ اس کے علاوہ محمد خلیل نے ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی شخصیت سے بخوبی متعارف کرایا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کا خاکہ بھی اچھا لگا اس خوبصورت تخلیق کے لیے سہیل انجم کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اردو دنیا اگست 2015 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ بھی پچھلے شماروں کی طرح حسن کتابت وطباعت کا مثالی نمونہ ہے اور اس سے بڑھ کر حد درجہ معلوماتی اور محققانہ مضامین کا نمونہ ہے۔ یہ مضامین ہیں: نکتۂ سب سے بڑا روحانی اعزاز ہے، ہندوستان کی آزادی اور اردو نظم، اصناف سخن پر سرسری مطالعہ، اردو زبان و ادب (ناولوں کے کردار) ہفت تماشا اور انیسویں صدی کا ہندوستان، آزادی کی تحریک اور ہندوستانی سنیما۔

کرشن بھاؤک
A-201، گورو نانک نگر گلی نمبر 18-K، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' اگست کا شمارہ محترمہ عصمت چغتائی جیسی شہرۂ آفاق ادیبہ کے فکر و فن کے گوشے سے مزین

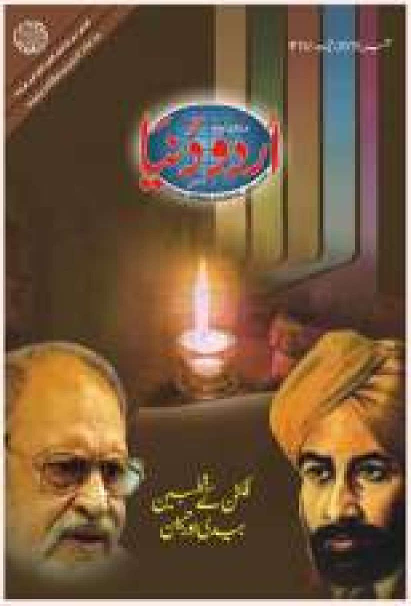

ہے۔ موصوف سے متعلق تمام مضامین اعلیٰ درجے کے ہیں۔ اس شمارے میں ہندی فلموں کے موضوع پر ایک 'اتھارٹی' (Authority) مانے جانے والے جناب انیس امروہوی کا بلند پایہ مقالہ زیر عنوان 'آزادی کی تحریک اور ہندوستانی سنیما' بہت پسند آیا۔

ڈاکٹر الف انصاری صاحب کی ایک ضخیم کتاب ہندوستانی فلموں کا آغاز و ارتقا دو جلدوں میں اردو سنیما کی صدی منائے جانے پر دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ اس میں بھی انیس امروہوی صاحب کا ایک مضمون زیر عنوان 'تحریک آزادی اور ہماری فلمیں' شامل ہوا تھا۔ اس میں انیس امروہوی نے لکھا تھا کہ اردشیر ایرانی نے سنہ 1931 میں اپنی پہلی متکلم فلم کی نمائش کی۔ (ص 103) جبکہ 'اردو دنیا' کے اس تازہ شمارے میں اپنے مضمون کے اول صفحے پر ہی انیس امروہوی صاحب نے اردشیر ایرانی صاحب کی بابت یہ غلط بیانی کی ہے کہ انھوں نے "1936 میں ہندوستان کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کی نمائش کی۔" (صفحہ 65) اس ایک استثنا کے علاوہ اس مقالے کے آخر میں موصوف کے اس خیال سے صد فی صد متفق ہوا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک آزادی پر اتنی بڑی اور زیادہ فلمیں نہیں بنی ہیں جتنی کہ درکار تھیں۔ اس خاکسار کی رائے تو یہ ہے کہ ہندی ہی کیا، دیگر زبانوں کی فلم انڈسٹریوں کو بھی اس جانب جلد از جلد اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ اس شمارے میں بلال احمد میر صاحب کا میری دانست میں حاصل شمارہ مضمون زیر عنوان 'ہندوستان کی آزادی اور اردو نظم' بھی لائق مدح ہے۔ اس میں اردو شاعری کی چیدہ چیدہ نظموں و غزلوں سے ایسے برمحل حوالے دیے گئے ہیں، جو کہ در خور تعریف ثابت ہوتے ہیں۔

صادق علی انصاری
نشیمن 198 اے، شیخ سرائے، سیتاپور

69 ویں یوم آزادی پر مبنی سرورق سے مزین رسالہ اردو دنیا بابت ماہ اگست 2015 مورخہ 28 جولائی کو ہی مل گیا۔ اردو دنیا کے گذشتہ تمام گوشوں میں عصمت چغتائی پر ایک اور اچھے گوشے کا اضافہ ہوگیا یہ آپ کی نمائندگی کی اچھی ابتدا ہے۔ تمام مشمولات اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں۔ بلال احمد میر کے مضمون نے معلومات میں اضافہ کیا کہ "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" غزل بسمل عظیم آبادی کی ہے۔

ضلع بہرائچ کے سفر سے متعلق عصمت چغتائی پر ڈاکٹر صبیحہ انور کا مضمون عمدہ ہے۔ 'اصناف سخن سرسری مطالعہ' بے حد کارآمد مضمون شامل شمارہ ہے۔ آج کے شعرا اسے پڑھیں اور عمل کرکے معیاری شاعری کر سکتے ہیں۔ رضوانہ ارم کا مضمون مزاحمت کی تعبیر و تفہیم ایک بہت اچھی پیشکش ہے۔ مجھے یہ مضمون بہت اچھا لگا۔ مضمون میں تاثر پیدا کرنے کے لیے اچھے اچھے اشعار تحریر کیے گئے ہیں۔ مضامین میں جہاں جہاں مذہبی اور اخلاقی قدروں کو زور و جبر سے تعبیر کیا گیا ہے میں اتفاق نہیں کرتا۔

شکیل سہسرامی

اردو ایکشن، بہار ودھان پریشد، پٹنہ 15

اس بار کا اردو دنیا عصمت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہان عصمت کا مطالعہ بھرپور ہے اور حاصل شمارہ بھی۔ جناب رؤف صادق، حنیف نکہی اور صغیر افراہیم کے مضامین اپنے مواد کے تعلق سے کئی نئے گوشے پیش کرتے ہیں۔ محترمہ رضوانہ ارم اور مہتاب جہاں کی نثریں انفرادیت کی حامل ہیں۔ یہ امر باعث ہے کہ ہندوستانیت کی جیتی جاگتی تصویر فلموں میں اور ریشم بھگتی نغموں میں ہی نظر آتی ہے، جنھیں دیکھ سن کر حب الوطنی کا جذبہ دو آتشہ ہوجاتا ہے، عملاً تو جو حال ہے، سب کے سامنے ہے۔ اس حوالے سے انیس امروہوی صاحب قابل مبارکباد ہیں۔ قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں اردو کا اعلیٰ معیار قائم کرتی نظر آتی ہیں۔

ملک العزیز کاتب

43، وی پی کالونی، چتنی 23

اگست 2015 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ آپ یہ بہت اچھا کرتے ہیں کہ تقریباً ہر ماہ کسی نہ کسی نامور شاعر یا ادیب پر گوشہ نکال کر جدید نسل کو اپنی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی بھی اردو ادب کا ایک بہت بڑا اور مؤثر نام ہے۔ مگر بنیادی طور پر عصمت چغتائی کا ادب اس سوال کو شدومد سے اٹھاتا ہے کہ کیا ادب کا مقصد سماج کی اصلاح ہے یا محض حقیقت نگاری کے نام پر فحش نگاری اور جنسی تلذذ کو فروغ دینا ہے۔ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ محض اچھی اسلوب نگاری ہی اچھا فن ہے یا فکر انگیزی بھی اچھے ادب کا لازمی حصہ ہے۔ صالح ادب کا یہ لازمی مطلب نہیں کہ آپ کو عقائد و عبادات کی طرف راغب کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ سماج میں باہمی بھائی چارہ اور پرسکون زندگی کی راہیں تلاش کی جائیں۔ عصمت نے حقیقت نگاری او آزادی نسواں کے نام پر اخلاقیات کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا ہے۔ 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں بلکہ اس سے بہت پہلے بھی مسلم سماج میں مسائل ضرور تھے جن میں عورتوں کا جسمانی اور جذباتی استحصال ہوتا رہا۔ مگر یہ مسائل تو پورے ہندوستانی سماج کے تھے۔ ہندو سماج بھی اس سے مبرا نہیں تھا۔ مگر استحصال سے آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ ایک عورت مادر پدر آزاد ہوجائے۔ یہ محض ایک استحصال سے نکل کر دوسرے استحصال کی طرف جانا ہے اور اس کا نام آزادی نہیں ہے۔ کیا عصمت اور ان کے ہمنواؤں کے

روبرو مغربی دنیا کی 'آزادی نسواں' کے ثمرات آشکار نہیں ہیں۔

بہر حال عصمت، اسلوب نگاری اور لسانی چابکدستی میں بے مثل اور یکتا ہیں مگر نظریاتی طور پر انھیں مسترد کیا جانا چاہیے اور آزر تہذیب کے اس بت کو ٹوٹ کر بکھرنا ہی چاہیے۔

سلمان جونپوری

23 اقرا ڈپلیکس، ناروِل، احمد آباد

'اردو دنیا' کا اگست کا شمارہ حسب معمول بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ 'اردو دنیا' کے تعلق سے کچھ کہنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ اردو دنیا ادبی رسائل میں اپنی علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔ چاہے طباعت ہو یا مواد ہر لحاظ سے 'اردو دنیا' ادبی رسائل میں ممتاز نظر آتا ہے۔

زیر نظر شمارہ بھی اپنے سابقہ شماروں کی طرح جاذب نظر سرورق اور عمدہ مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ اردو دنیا کی عظیم شخصیت محترمہ عصمت چغتائی پر گوشہ پسند آیا۔ عصمت چغتائی کے تعلق سے سبھی مضامین کافی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ جمیل اختر نے عصمت چغتائی کا زندگی نامہ بہت اچھے انداز سے سپرد قلم کیا ہے اس کے علاوہ عصمت چغتائی کے فکر و فن پر تمام مضامین بہت خوب ہیں۔ عصمت صاحبہ کی تحریر یا اللہ یہ فحش نگاری' کیا ہے اور زہر کا پیالہ' بہت خاصے کی چیز ہیں۔

اقبال مجید صاحب سے غضنفر صاحب کا لیا ہوا انٹرویو دستاویزی نوعیت کا حامل ہے۔ اصناف سخن سرسری مطالعہ بہت پسند آیا۔ 'ہندوستان کی آزادی اور اردو نظم' دلچسپ تحریر ہے۔ اس کے علاوہ پریم چند کی مکتوب نگاری، مزاحمت کی تعبیر و تفہیم، اردو نظم مغربی اصناف سخن اور شعری ہیئتیں نے شمارے میں چار چاند لگا دیے دیگر مضامین و کتابوں پر تبصرے اردو دنیا کی خبریں بھی لائق مطالعہ ہیں!

محمد کلام

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی

'اردو دنیا' برائے اگست دستیاب ہوا۔ اردو دنیا کا ہر شمارہ بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے، خواہ وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا انتخاب ہو یا ہماری صحت اور دیگر سماجی موضوعات سے متعلق مضامین ہوں، ان کے معیار میں مسلسل بلندی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ اس سے اردو زبان و ادب کے حوالے سے ادارے کی گرم جوشی اور بہتر کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

موصولہ شمارے کا سرورق ترنگے سے مزین کر کے جہاں آپ نے اردو والوں کی وطن پرستی کو ظاہر کیا ہے وہیں اس کے اندرونی صفحات پر عصمت جیسی ممتاز فکشن نگار کا گوشہ شائع کر کے اپنے پیش روؤں سے ہماری عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔ اردو دنیا کی جو ایک چیز مجھے بہت پسند آئی وہ اردو کے معروف ادیب اور تخلیق کار حضرات سے تبادلۂ خیال ہے۔ زیر نظر شمارے میں غضنفر اقبال نے بزرگ افسانہ و ڈراما نگار اقبال مجید صاحب سے اردو کے حق میں بے حد مفید گفتگو کی ہے۔ اردو تنقید کے تعلق سے ان کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ مجید صاحب کی باتیں اردو سے ان کی والہانہ محبت کا پتا دیتی ہیں اور یک بارگی ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے کہ آج کی اس تعصباتی فضا میں بھی ایسے لوگ زندہ ہیں جن کا مقصد علم دوستی اور انسان دوستی ہے۔

شمارے میں عصمت چغتائی پر جمیل اختر صاحب کا 'زندگی نامہ' قابل ستائش ہے۔ اشاریہ سازی موصوف کا شعبہ رہا ہے جو تشنگان تحقیق کے لیے بڑا معاون ہے۔ اس زندگی نامے سے NET/JRF کے موجودہ PATTERN کے مطابق بہت سے معروضی سوالات بنائے جا سکتے ہیں۔ 'اردو ادب کوڈ' بھی ایک نئی چیز سامنے آئی ہے اور مذکورہ امتحان کے تعلق سے مفید معلوم ہوتی ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم صاحب کے مضمون نے مجھے پریم چند کی تخلیقی دنیا کی ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ غرض شمارے کے تمام مشمولات لائق داد اور قابل تحسین ہیں۔

جمال اختر انصاری

ریٹائرڈ سینئر اوورسیئر، روڈ نمبر 2، گلی نمبر 4، محلہ پرانی کریم گنج گیا

جولائی 2015 کا شمارہ 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ حسن طباعت و کتابت سے مزین، محققانہ و معلوماتی مضامین پر مشتمل یہ جریدہ دیکھ کر طبیعت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ محترمہ شاہین سلطانہ کی پیش کردہ تحریر بہار کے افسانہ نگاروں کے کارناموں پر تحقیقی مضمون پڑھ کر مجھے کافی جانکاری حاصل ہوئی۔ جناب وہاب اشرفی صاحب کے اقتباس کے حوالے سے نثر نگاروں کا جو ذکر کیا ہے بہت معلوماتی ہے۔ محترمہ شکیلہ اختر جو اختر اورینوی کی شریک حیات تھیں، ان کا تعلق گیا شہر سے رہا ہے۔ یقیناً وہ بلند پایہ افسانہ نگار رہی ہیں۔

گیا شہر میں ایک نامی گرامی شخصیت ڈاکٹر ابوالخیر صاحب تھے۔ محترمہ شکیلہ اختر انھیں کی صاحبزادی تھیں۔ محترمہ شاہین سلطانہ صاحبہ نے بہار کے جن افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے، ان کے افسانوں کی دوبارہ اشاعت کی جاتی تو ہم جیسے ضعیف العمر کو پھر سے پڑھنے کا موقع مل جاتا۔

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو اترپردیش، ٹانڈہ، رامپور، یوپی

جون 2015 کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ جناب افتخار عالم صاحب کا مضمون اردو کی سائنسی استعداد، جناب شمس الاسلام فاروقی صاحب کا مضمون 'اردو میں سائنسی ادب' خورشید عالم صاحب کا مضمون 'ادب اور سائنس' اسعد فیصل صاحب کا مضمون 'حالی کا سائنسی شعور' اور جناب انیس الرحمن خاں کا 'سائنس اور ریوگ' بے حد معلوماتی ہیں۔ ہمالیہ (نیپال) میں اردو ادب پر جناب نسیم احمد نسیم صاحب نے بہت محنت کی ہے اور قارئین کو نئی معلومات سے سرفراز کیا ہے۔ جناب محمد ارشد صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی شاعری اور جناب فاروق ارگلی صاحب نے ادا جعفری کی زندگی پر مفصل طریقے سے معلومات فراہم کی ہیں۔

ایم راگھوراؤ

سات تحصیل آفس، چھندواڑا 480001

عصمت چغتائی پر اردو دنیا کا گوشہ بہت عمدہ ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنی کہانیوں کو زندگی کے مختلف رنگوں سے اس طرح سجایا ہے کہ انسانی فطرت کے ہزاروں نقوش، کیفیت وجذبات ان میں سمٹ آئے ہیں۔ انسانی

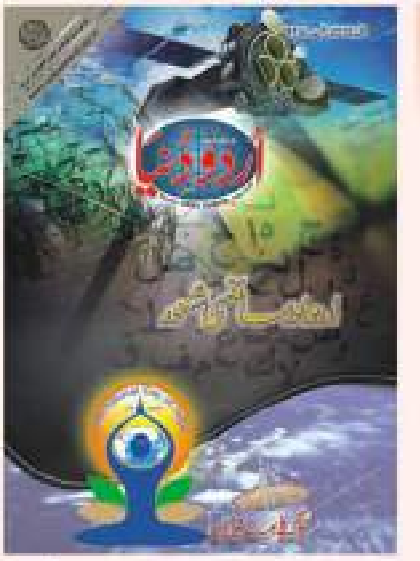

رشتوں اور پیچیدگیوں کے علاوہ عصمت نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی غور کیا ہے، ان کو سماجی حقیقت نگاری پر عبور حاصل ہے۔

سید سلمان احمد

ایڈن پبلک اسکول، عقب ٹیلیفون ایکسچینج، شاہجہاں پور

میں ایک عرصے سے دنیائے اردو کے معتبر ومشہور جریدے 'اردو دنیا' کا قاری ہوں، جریدہ اپنی ہمہ جہتی شان ومعیار کی وجہ سے اردو کا منفرد جریدہ ہے، خصوصاً اس میں اردو کی اہم شخصیات پر مضامین کا سلسلہ، اس کی خصوصیت میں چار چاند لگاتا ہے، پچھلے شماروں میں حالی پر مضامین کا سلسلہ بہت پر مغز ومفید تھا، اسی طرح ٹیگور اور علامہ اقبال، رضا نقوی واہی، نیز سید حامد صاحب مرحوم پر گراں قدر مقالات، مندرجات جریدہ ہونے، ماہ جون کا شمارہ بھی، حسب روایت موضوعات کے تنوع کا حامل رہا، ساتھ ہی آج کے دور میں جس موضوع کی سب سے زیادہ ضرورت و اہمیت ہے وہ موضوع سائنس ہے، جس کی طرف اردو والے کم توجہ دیتے ہیں، اس لحاظ سے اس موضوع پر تحریروں کا سلسلہ شروع کرنا بھی ایک اہم قدم ہے، اسی شمارے میں مقصود شیخ صاحب کا انٹرویو پڑھنے کا شرف حاصل ہوا جو اردو کی ترقی اور اس کے مستقبل سے متعلق بہت چشم کشا ہے، بالخصوص موصوف نے اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے بعض ایسے امور پر مدلل انداز میں بات رکھی ہے جس پر عمل کرنا نہایت آسان اور انجام کے اعتبار سے بہت نتیجہ خیز ہے۔

عموماً ہند وپاک سے تعلق رکھنے والے یورپ وامریکہ کی شہریت کے حاملین کی طرح مقصود شیخ صاحب میں تنگ نظری نہیں پائی جاتی، بلکہ مقصود صاحب اعتدال کے ساتھ ادب کے تنوع پر کامل یقین رکھتے ہیں اور ادب اسلامی وغیر اسلامی کے سلسلے میں جو بات انھوں نے رکھی ہے وہ بھی برحقیقت ہے جسے وسعت نظری اور سوچ وفکر کی شفافیت سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔

یوں تو مقصود شیخ صاحب پر کئی اہل قلم کی خوب صورت تحریریں سامنے آئی ہیں اور ان کی خدمات اردو کا کھاتا تقریباً سات دہوں سے متجاوز ہے نیز ان کی توصیف وتعریف کرنے والوں میں، اردو کی بہت بزرگ ومحترم شخصیت جناب محمد احمد سبزواری صاحب بھی ہیں جنھوں نے -ماشاء اللہ- اب تک زندگی کی سو سے زیادہ بہاریں دیکھ لی ہیں اور آج بھی ان کا قلم تازہ گل چینی کرکے فضائے اردو پر خوشبو بکھیرتا نظر آتا ہے۔ اس انٹرویو نے ان کی شخصیت پر بہت اہم ومفصل معلومات درج کی ہیں جن سے مقصود کبھی آسان ہوتی ہے اور بہت پر لطف بات یہ ہے کہ عمر کے اس دورانیے میں بھی مقصود شیخ صاحب بہت پر عزم ہیں اور اردو ادب کے دامن میں نئے نئے لعل وگوہر بھرنے کے لیے مستعد ہیں، کچھ عجب نہیں کہ ان کا شستہ قلم کسی بھی وقت، فضائے ناول پر کوئی انوکھی خوشبو بکھیر دے۔ ہم حواس خمسہ سے اس مبارک گھڑی کے منتظر ہیں۔

عبدالحی پیام انصاری

پپر ولی بازار، ضلع گورکھپور (یوپی)

'اردو دنیا' کے اگست کے شمارے میں عصمت چغتائی پر گوشہ نکال کر ان کی یاد اور کارنامے کو تازہ کردیا ہے۔ یہ کام قابل ستائش ہے۔ باقی مشمولات بھی پسند آئے۔

■

گزارش

قلمکار خواتین و حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا ایک مختصر تعارف، بایوڈاٹا (Biodata)، مضمون کے غیرمطبوعہ ہونے کا تصدیق نامہ اور پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

ریحانہ سلطانہ

رتن سنگھ سے گفتگو

رتن سنگھ ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے فکشن کا زریں دور دیکھا ہے اور اردو زبان کو ہزاروں سال لمبی رات، کاٹھ کا گھوڑا اور پناہ گاہ جیسی شاہکار کہانیاں بھی دی ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کا رشتہ اس ثقافت اور معاشرت سے جوڑا ہے جس سے آج کا ایک بڑا طبقہ ناآشنا ہے۔ رتن سنگھ نے ماضی کے دریچے وا کیے ہیں اور یادوں کے کولاژ سے اپنی کہانیوں کے نگار خانے کو سجایا ہے اور کہانیوں کے ذریعے ایک عہد کی ثقافت اور معاشرت کی تاریخ بھی مرتب کر دی ہے۔ ان کی کہانیوں کو سوانحی بیانیے کے طور پر پڑھا جائے تو ایک خاص عہد کے طرز فکر اور معاشرت کی تصویریں بھی نگاہوں کے سامنے آجائیں گی۔ رتن سنگھ کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں خاص طور پر پنجابی ان کی مادری زبان ہے اس لیے ان کے اردو افسانوں کی زبان میں بھی پنجابی لفظیات کی وجہ سے ایک خاص طرح کی کشش اور مقناطیسیت پیدا ہو گئی ہے۔ رتن سنگھ نے افسانے، ناول، خودنوشت اور تراجم کے ذریعے اردو ادب کی ثروت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ حال ہی میں اردو دنیا کے لیے ہمارے عہد کے بزرگ فکشن نگار رتن سنگھ سے ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے گفتگو کی ہے جو قارئین کی نذر ہے:

ریحانہ سلطانہ: آپ نے کہانی کب اور کیسے لکھنا شروع کی؟

رتن سنگھ: جون 1953 میں میری پہلی کہانی 'ہمی تم ایک دیوار ہو' شائع ہوئی تھی، کراچی میں۔ اس سے قبل غالباً دو تین سال پہلے سے پنجابی میں نظمیں لکھا کرتا تھا۔ ایک روز ریلوے کے دفتر میں ہی رام لعل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کو میں نے اپنی ایک نظم سنائی 'چھٹے والی دھرتی'۔ اس نظم میں پاکستان میں چھوڑے ہوئے اپنے گاؤں سے بچھڑنے کی درد ناک کہانی بیان ہوئی تھی۔ اسے سن کر انھوں نے کہا 'بھئی یہ پوری کہانی ہے۔ آپ اردو میں کہانی کیوں نہیں لکھتے؟'

میرا جواب تھا کہ میری اردو کی تعلیم صرف آٹھویں درجے تک ہے۔ انھوں نے کہا کہ کہانی تو عام بول چال کی زبان میں لکھی جاتی ہے۔ پھر وہ مجھے ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں لے گئے۔ کمال احمد صدیقی کے یہاں ہوا تھا یہ جلسہ۔ وہیں بیٹھے بیٹھے دانشوروں، ادیبوں کے چمکتے چہروں کو دیکھتے ہوئے مجھے لگا تھا جیسے یہ روشن چراغ مجھے نیا راستہ دکھا رہے ہوں اور میں اس راستے پر چل پڑا۔ آج تک چل رہا ہوں۔

ر س: آپ کی اور کہانی کی دوستی کا سبب کیا تھا؟

رتن سنگھ: میرے لاشعور نے اس وقت کہانیاں گھڑنی شروع کردی تھیں جب ڈھائی تین سال کی عمر میں میرے ماں باپ نے مجھے سخت مزاج دادی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ تب میں سوچا کرتا تھا کہ شاید میں اپنے ماں باپ کا اصلی بیٹا نہیں ہوں۔ کہیں سے گرا پڑا مل گیا تھا۔ اس لیے مجھے دادی کے پاس چھوڑ دیا ہے جب کہ باقی بہن بھائیوں کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے لاہور میں۔ پتہ نہیں کتنی اور کیسی کیسی کہانیاں گھڑی ہوں گی میں نے۔

پھر ہمارے یہاں 'قصہ گو' داستان گو میراثی آتے تھے۔ ان کی کہانیاں ہفتوں، مہینوں چلا کرتی تھیں۔ رات میں جاگ جاگ کر میں وہ کہانیاں سنا کرتا تھا۔ پھر پنجاب کی قصہ شاعری میں ہیر رانجھا، مرزا صاحبان کہانیوں کے علاوہ پورن بھگت وغیرہ حقیقت رائے کی مکمل کہانیاں تھیں۔ یہ کہانیاں اپنے آپ میں ادب کا ایک اہم حصہ ہیں جنھیں حضرت وارث شاہ دمودر جیسے عظیم شاعروں نے لکھا ہے۔

ہم یہ قصے پڑھتے بھی تھے اور مفتیوں سے سنتے بھی انھوں نے کہانی کہنے کا شعور بخشا۔ پھر رات کو میری دادی کہانی سنایا کرتی تھیں، 'بات' کہانی سے دوستی کا اندازہ اس بات سے لگا سکتی ہیں کہ ایک بار اسی دادی نے پوچھا تھا "میرے مرنے کے بعد آپ لوگ مجھے کیسے یاد کرو گے؟" اور بچوں نے کیا جواب دیا یاد نہیں۔ پر میرا جواب تھا۔ "اس لیے کہ آپ بات سنایا کرتی تھیں۔"

ر س: کیا آپ کو ایسا گھریلو ماحول ملا جس میں آپ کی کہانی لکھنے کی آرزو صحت مند ہوتی گئی۔

رتن سنگھ: شروع شروع میں تو نہیں۔ میری ماں اکثر کہا کرتی تھیں کم از کم یہی خیال کرو کہ دق میں جلنے والا تیل کتنا مہنگا ہے۔ اب میں ان کو کیسے بتاتا کہ اس لالٹین کی روشنی میں، میں اپنا مستقبل لکھ رہا ہوں۔ ہاں شادی کے بعد بیوی کے الفاظ میں کہوں تو میری بیوی نے میرے سارے دکھ اپنے اوپر اوڑھ لیے۔ دوسرے جذبات شانت ہوئے تو ذہن کو آسودگی ملی۔

تیسرے میں خود ہی کچھ بننے کے لیے سٹپٹا رہا تھا۔ پھر بیوی نے سہاگ رات کو جو کہا وہ یہ تھا کہ کیا آپ نوکری نہیں چھوڑ سکتے۔ بیوی کے اس جملے نے کچھ بننے کی خواہش کو اور ہوا دے دی۔ پھر کہانیاں چھپنی شروع ہوئیں تو انھیں لگا کہ یہ ایک ایسا وصف ہے جس سے اپنے مستقبل کو وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ میرے ساتھ ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگیں اور ہوتے ہوتے انھیں کہانی کی اتنی سوجھ بوجھ ہوگئی ہے کہ جس کہانی کو سن کر ان کی 'او ڈونگی' جائے اسی کہانی کو نقادوں نے بھی سراہا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا سب ان کی رفاقت کی دین ہے۔

ر س: کہانی یا افسانہ آپ کی نظر میں کیا ہے؟

رتن سنگھ: کہانی اس نازک مزاج رانی کی طرح ہے جس کی نزاکت کو پرکھنے کے لیے ایک بار راجہ نے رانی کے پلنگ کے نیچے فرش پر ایک کانٹا رکھوا دیا تھا۔ اس رات پھولوں کی طرح نرم گدوں کے بستر پر رانی ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ فرش پر پڑا کانٹا بھی اس کی نازک طبع برداشت نہ کر پائی اور وہ سو نہ سکی۔ فالتو واقعہ تو دور، بے جا جملہ تو کجا، بعض اوقات اس لفظ کا بھی بوجھ برداشت نہیں کر سکتی جو کہانی میں اضافہ نہ کرتا ہو۔

ر س: سنا ہے ہر مصنف اپنی تحریر میں زندہ ہوتا ہے۔ آپ نے کون کون سی ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو آپ کی اصل زندگی کے واقعات پر مبنی ہیں۔

رتن سنگھ: 'پناہ گاہ' اور 'کہکشاں ڈوب گئی' کے نام اس

وقت یاد آرہے ہیں جو پوری کی پوری میری نجی زندگی کو احاطہ کرتی ہیں۔ یوں اس طرح کی اور بھی بہت سی کہانیاں ہیں۔ ہاں یاد آیا میرا ناولٹ 'سانسوں کا سنگیت' کا مرکزی خیال اس وقت میرے ذہن میں آیا جب بائی پاس سرجری کرنے سے پہلے مجھے پوری طرح بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ میرے لاشعور نے جو کچھ سوچا وہ یہ تھا کہ سانس انسان کی زندگی میں سب سے قیمتی شے ہے۔ سانس ہی ایک انسان کو دوسرے انسان سے جوڑتی ہے:

مری سانس بجتی ہے ترے تن کا بیِنا
تو بھی ہے میرے اندر ایسے ہی لپٹا
سب سے بڑی ہے یہی ایک سچائی
کہ سانسوں نے باندھی ہے ساری خدائی

اس ناولٹ میں ذکر تو میرے اپنے آبائی گاؤں کا ہے۔ اس کی بین الاقوامی اہمیت کا پیغام بھی میرے اندر اس وقت پیدا ہوا جب میں بے ہوش تھا۔ ہوش میں آتے ہی ناولٹ ختم ہو جاتا ہے۔

و س: کیا کہانیاں بھی شعر کی طرح وارد ہوتی ہیں؟

رتن سنگھ: ہاں ہوتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ریڈیو کی طرح ٹیون کر کے رکھے۔ اس کا مطلب یہ کہ کچھ لکھنے کا کرب، وہ تخلیق کار اپنے جسم و جان میں اس عورت کی طرح محسوس کرے، جو اولاد کو جنم دینا چاہتی ہے۔

و س: آپ نے جدیدیت کا زمانہ بھی دیکھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدت نے اردو افسانے کو مالا مال کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس انہیں لوگوں کا خیال ہے کہ جدت نے افسانے کو خاصا نقصان پہنچایا ہے اور افسانے اور قاری کا رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟

رتن سنگھ: یہ کُل ماپ ہیں وہ بھی مغرب کے ادھار لیے ہوئے۔ افسانہ یا تو اچھا ہوتا ہے۔ یا برا اور اس کی پرکھ اپنے تہذیب و تمدن کے ماپ سے کی جانی چاہیے۔ اپنے یہاں بنے ہوئے کپڑوں کو اگر آپ باہر سے منگوائے گئے گزوں سے ناپیں گے تو آپ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے۔

و س: سنہ ستر کے بعد کی نسل کو مختلف نام دیے گئے......!!

رتن سنگھ: اب نسلوں سے نہیں اچھا لکھنے سے آگے بڑھتا ہے۔ پریم چند افسانے کے بانی ہیں۔ لیکن ذکر بیدی، کرشن چندر اور منٹو کا زیادہ ہوتا ہے جنھوں نے پریم چند کے کام کو آگے بڑھا کر عالمی افسانے کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ کون جانے کل کو کوئی اتنا بڑا کہانی کار پیدا ہو جائے کہ جس کا ہم ان تینوں حضرات سے پہلے لینے کی ضرورت محسوس ہو۔

و س: آپ کہانی کیوں لکھتے ہیں۔ آپ کی کس کہانی نے آپ کو بہت پریشان کیا ہے۔

رتن سنگھ: میرا ایک دوہا ہے:

یہ سچ ہے کہ اس دنیا میں نہیں رہوں گا میں
لیکن اپنے لفظوں میں ڈھل کر یہیں رہوں گا میں

تو محترمہ ریحانہ صاحبہ، یہ فانی زندگی کہانی میں بھی لافانی ہوتی ہے۔ ہزاروں، لاکھوں برسوں کے انسانی اتہاس میں جو کروڑوں لوگ آئے اور چلے گئے ہم نے ان کو نہیں دیکھا لیکن وہ ہم تک اپنی زندگی کی کہانیوں میں پہنچ رہے ہیں۔ ان کی کہانیاں سنتے سنتے ہم اپنی تصور کی آنکھ سے انھیں زندہ و جاوید دیکھتے ہیں۔ زندگی زندہ ہی کہانیوں میں رہتی ہے۔ اس لیے ہر شخص کہانی لکھ رہا ہے۔ ان پڑھ آدمی بھی اپنی کہانی کہہ کر جاتا ہے۔ اس کے محسوسات ہمیں لوک گیتوں میں سننے کو ملتے ہیں تو ہمارے دل ان کے ساتھ دھڑکنا شروع ہو جاتے ہیں۔

رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ۔ مجھے ہر کہانی بہت پریشان کرتی ہے۔ خاص طور پر وہ کہانیاں زیادہ پریشان کرتی ہیں جو بجلی کی طرح کوندیں۔ دل خوش ہو گیا کہ واہ! کیا کہانی سوجھی ہے اور پھر وہ کہانی کہیں کھو جائے اور میں اسے لکھ نہ پاؤں۔

یوں ادھر ایک کہانی لکھی ہے۔ 'لہولہو لفظ' بڑا پریشان کیا ہے اس کہانی نے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جا کر پوری ہوئی۔ کبھی ایک جملہ لکھتا تھا اور اگلے دن کاٹ دیتا تھا۔ اب کہیں جا کر تین مہینے کی کہانی پوری ہوئی ہے۔

و س: کہانی لکھنے کے بعد کیا کبھی کہانی کے کرداروں سے آپ کی کہیں ملاقات ہوئی؟

رتن سنگھ: ہاں، 'بادی' سے ہوئی۔ یہ کہانی ہے ہی اصلی کردار کی۔ اس نے اپنی کہانی دیکھ کر مجھ سے کہا تھا اس میں میری فوٹو بھی ہونی چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بھی اس کی یہ حسرت پوری نہ کر سکا۔

و س: آپ اپنی نمائندہ کہانی کسے مانتے ہیں؟

رتن سنگھ: نمائندہ کہانی تو ابھی مجھے لکھنی ہے۔ کب سرسوتی مہربان ہو جائیں کہہ نہیں سکتا۔ یوں لگتا ہے ہزاروں سال کی رات' کاٹھ کا گھوڑا' 'پناہ گاہ' کو زیادہ سراہا ہے۔

و س: نئے افسانہ نگاروں میں آپ کے مستقبل کے بڑے افسانہ نگاروں کی شکل میں دیکھتے ہیں؟

رتن سنگھ: اس کا جواب کوئی ادیب کسی وقت بھی دے سکتا ہے۔

Dr. Raihana Sultana, Gautam Buddha University, Yamuna Expressway, Gautam Budh Nagar, Greater Noida, Uttar Pradesh 201308

سوانحی خاکہ

نام: رتن سنگھ، **قلمی نام:** رتن سنگھ کے لیے 'رتی' کا نام استعمال ہوا ہے۔ یہ بچپن کا نام ہے۔

پیدائش: 27-11-15، **آبائی وطن:** قصبہ داؤد، تحصیل ناروال، ضلع سیالکوٹ (پاکستان)

تعلیم: بی۔اے، **ملازمت:** کلرک۔ ناردرن ریلوے

انتظامی عہدے: ٹرانسمشن ایکزیکیٹیو آکاش وانی، پروگرام ایکزیکیٹیو آکاش وانی، اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر آکاش وانی، اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو

کہانیوں کے مجموعے (اردو): (1) پہلی آواز (2) پنجرے کا آدمی (3) کاٹھ کا گھوڑا (4) پناہ گاہ (5) پانی کا ناما (6) صبح کی پری (ناولٹ) (7) ازن کھٹولا (ناولٹ) (8) سانسوں کا سنگیت (ناول) (9) در بدری (ناولٹ) (10) ایک موتی

پنجابی: (1) بات (2) کن من کہیا (3) ازن کھٹولا (ناولٹ) (4) سانسوں کا سنگیت **ہندی:** (1) ازن کھٹولا (ناولٹ) (2) صبح کی پری (ناولٹ)

دیگر کتابیں: (1) رتی کے دوہے (اردو) (2) حضرت وارث شاہ مونوگراف

پنجابی: (1) اکھراں اندر بلدا دیوا (دوہے) (2) چھپنے والی دھرتی (نظمیں) (3) شہیدی نامہ (سہ حرفیاں)

تراجم: (1) سفید خون: نانک سنگھ کے پنجابی ناول کا ترجمہ (2) شلوک شیخ فرید: بابا فرید شکر گنج کے کلام کا اردو ترجمہ (3) نمائندہ پنجابی افسانے (4) اب نہ بسوں یہ گاؤں: کرتار سنگھ دگل کے پنجابی ناول کا ترجمہ (5) جل کی پیاس نہ جائے (6) حال مریداں دا (7) نانک نام چڑھدی کلا (8) تیرے بھانے (9) سب کا بھلا (10) کس پہ کھولوں گٹھڑی: کرتار سنگھ دگل کی آپ بیتی

آئندہ شائع ہونے والی کتابیں:

(1) میری زندگی کا سفر (آپ بیتی) (2) غیر شعری زبان کی غزلیں (3) سو افسانے (4) گرو گرنتھ صاحب کا مکمل ترجمہ

ایوارڈز: (1) دو تین کتابوں پر یوپی اردو اکادمی کے انعامات (2) یوپی اردو اکادمی کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ۔ جب ایک لاکھ گیارہ ہزار کا تھا (3) مرکزی سرکار کے شکشا وبھاگ کا ایک انعام ترجمے کے لیے (4) ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ کے لیے انعام (5) مدھیہ پردیش اکادمی کا ایک ادبی ایوارڈ (6) بھاشا وبھاگ پنجاب کا ساہت شرومنی ایوارڈ (7) غالب ایوارڈ (8) قومی ایوارڈ (9) پنجابی اکادمی دہلی کا فکشن ایوارڈ (10) اردو اکادمی دہلی کا فکشن ایوارڈ (11) اردو اکادمی نے فیلوشپ بھی تین سال کے لیے (12) جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے گیسٹ لیکچر کے موقع پر آنر کیا (13) اردو اکادمی بنگلور نے آنر کیا

بیرونی سفر: (1) کینیا (2) انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ (دو مرتبہ) (3) پاکستان (4) امریکہ

موجودہ پتہ:

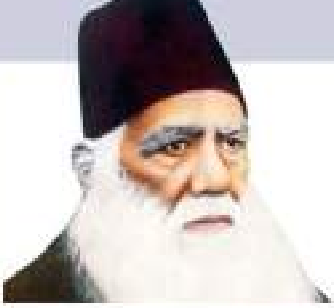

خلیق احمد نظامی

سر سید ماہ و سال کے آئینے میں

17 اکتوبر 1817 دہلی میں پیدا ہوئے۔
1828 سید احمد کے نانا خواجہ فریدالدین کا انتقال۔
1837 سید احمد کے بھائی سید محمد خاں نے سید الاخبار کا اجرا کیا۔
1838 سید احمد کے والد سید محمد متقی کا انتقال۔
فروری 1839 آگرہ کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر تقرر ہوا
24 دسمبر 1841 مین پوری میں منصف۔
10 جنوری 1842 مین پوری سے فتح پور سیکری کا تبادلہ۔
1842 مغلیہ دربار سے جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا ہوا۔
1842 رسالہ جلاء القلوب بذکر المحبوب مکمل ہوا
1844 رسالہ تحفۂ حسن اور رسالہ تسہیل فی جر الثقیل کی تکمیل۔
1845 سید احمد کے بھائی سید محمد خاں کا انتقال۔
1847 "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔
1849 رسالہ کلمۃ الحق کی تکمیل ہوئی۔
1850 رسالہ سنت در رد بدعت کی تکمیل۔
1853 رسالہ نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ اور سلسلۃ الملوک کی تکمیل ہوئی۔
1854 آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔
13 جنوری 1855 بجنور میں صدر امین مقرر ہوئے۔
1855 آئین اکبری کی تصحیح اور اس کی اشاعت۔
10 مئی 1857 غدر کی ابتدا۔
1857 میرٹھ میں سید احمد کی ماں کا انتقال۔
1 اپریل 1858 مرادآباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔
1858 تاریخ سرکشی ضلع بجنور شائع کی۔
1859 بغاوت کرنے والوں کی جائداد کی ضبطی کے خلاف اپیل سننے والے کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔
1859 اسباب بغاوت ہند کی اشاعت۔
1859 مرادآباد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔
1860 لائل محمڈنز آف انڈیا کی اشاعت۔
1860 صوبہ شمال مغرب میں انتظام قحط سالی کی ذمے داری۔
1861 آثار الصنادید کا فرانسیسی ترجمہ (مترجم گارساں دی تاسی) شائع ہوا۔
1861 سید احمد کی بیوی کا انتقال۔
12 مئی 1862 غازی پور تبادلہ ہوا۔
1862 تاریخ فیروز شاہی کی تدوین و تصحیح۔
1862 تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام شائع کیا۔
1863 رسالہ التماس بخدمت ساکنان ہند در باب ترقی اہل ہند شائع کیا۔
1864 غازی پور میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔
1864 علی گڑھ تبادلہ ہوا۔
4 جولائی 1864 رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے اعزازی رکن منتخب ہوئے۔
30 دسمبر 1865 حکومت کو سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے ایک عرضداشت بھیجی کہ زراعت کے موضوع پر سوسائٹی سے جو کتابیں شائع ہوں اس کے لیے امداد دی جائے۔
1866 اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا۔
1 اگست 1867 وائسرائے کو ایک ورنا کیولر یونیورسٹی کے قیام کے لیے عرضداشت بھیجی۔
15 اگست 1867 بنارس تبادلہ ہوا۔
25 ستمبر 1867 بنارس میں ہومیو پیتھک دواخانہ اور اسپتال قائم کیا۔
1 اپریل 1869 انگلستان کے لیے بنارس سے روانہ ہوئے۔
6 اگست 1869 سی ایس آئی کا خطاب پایا۔
4 ستمبر 1870 لندن سے ہندوستان کے لیے روانگی۔
2 اکتوبر 1870 بمبئی پہنچے۔
24 دسمبر 1870 تہذیب الاخلاق کا اجرا۔
26 دسمبر 1870 کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی تشکیل۔
فروری 1873 ایک کالج کے قیام کی اسکیم پیش کی۔
24 مئی 1875 مدرسۃ العلوم (ایم اے او کالج) کا افتتاح۔
1 جون 1875 مدرسۃ العلوم میں باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔
1876 ملازمت سے سبکدوشی۔
1876 تفسیر القرآن لکھنے کی ابتدا۔
8 جنوری 1877 لارڈ لٹن نے مدرسۃ العلوم کا سنگ بنیاد رکھا۔
1878 وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔
1882 ایجوکیشن کمیشن کے سامنے ہندوستان کی تعلیمی حالت پر اظہار کیا۔
1883 محمڈن سول سروس فنڈ اسوسی ایشن قائم کیا۔
1886 محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔
1887 لارڈ ڈفرن نے سول سروس اسوسی ایشن کا ممبر نامزد کیا۔
اگست 1988 پیٹریاٹک اسوسی ایشن علی گڑھ قیام۔
1888 کے سی ایس آئی کا خطاب ملا۔
1889 ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔
1889 ٹرسٹی بل مشتہر کیا۔
27 مارچ 1898 علی گڑھ میں وفات پائی۔

سید احمد کی اہم تصانیف و تالیفات			
جام جم	آثار الصنادید	سرکشی ضلع بجنور	اسباب بغاوت ہند
تصحیح تاریخ فیروز شاہی	تصحیح تزک جہانگیری	جلاء القلوب بذکر المحبوب	سیرت فریدیہ
الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ		احکام طعام اہل کتاب	تفسیر القرآن
ازالۃ الغین عن ذی القرنین		راہ سنت در رد بدعت	تحریر فی اصول التفسیر
خلق الانسان علی ما فی القرآن		الدعا والاستجابہ	رسالہ ابطال غلامی

ماخذ: جدید ہندوستان کے معمار، سید احمد خاں، خلیق احمد نظامی، ترجمہ: اصغر عباس، سن اشاعت: جون 1971

افتخار عالم خان

سرسید کا نظریہ 'دین و دنیا'

انگریز تاریخ دان ولیم ڈلرمپل نے حال میں تحریر کیا ہے کہ اٹھارویں صدی میں انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ انگلستان کی ایک نہایت خطرناک اور بے مہار کارپوریٹ کمپنی ہندوستان کی حکومت پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئی تھی جس کا ہندوستان میں انتظام ایک غیر متوازن ذہن کے نفسیاتی لارڈ کلایو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کمپنی کی جنوبی ایشیا میں فوجی فتوحات، قبضے اور لوٹ اور عالمی تاریخ میں کارپوریٹ تشدد کی سب سے اعلیٰ مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔1

کمپنی سرکار کی لوٹ مار کے دور میں بنگال کی دولت نہایت سرعت سے انگلستان منتقل ہونے لگی تھی۔ ہندوستان کے خوش حال کسانوں، کاریگروں، دستکاروں، بنکروں اور دوسرے اہل حرفہ کے ساتھ جہاں ایک طرف غلاموں جیسا جبر و تشدد کا سلوک روا رکھا گیا تھا وہیں دوسری طرف ہندوستانی بازار برٹش مصنوعات سے بھرتے چلے گئے تھے۔ ہندوستان پر برطانوی کلونیل تسلط قائم ہونے کے بعد ہندوستانی معاشی نظام مکمل طور پر درہم برہم ہو گیا تھا۔ ہر طرف بے کاری اور بدحالی اپنے پیر پھیلا رہی تھی، بازاروں میں قیمتیں آسمان چھو رہی تھیں، ہر طرف بھوک مری اور قحط سالی کا دور دورہ تھا (1770 میں بنگال میں بھیانک قحط پڑا تھا)۔ اس مفلوک الحالی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستانی عوام کے پاس ان کے مذہبی عقائد ہی بس ایک آخری سہارے کے طور باقی رہ گئے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس ناگہانی آفت اور اندھیر نگری کے مقابلے کے لیے روشنی کی تلاش میں اپنے ماضی کے دھندلکوں میں چھپی اپنی تابناک روایات کو تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ ماضی کی تابانی سے حال کی تاریکی کا مقابلہ کیا جاسکے۔ ماضی پرستی کی اس دوڑ میں جہاں ہندو مذہب کے پیروکاروں نے ویدانت کے فلسفہ حیات میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں وہیں مسلم علما نے قرآن و حدیث کے احکامات کی پابندی کے ذریعے ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی تلقین کرنا شروع کر دی تھی۔ غرض ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی ماضی قریب کے عرب معاشرے اور ماضی بعید کے ویدک دور میں اپنے اپنے فکری اور روحانی مسالک تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

مغربی فکر اور معاشرت کے اثرات کے ردعمل کے طور پیدا ہونے والی ماضی پرستی اور بنیاد پرستی کے رجحانات نے اُس ہندوستانی رواداری کے مخلوط کلچر کے آئینے میں بال ڈالنا شروع کر دیے تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیکڑوں سالوں سے ایک ساتھ رہنے سہنے، جینے مرنے، سے ظہور پذیر ہوا تھا اور جو اس وقت کے ہندوستانی سماج کی اصل پہچان اور طاقت تھا۔ مخلوط کلچر کے اس بکھراؤ کا عمل اس نشاۃ ثانیہ میں بھی نظر آتا ہے جس کا آغاز مغربی فکر کے توسل سے بنگال میں ہوا تھا۔2 اس نشاۃ ثانیہ کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی تھی کہ روشن خیالی کے اس عمل کے دوران دو فکری دھارے دو مختلف سمتوں میں بہتے نظر آتے ہیں، جنھوں نے روایت کا سہارا لیا تھا وہ احیاء مذہب کی راہ پر چل نکلے تھے اور جنھوں نے کلونیل جدیدیت کو مقدم جانا تھا انھوں نے رسم و رواج اور روایات کو یکسر خارج کر کے ان سے منہ موڑ لیا تھا، اسی لیے ایک تصادم کی صورت پیدا ہو گئی تھی جس نے اس امکان کو قطعی خارج کر دیا تھا کہ روایتی معاشرت میں موجود، روحانی وحدانیت، محبت، انصاف اور اخوت جیسی اعلیٰ اقدار کو بنیاد بنا کر ایک ایسی جدیدیت کی تشکیل کی جاسکے جو روایتی نہج کی کلونیل جدیدیت سے مختلف ہو، بلکہ اس جدید اور قدیم کے تصادم کے نتیجے میں احیاء مذہب کی تحریکیں زیادہ مستحکم ہوئی تھیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو سماج میں تبدیلی کے خواہاں تھے اور 'ستی' اور 'بال بیاہ' جیسی رسومات کی مخالفت کر رہے تھے یا 'بیوہ کی شادی' کے حقوق کی موافقت میں آواز بلند کر رہے تھے وہ خود اور ان کے مخالفین بھی (جو روایتی رسم و رواج کی حمایت میں سینہ سپر تھے) دونوں ہی اپنے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے سند اور جواز کے طور مذہبی کتابوں، خاص طور پر 'ویدانت' کے حوالے پیش کرتے تھے۔ اس عمل نے رسم و رواج (یعنی روایات) کو ایک طرح سے مذہب سے مکمل طور پر منسلک کر دیا تھا جس نے روایات کے حامیوں کو ایک طرح کی بالادستی اور استحکام عطا کیا تھا۔ مذہبی روایات کی اسی بالادستی اور استحکام نے ہندوستان میں 'روشن خیالی' کے افکار اور تصورات کا دائرہ نہایت محدود کر دیا تھا۔

یہ عمل ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں جاری رہا تھا۔ سرسید خود اور ان کے مخالفین، دونوں ہی اپنے اپنے موقف کی حمایت میں قرآن اور حدیث کے حوالہ جات پیش کرتے تھے۔ حالانکہ پانیکر کے خیال میں سرسید نے نسبتاً مذہب کی تفسیر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے سے کی تھی اور ایک ایسا انداز اپنانے کی کوشش کی تھی کہ بغیر کسی نمایاں تکرار اور تصادم کے مذہب کو وقت کے جدید تقاضوں سے ہم کنار کیا جاسکے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے تھے۔3

ہمارا یہ قوی خیال ہے کہ سرسید کو اس سلسلے میں جو بھی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے 'عقیدے' اور 'معاشرت' میں موجود 'فرق' کو واضح کرنے کی شعوری کوششیں کی تھیں (بلکہ اسی مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے قرآن کی تفسیر بھی تحریر کی تھی) وہ عقیدے اور معاشرے کے فرق کو واضح کرنے کے لیے 'دینی' اور 'دنیاوی' معاملات کی اصطلاحیں استعمال کرتے تھے تاکہ عقیدے اور معاشرت کے امور کو علاحدہ علاحدہ نمایاں کرنے کا جواز فراہم کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ:

''دنیا میں دو قسم کے امور ہیں۔ ایک روحانی اور دوسرے جسمانی، یا یوں کہو کہ ایک دینی اور دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امور دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا ہے۔ ہاں چند معظم باتوں کو جن کا اثر اخلاق پر زیادہ تر ہے اور گو وہ دنیاوی

ہوں بیان کرتا ہے۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ اسلام بھی، جو بے شک ایک سچا مذہب ہے،ان ہی اصولوں پر مبنی ہے۔''

سرسید کے یہاں روایت سے انحراف بہت واضح اور تسلسل کے ساتھ نظر آتا ہے جو ان کی جدیدیت اور روشن خیالی کی سب سے اہم سند فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ حتمی طور پر تحریر کرتے ہیں کہ:

''رسم ورواج کو تبدیل کرنا اوران کو ترقی دینا انسانی سوسائٹی کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ ہر انسانی زندگی کے لیے سانس لینا۔''5

وہ سماج میں موجود فرسودہ معاشرتی رویوں میں کسی قسم کی تبدیلی سے انکار کو بے جا تعصب قرار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

''مگر جب کہ دوسری قوموں سے ازراہ تعصب نفرت رکھیں اور کو طریقہ زندگی گو وہ کیسا ہی بے عیب ہو، اختیار کرنا صرف بہ سبب اپنے تعصب یا رسم ورواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔''6

سرسید سماجی ترقی کے قائل تھے۔ وہ زمانے کے تغیر کے ساتھ اپنے عقائد اور اپنی معاشرت کو ہم آہنگ رکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ اندھی تقلید اور روایت پرستی کے بجائے معروضیت اور عقلیت کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

''جس طرح دنیاوی خیالات، عادات، رسم و رواج، حالت تمدن اور معاشرت پر زمانہ موثر ہوتا ہے اسی طرح مذہب اور اعتقادات پر زمانے کا اثر پڑتا ہے۔ ایک زمانہ یقین کا زمانہ کہلاتا ہے کہ جو بات کہی جاتی ہے گو وہ کیسی ہی عجیب ہو اس پر سب کو یقین ہوتا ہے مگر حال کا زمانہ وہ نہیں ہے بلکہ شک کا زمانہ ہے۔ کوئی بات جب تک اس کے سچ ہونے کا یقین نہ آوے سچ نہیں مانی جاتی اور یہی سبب ہے کہ انسانوں کے مذاہب یا یوں کہو کہ ان کے اعتقادات پر زمانے نے سب سے بڑا اثر ڈالا ہے۔''7

اس تبدل کی تشریح کے طور سرسید نے عقائد کے سلسلے میں رونما ہونے والے قدیم اور جدید رویوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ:

''قدیم اصول مذہبی یہ ہے کہ انسان مذہب کے لیے پیدا ہوا ہے۔ جدید اصول مذہبی یہ ہے کہ مذہب انسان کے لیے پیدا ہوا ہے قدیم اصول یہ ہے کہ تزکیہ نفس نفسانی خواہشات کو دل سے دور کرنا ہے جدید اصول یہ ہے کہ انسان کے دل کو نیکی پر مائل کرنا ہی تزکیہ نفس ہے۔ قدیم اصول یہ ہے کہ مذہب روحانی اور جسمانی یعنی دینی اور دنیاوی دونوں کاموں سے متعلق ہے۔ جدید اصول یہ ہے کہ مذہب صرف روحانی کاموں سے متعلق ہے۔''8

سرسید دنیاوی اور دینی امور کی تفریق وتمیز کے ساتھ ہی واضح کرتے ہیں کہ دنیاوی امور کے لیے مذہبی اسناد فراہم کرانا صحیح طریقہ کار نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''تمام لوگوں کے خیال میں یہ غلط مسئلہ جم گیا ہے کہ مذہب اسلام تمام دنیاوی امور سے بھی متعلق ہے اور کوئی دنیاوی کام بے سند یا اجازت مذہبی کے نہیں کیا جاسکتا ہے۔''9

سرسید دنیاوی امور میں عقیدے اور اس کے توسل سے (بطور اجتہاد) وضع کیے گئے اصولوں کے درمیان موجود فرق کو سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

''اگلے زمانے کے نیک اور متعصدین، مگر مذہب کی طرف زیادہ متوجہ عالموں نے یہ خیال کیا کہ جہاں تک ہو سکے۔ ہر کام کسی مذہبی سند پر کیا جاوے۔ پس جو واقعہ یا امر پیش آتا اس کے لیے فکر کرتے کہ اس کو کسی مذہبی سند سے متعلق کریں اور پھر خواہ مخواہ کھینچ تان کر اور تاویلات واستدلالات دور ازکار کر کر کسی نہ کسی سند سے متعلق کر دیتے تھے ان علما کے اقوال و

انیسویں صدی میں (یعنی سرسید کے دور میں ریل میں سفر کرنے، انگریزی پڑھنے، ڈاکٹری علاج کروانے، ڈاک اور تار کے محکمے میں نوکری کرنے، فوج کی وردی پہننے وغیرہ کے خلاف متعدد فتوے روز دیے جاتے تھے۔ کیا آج اکیسویں صدی میں آپ کار چلانے فلم اور ٹی وی دیکھنے، انگریزی، فرنچ یا چینی زبان پڑھنے، جہاز میں سفر کرنے، یا کمپیوٹر اور موبائل فون استعمال کرنے کے مسئلے میں علما کی رائے یا فقہی اسناد حاصل کرنے کی کوششیں کرتے ہیں؟

استدلالات رفتہ رفتہ مدون ہونے لگے (جمع ہونے لگے) جن کی بدولت کتب فقہ و اصول فقہ ہمارے ہاں پیدا ہوگئیں۔ اس زمانے میں تمام لوگ ان علما کے اقوال واستدلال کو ایک رائے سے زیادہ رتبہ کا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ خود ان علما کے اقوال بطور سند کے تصور ہونے لگے اور پھر ایک زمانے کے بعد وہ بھی مذہب اسلام سمجھا گیا اور جو نقائص اس میں معلوم اس کو اسلام میں انھوں نے نقص سمجھا حالانکہ اسلام اس سے بالکل بری ہے۔''10

سرسید کا خیال تھا کہ اس سے ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ اب ان مسائل ہی کو اسلام تصور کیا جانے لگا ہے اور ان کے برخلاف کرنا برخلاف اسلام تصور کیا جانے لگا ہے حالانکہ بقول سرسید یہ طریقہ کار خود ہی برخلاف اسلام قرار دیا جاسکتا ہے۔

دراصل سابق میں علمائے دین نے دنیاوی امور کی نسبت جو کچھ کہا اور لکھا تھا وہ سب اس زمانے کے حالات اور کیفیات کی نسبت خاصہ اہم اور مناسب تھا لیکن آج کا زمانہ دوسرا ہے جس کے اپنے تقاضے اور اپنی ضروریات ہیں اور ہم کو ان کی مطابقت سے ہی اپنے مسائل حل اور اپنے رویے طے کرتے ہوں گے۔

انیسویں صدی میں (یعنی سرسید کے دور میں) ریل میں سفر کرنے، انگریزی پڑھنے، ڈاکٹری علاج کروانے، ڈاک اور تار کے محکمے میں نوکری کرنے، فوج کی وردی پہننے وغیرہ کے خلاف متعدد فتوے روز دیے جاتے تھے۔ کیا آج اکیسویں صدی میں آپ کار چلانے فلم اور ٹی وی دیکھنے، انگریزی، فرنچ یا چینی زبان پڑھنے، جہاز میں سفر کرنے، یا کمپیوٹر اور موبائل فون استعمال کرنے کے مسئلے میں علما کی رائے یا فقہی اسناد حاصل کرنے کی کوششیں کرتے ہیں؟ اگر نہیں کرتے ہیں تو کیوں؟ شاید اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ آپ ان معاملات کو دینی معاملات نہیں سمجھتے ہیں۔ بس مختصراً بیان کیا جائے تو سرسید کا بھی یہی نظریہ تھا کہ دینی اور دنیاوی معاملات میں فرق کرنا چاہیے اور دنیاوی معاملات کو اس زمانے (یا اس جگہ) کے رائج الوقت طور طریقوں اور قاعدے قوانین کی مطابقت سے انجام دینا چاہیے۔ یقین کیجیے اس طرح آپ دین اور دنیا دونوں میں بغیر کسی تضاد اور قباحت کے سرخرو ہونے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات:

1. ولیم ڈلریمپل "The East Indian Company, The original Corporate Raiders" گارجین، مورخہ 4 مارچ 2015
2. کے این پانیکر "Was there a Renaissance" فرنٹ لائن، مورخہ 11 مارچ 2011 ص 11
3. ایضاً
4. سید احمد خاں 'نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ' بحوالہ مقالات سرسید (حصہ 9) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب، لاہور ص 16
5. سید احمد خاں 'رسم ورواج کا فلسفہ اور اس میں اصلاح کی ضرورت' بحوالہ مقالات سرسید (حصہ 12) ص 5
6. سید احمد خاں 'رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات' بحوالہ مقالات سرسید (حصہ 5) ص 13
7. سید احمد خاں 'زمانے کا اثر مذہب پر' تہذیب الاخلاق، یکم شوال 1311ھ مطابق اپریل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
8. سید احمد خاں 'مذہبی خیال (زمانہ قدیم اور زمانہ جدید)' بحوالہ مقالات سرسید (حصہ 2) ص 23
9. سید احمد خاں 'نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ' بحوالہ مقالات سرسید (حصہ 9) ص 12
10. ایضاً ص 11

■

Prof. Iftekhar Alam Khan, Alam Manzil, Zoha Bagh, Aligarh - 202001 (UP)

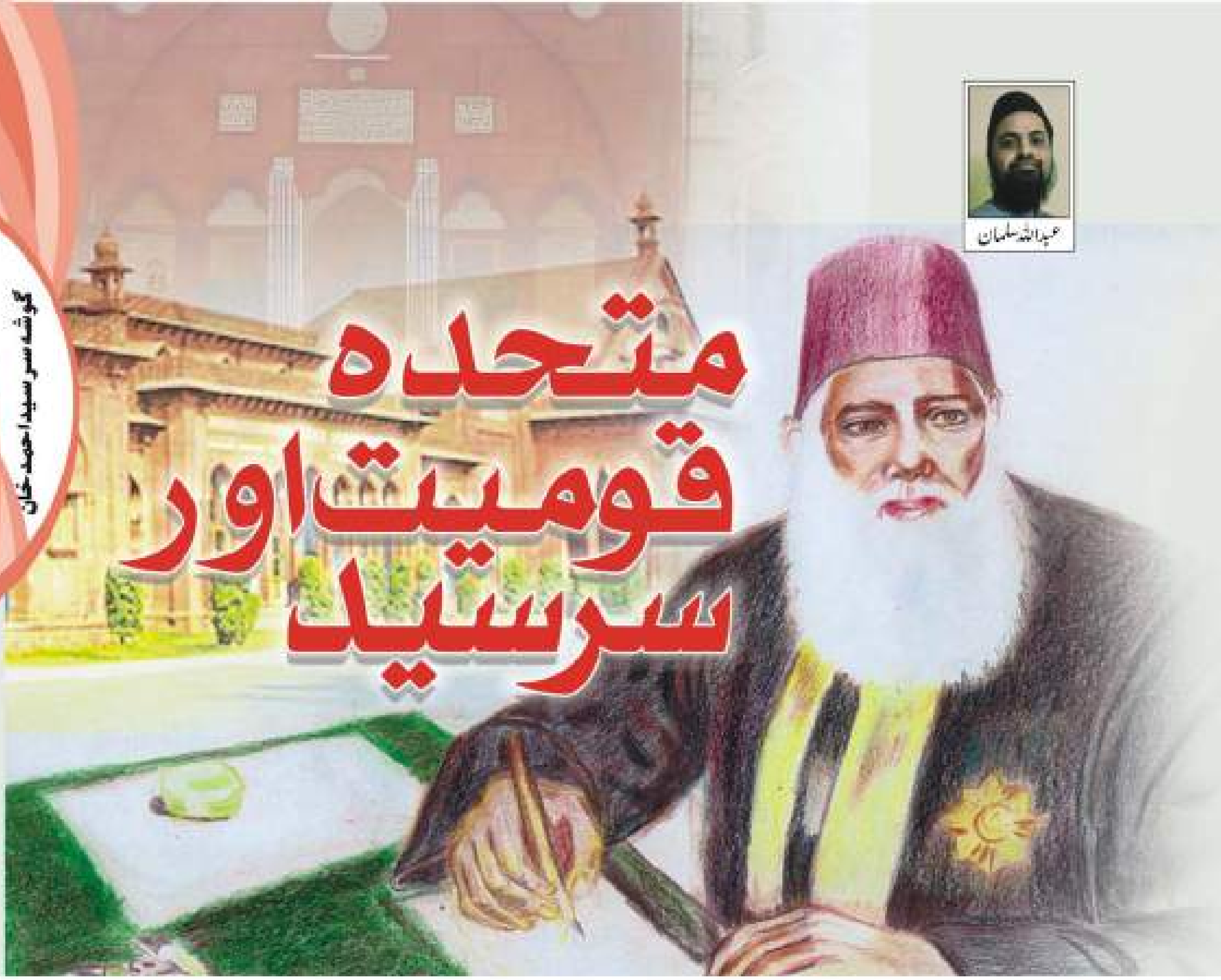

عبداللہ سلمان

متحدہ قومیت اور سرسید

ہندوستانی معاشرے میں ایک زمانے میں سرسید احمد خاں کو، سماجی اور سیاسی دونوں لحاظ سے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہے جس سے میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ انھوں نے جابجا اپنی تحریروں اور تقریروں میں اپنے اس تصور کو پیش کیا ہے۔ آپ بھی ان کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

(1) ''کیا تم سب ایک ہی ملک میں نہیں رہتے؟......یاد رکھو لفظ ہندو اور مسلمان محض مذہبی امتیاز کی نشانی ہیں ورنہ ہمارے ہندوستانی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔''

(2) ''قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہلاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں ایک ہونا چاہیے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں۔''

(3) ''یہ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں اس قسم کی دوستی و برادری اور محبت روز بروز بڑھتی جائے اور سوشل حالات میں ایسی ترقی ہو کہ مسلمان بجز مسجدوں کے اور ہندو بجز مندروں کے پہچانے نہ جائیں۔''

(4) ''اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی قومیں اس ملک میں آئیں، ہم بھی آئے۔ ہم نے بھی اسے اپنا وطن سمجھا... مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کرلیں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں... دونوں نے مل کر ایک نئی زبان پیدا کرلی جو نہ ہماری تھی نہ ان کی... باعتبار اہل وطن ہونے کے دونوں ایک ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔...''

(5) ''مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد ہندو مسلمان دونوں سے ہے... اس میں ہم آپس میں کسی کو ہندو کہیں، کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ممالک میں ہم نیٹو یعنی ہندوستانی ہی کہلاتے ہیں... پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ تعلیم نہ پائیں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جائیں ہماری عزت نہیں ہوسکتی... اگر میں لالو بہاری، گنگارام، خدابخش میں سے کسی کو مجسٹریٹ یا کمشنر یا کسی عہدے کی کرسی پر بیٹھا دیکھوں تو مجھ کو برابر کی خوشی ہوگی۔

(6) ''بلاشبہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح اختلاف مذہب سے قطع نظر ہندو مسلمانوں میں دوستی، محبت، یگانگت اور آپس میں ہمدردی کا برتاؤ ہو، اسی طرح پولیٹیکل اختلاف رائے سے بھی قطع نظر سوشل معاملات میں باہمی دوستی محبت اور بھائی بندی کا برتاؤ ہو۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ اس زمانے میں جو غیر معمولی طور پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ بھائی بندی وہمدردی کا اظہار کیا ہے وہ ایک دھوکا مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کا نہیں بلکہ سچی بھائی بندی اور سچی

ہمدردی اور یگانگی ہم وطنی کا سبب ہے۔ اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہو۔"

لدھیانہ میں دیے گئے ایک لکچر کا اقتباس: "برادران من! یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد چھوڑ کر ایک عقیدے پر ہو جائیں۔ یہ امر تو قانون قدرت کے خلاف ہے جو ہو نہیں سکتا۔ نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ مگر اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے، ایک عقلی اور نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ بن سکتی ہے... انسان اپنی ہستی میں دو حصے پائے گا۔ ایک حصہ خدا کا ایک ابنائے جنس کا۔ پہلے حصے میں اعتقاد کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو اس کا معاملہ خدا کے ساتھ... تو اس اخوت کو جس کو خدا نے قائم کیا، قائم رکھنا چاہیے... پس ہماری قوم کی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم آپس کی محبت سے اس عداوت اور نفاق کو یکتائی اور یک جہتی سے تبدیل کریں۔ دوسرا حصہ ابنائے جنس کا ہے جس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیے اور وہ حصہ آپس کی محبت، باہمی دوستی اور اعانت جس کے مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی اطاعت اور آپس کے برادرانہ برتاؤ اور قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے جو ترقی کی پہلی منزل ہے۔

"... مگر ہم کو یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں۔ گو وہ ہمارے ساتھ کلمے میں شریک نہیں ہیں مگر بہت سے تمدنی امور میں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ اس سرزمین پر ہم دونوں رہتے ہیں۔ ہزاروں امور ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور بغیر ان کے ہم کو چارہ نہیں۔ ہمسائے کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی تک پہنچ گئی ہے۔ ان ہم وطن بھائیوں کے بھی دو حصے ہیں ایک خدا کا، ایک انسانوں کا۔ خدائی حصہ خدا کے لیے رکھو۔ انسانوں والے حصے سے کام رکھو۔ ان تمام امور میں جو معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دوسرے کے مددگار بنے رہو۔ آپس کی سچی محبت اور دوستانہ بردباری رکھو۔ دونوں کی ترقی کا یہی راستہ ہے..."

ایک اور موقع پر فرمایا: "یہ سچ ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں پائی جاتی جس میں باہم حسد و نفاق، عداوت و حقارت نہ پائی جاتی ہو مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی نہیں بلکہ قومی اتفاق ہے۔ ہمارے آپس میں بہ مقتضائے بشریت کیسا ہی نفاق ہو جو خدا کے نزدیک ایک سخت گناہ ہے، مگر وہ قومی اتفاق و اتحاد کا مانع نہیں ہے۔" یہ بات انھوں نے متعدد بار دہرائی ہے کہ "ہندوستان ایک خوب صورت دلہن ہے، ہندو مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اگر ان کے درمیان نفاق ہوگا تو یہ دلہن بھینگی اور ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش سے کانی بن جائے گی... پس اے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے تم چاہے اس دلہن کو بھینگا بنا دو چاہے کانی۔"

انھیں خیالات اور مجموعی خدمات کی بنا پر وہ ہر ہندوستانی کی نظر میں عزیز تھے۔ پنجاب کے ہندوؤں نے فرط عقیدت سے انھیں نجم الہند اور آفتاب ہند کے خطابات دے رکھے تھے۔ یہاں ذرا دیگر شواہد بھی دیکھ لیے جائیں:

(1) لاہور کے اخبار Tribune نے اپنے اداریے میں لکھا

بہت تھوڑے آدمی جانتے ہیں کہ اسلام کا کھنڈن کرنے کے باوجود اہل اسلام مہرشی کو خاص عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر کسی مذہب والوں نے ان کے پرچار کرنے میں کوئی سہولت پیدا کی تو وہ اہل اسلام تھے۔ جب مہرشی 1874 میں بنارس پر چار کرنے گئے تو سر سید احمد خاں وہاں کے سب جج تھے۔ انہوں نے ان کے لکچروں کا پربند (انتظام) اپنے مکان پر کیا۔ جب مہرشی علی گڑھ گئے تو سر سید وہاں بھی تھے۔ انہیں نے سوامی کی تشریف آوری پر ایک جلسہ کیا۔ ایسی حالت میں جب کہ مہرشی کے ٹھہرنے کا بھی کوئی انتظام نہ تھا، ڈاکٹر رحیم خاں نے اپنی کوٹھی جو انار کلی لاہور میں واقع تھی ان کے حوالے کر دی۔

تھا: "ہم اس شخص کے کلمات سن کر جیسے کہ ہم اکثر اپنے مسلمان ہم وطنوں سے نہیں سنتے، دل سے خوش ہوتے ہیں۔ جو عظیم سر سید احمد خاں نے قائم کی ہے وہ صرف ان کے ہم مذہبوں کی پیروی کے لائق نہیں بلکہ ہندوؤں کے لیے بھی پیروی کے لائق ہے۔"

(2) لالہ جگت رام نے اپنے ایڈریس میں سر سید کو ان توصیفی الفاظ میں خطاب کیا: "جناب سر سید صاحب صرف ایک قوم یا خاص فرقے کے مددگار نہیں ہیں بلکہ وہ جناب کیشب چندر سین اور سری سوامی دیانند سرسوتی کے پیروؤں کو بھی نظر عنایت سے دیکھتے ہیں۔ وہ خالص مسلمانوں ہی کے معاون نہیں بلکہ وہ کل ملک کے جاں نثار ہیں۔"

(3) برہمو سماج اور آریہ سماج کے وفد نے جو سپاس نامہ پیش کیا تھا اس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے: "ہم تمام آپ کی ان کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں، نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لیے کی ہے۔ ہندو راجا مہاراجا جن سے بہت کچھ امید کی جاتی تھی ملک کے خیر خواہ ثابت نہ ہوئے لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور البرٹ بل اور دیگر ملکی تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی۔"

(4) اخبار پرکاش لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 11 نومبر 1897 میں تحریر کیا: "کون نہیں جانتا کہ ویدک دھرم کے پرچار میں ہندوؤں نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کا اینٹ اور پتھر سے خیر مقدم کیا تھا اور جن لوگوں کی اُنتی (ترقی) کے لیے انھوں نے کشٹ سہے، انھیں لوگوں نے مہرشی پر کئی بار ہتھیاروں سے حملے کیے اور ان کو زہر دیا۔ مگر بہت تھوڑے آدمی جانتے ہیں کہ اسلام کا کھنڈن کرنے کے باوجود اہل اسلام مہرشی کو خاص عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر کسی مذہب والوں نے ان کے پرچار کرنے میں کوئی سہولت پیدا کی تو وہ اہل اسلام تھے۔ جب مہرشی 1874 میں بنارس پر چار کرنے گئے تو سر سید احمد خاں وہاں کے سب جج تھے۔ انھیں نے ان کے لکچروں کا پربند (انتظام) اپنے مکان پر کیا۔ جب مہرشی علی گڑھ گئے تو سر سید وہاں بھی تھے۔ انھیں نے سوامی کی تشریف آوری پر ایک جلسہ کیا۔ ایسی حالت میں جب کہ مہرشی کے ٹھہرنے کا بھی کوئی انتظام نہ تھا ڈاکٹر رحیم خاں نے اپنی کوٹھی جو انار کلی لاہور میں واقع تھی ان کے حوالے کر دی۔ اسی کوٹھی میں آریہ سماج لاہور کی بنیاد پڑی۔"

(5) انڈین اسوسی ایشن لاہور کے استقبالیہ سے ایک اقتباس: "... آپ کا برتاؤ ابتدا سے انتہا تک تعصب اور خود رائی کے دھبے سے بالکل مبرا رہا۔ جو محمڈن تعلیمی ادارہ آپ نے علی گڑھ میں قائم کیا ہے اس سے ہندو اور مسلمان دونوں مستفیض ہو رہے ہیں... خدا کرے کہ آپ عرصے تک زندہ رہیں تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی برابر تلقین کر سکیں اور ان کے دلوں سے تعصب اور خود رائی کو بیخ و بن سے دور کر کے برادرانہ اتحاد کے رشتوں کو مضبوط کر سکیں... آپ بے طرف دارانہ طور پر تمام فرقوں کی بہبودی کی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راست بازی کے ساتھ قومی مطالبوں کا خیال رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہم وطنوں کی طرف سے دلی احسان مندی کے مستحق ہیں۔"

(6) جالندھر کے ہندوؤں نے جو ایڈریس پیش کیا وہ 'ہمارے آنریبل سید' کہہ کر پیش کیا۔ اس تہنیت کا ایک اقتباس: "ہندوستان میں قومی ہمدردی کا لفظ گذشتہ صدی

میں پہلے پہل آپ ہی کی زبان مبارک پر آیا اور آپ نے نہایت عمدہ اسلوب سے علمی اور عملی طور پر اس وقت تک نبھایا۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور عیسائی صاحبوں کو بھی نظر مساوات سے دیکھا اور ہم قوم سمجھا ہے۔ چنانچہ مدرسۃ العلوم میں ہندو اور عیسائی طالب علموں کے سب حقوق مسلمان طالب علموں کے برابر رکھے گئے ہیں۔ اس لیے ہم آپ کی بے تعصبی کے شکر گزار ہیں۔"

(7) پنجابی اخبار لاہور (مورخہ 6 جنوری 1884) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو: "... لالہ سنگم لال نے سرسید کی آمد کا شکریہ ادا کیا اور کہا، جو عزت و توقیر آپ کی تشریف آوری سے ہوئی اگرچہ بالخصوص مسلمانوں سے متعلق ہے لیکن ہمارے ملک کے ہندو بھی اس عزت کو اپنی طرف منسوب کر کے فخر کرتے ہیں۔ گو آپ ہندو نہیں ہیں مگر کچھ کم فخر کی بات نہیں کہ ہندوستان میں آپ جیسا ریفارمر موجود ہے۔"

(8) سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں Ten series کے تبصرہ نگار نے لکھا: "یہ ایک ایسا دارا اقدام تھا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے کیا گیا تھا۔"

(9) جب امرتسر کے چند دوستوں نے بی اے میں اول آنے والے مسلمان طالب علم کو تمغہ دینے کی پیش کش کی تو سرسید نے فوراً اپنے پرنسپل کو لکھا کہ "... اب میں اپنی جیب سے ایک سونے کا تمغہ ایسے ہندو طالب علم کے واسطے رکھتا ہوں جو ہمارے کالج میں اول ڈویژن میں پاس کرے۔ آپ اس کی خبر طلبا کو پہنچا دیں۔" بعد کو یہ اعلان گزٹ میں بھی شائع کرایا گویا بقول مولانا حالی، ان کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے دل میں جو قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جھجک ہے اسے آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

سرسید قوم پروری اور فرقہ پرستی کے فرق کو اچھی طرح جانتے تھے۔ دونوں قوموں کی ترقی ان کے پیش نظر تھی۔ یہی بات ان کو اپنی ملت کی خصوصی فکر کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ چناں چہ انھوں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ جسم کا کوئی حصہ کمزور نہ رہ جائے۔ انھوں نے دو بھائیوں کی مثال دے کر سمجھایا: "فرض کرو کہ ان میں سے ایک طاقت ور اور دوسرا بیمار ہے۔ اب اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کی امداد کریں... میں اس بات سے خوش ہوں کہ ہمارے کالج میں ہندو مسلمان میں ذرا بھی امتیاز نہیں۔"

یاد رہے کہ بالکل یہی رپورٹ سر آکلینڈ نے اپنے 25 نومبر 1888 والے معائنے کے بعد دی تھی۔ حالی کا یہ شعر اسی زمانے کا ہے:

نہ دیکھا ہو جنھوں نے پیار ہندو اور مسلماں میں
وہ آکر مسلم و ہندو کو یک جاں و دو تن دیکھیں

لوگ تعجب کرتے تھے کہ علی گڑھ سے باہر فرقہ وارانہ اور صوبائی عصبیت کی فضا عام تھی، لیکن کالج کے اندر یہ بلا کبھی نہیں آئی۔ بقول پروفیسر رشید صدیقی، مسلمان حکومتوں کی رواداری کی روایت کو بالعموم اور اسلام کی وسعت نظری کی روایت کو بالخصوص جس خوبی اور پابندی سے علی گڑھ نے نبھایا وہ ہندوستان کی تعلیم گاہوں کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حکومت کے جن چھوٹے بڑے مناصب پر فائز رہے یا جہاں کہیں جس حال

سرسید قوم پروری اور فرقہ پرستی کے فرق کو اچھی طرح جانتے تھے۔ دونوں قوموں کی ترقی ان کے پیش نظر تھی۔ یہی بات ان کو اپنی ملت کی خصوصی فکر کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ چناں چہ انہوں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ جسم کا کوئی حصہ کمزور نہ رہ جائے۔ انہوں نے دو بھائیوں کی مثال دے کر سمجھایا: "فرض کرو کہ ان میں سے ایک طاقت ور اور دوسرا بیمار ہے۔ اب اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کی امداد کریں... میں اس بات سے خوش ہوں کہ ہمارے کالج میں ہندو مسلمان میں ذرا بھی امتیاز نہیں۔"

میں رہے فرقہ وارانہ عصبیت سے پاک رہے۔

حقیقت میں یہ سب سرسید کی نیک نیتی کا نتیجہ تھا۔ ایک مرتبہ وہ طلبا سے یوں مخاطب ہوئے: "تمھاری تعلیم و تربیت کے لیے اچھے سے اچھے استاد مقرر ہیں۔ بہترین کتب خانہ ہے، پڑھ لکھ کر اپنے فن میں کمال پیدا کرنے کے زرّیں مواقع ہیں۔ میں تمھیں ایک اور کتاب کا پتا دیتا ہوں جسے تم ابھی نہیں سمجھ پائے۔ وہ تمھارے دن رات کے ساتھی ہیں جو دور دراز سے بغرض تعلیم یہاں آئے ہیں۔ کھیلوں کے میدان ہوں یا مباحثے کا ہنگامہ انھیں پڑھتے جاؤ۔ اس کتاب کا پڑھنا ایک ایسا آرٹ ہے جو اہم ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل ترین ہے۔ یہ تمھیں زندگی گزارنے کے فن سے واقف کروائے گا۔ یہ کتاب ہر جگہ موجود ہے اس کے باوجود ایک راز ہائے سربستہ ہے۔"

سرسید کے متعلق گاندھی جی کے یہ الفاظ آج بھی بہت سوں کو یاد ہیں: "ان سے زیادہ بے تعصب اور اتحاد قومی کا دل دادہ اس وقت کوئی نہ تھا۔"

سرسید ملک کی خیر خواہی کرنے والے ہر شخص کی تعریف کرتے تھے مثلاً ایک موقع پر فرمایا کہ میری دانست میں کوئی گورنر جنرل، کوئی وائسرائے، کوئی ملک کا خیر خواہ ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان اور ہندوستانیوں پر احسان کیا ہو... جس نے طے کرایا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں یوروپین سائنس کی اعلیٰ تعلیم دی جائے... پنجاب کے لوگ سوچیں کہ اس نے کیسی مفید چیز ہم کو دلادی۔ اس سے پہلے انھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریزوں کو سمجھا دیا تھا کہ اب ہندوستانی قوم کو خوش اور مطمئن کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔ حکومت نے تھوڑی بہت توجہ کی تو قوم کو کسی قدر اطمینان ہوگیا۔ اس کے باوجود انھوں نے حکومت کی پالیسی کو مکمل نہیں سمجھا اور اسے غیر مشروط طور پر قبول کیا بلکہ اسے تکمیل تک پہنچانے کی اخیر تک کوشش کرتے رہے۔

تعلیم کے علاوہ سماجی خرابیوں کو دور کرنا بھی ان کے دائرۂ کار میں تھا۔ سائنٹفک سوسائٹی مورخہ 5 جولائی 1866 میں چھپے ہوئے ایک لیکچر کا اقتباس دیکھیے: "..... بری رسموں میں نہایت بری رسم بیوہ کے حق ہونے کی ہے... دختر کشی، شادیوں میں اسراف ہونا اب بھی موجود ہے... اس امر میں پند و نصیحت اتنا کام نہ کرے گی جتنا اس کے امتناع کا یہ قانون اثر کرے گا۔ اس کے لیے بھی پہلے ہی گورنمنٹ کے حضور ایک عرضی گزرانی جا چکی ہے۔"

سرسید کو ہمیشہ یہ فکر تھی کہ کہیں ہماری سماجی گاڑی جس میں دو قومیں جتی ہوئی ہیں، ایک فریق کی معذوری سے الٹ کر نہ رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رام گوپال نے ان کے کانگریس سے عدم تعاون کو جذبۂ وفاداری کا نتیجہ بتایا ہے۔ اور یانکر نے تو ان کے مخلص محب وطن ہونے کے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ اس کی تفصیل A Survey of Indian History P.87 پر مل جاتی ہے۔ ان پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ انگریزی کے پرستار تھے۔ بے شک دہلی کالج میں جدید علوم و فنون ترجموں کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی میں بھی برابر ترجمے ہو رہے تھے لیکن سرسید کو اس سے اطمینان نہ تھا۔ وہ انگریزی زبان کو ترجیح اس لیے دے رہے تھے کہ اس میں سبھی مغربی علوم جمع تھے۔ اس کے بغیر انھیں اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے راستے مسدود نظر آرہے تھے۔ مسلمان مغربی تعلیم

کو دین میں بگاڑ کا سبب سمجھ رہے تھے۔ سرسید نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے مضامین لکھے اور لکھوائے۔ ان کے خیال میں حکومت سے مصالحت ضروری تھی۔ اس مہم میں اظہارِ وفاداری تو تھا ہی مگر اپنی خودداری کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھودے۔ وہ بچوں کو مشنری اسکولوں میں بھیجنے کے بھی حق میں نہ تھے اور کالج کی تعلیم کو بھی حتی المقدور حکومت کے اثر سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چناں چہ اپنے تعلیمی اداروں کے بارے میں لکھا: ''یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں... دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی... اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم اپنے آپ قومی علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا، سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔''

سرسید خوب سمجھتے تھے کہ ہمارے لیے صرف مشرقی تعلیم کا انتظام کافی نہیں ہے۔ چناں چہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہمیشہ اصلی تعلیمی ترقی کی طرف متوجہ کرتے رہے مثلاً: ''ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے ہماری قوم اور ہمارے ملک کی بہبودی اور ترقی کے لیے ایسا نہ ہو کہ صرف دھوکا ہو۔ ہم کو پہلے زمانے کے قصے کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا کی سلطنت کے زمانے میں علوم وفنون کیا تھے اور ان کے وقت میں ان کو کیسی ترقی ہوئی محض بے فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانے کی حالت پر... غور کرنا اور اس کو ہندوستان ہی کے حدود میں رکھنا ہمارے لیے زیادہ تر مفید اور زیادہ تر بکار آمد ہے۔''

ان کا خیال تھا: جو تعلیم حسبِ ضرورتِ زمانہ نہیں وہ فضول ہے۔ بے شک عام تعلیم کی اشاعت کا ذریعہ دیسی زبان ہی ہے مگر وہ صرف دیہاتی مکاتب اور تحصیلی اسکولوں تک محدود رہے تو اچھا ہے نہ کہ اعلیٰ تعلیم میں ہو۔'' ایک اور جگہ تنبیہ کی کہ ''اس زمانے کے مناسبِ حال بلاشبہ ایک شخص کو جو سچے دل سے قوم وملک کی ترقی کا خواہاں ہو، اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبان کے ذریعے اپنے ملک وقوم کو ترقی دیں نہایت واجب اور بجا خیال ہوسکتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوگئے اور زمانے نے بتا دیا کہ کدھر جا رہے ہو اور ٹھیک راستہ کدھر ہے۔'' وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے لیے اب یہ زمانہ بھی نہیں ہے کہ اپنی تعلیم کا مدار صرف یونیورسٹی کے امتحانوں پر اور بی اے، ایم اے کی ڈگری پانے پر محدود رکھیں بلکہ ہمارا فرض ہے کہ یونیورسٹی کی ڈگریوں کو اپنی تعلیم کے لیے ایک دروازہ سمجھیں اور بسم اللہ کہہ کر جہاز پر سوار ہوں اور اپنی کامل تعلیم کے لیے کیمبرج اور آکسفورڈ کو اپنی درس گاہیں بنائیں۔

سرسید ابن الوقت ہرگز نہ تھے۔ ان کی عظمت کا ہر ایک معترف تھا۔ ان کی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا:

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام
تعلیم اگر ہے اپنے زمانے کی حسبِ حال
پھر کیا امیدِ دولت و آرام و احترام

سرسید خوب سمجھتے تھے کہ ہمارے لیے صرف مشرقی تعلیم کا انتظام کافی نہیں ہے۔ چناں چہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہمیشہ اصلی تعلیمی ترقی کی طرف متوجہ کرتے رہے مثلاً: ''ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے ہماری قوم اور ہمارے ملک کی بہبودی اور ترقی کے لیے، ایسا نہ ہو کہ صرف دھوکا ہو۔ ہم کو پہلے زمانے کے قصے کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا کی سلطنت کے زمانے میں علوم و فنون کیا تھے اور ان کے وقت میں ان کو کیسی ترقی ہوئی، محض بے فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانے کی حالت پر... غور کرنا اور اس کو ہندوستان ہی کے حدود میں رکھنا ہمارے لیے زیادہ تر مفید اور زیادہ تر بکار آمد ہے۔''

سید کے دل میں نقش ہوا اس کا اب خیال
ذاتی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے، رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

انھوں نے قوم کی جو خدمات انجام دیں ان کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ یہ بات ایک اکیلے شخص سے کیسے ممکن ہوگئی۔ کام کی دھن میں کچھ فروگزاشتیں بھی سرزد ہوئیں مگر انھیں صحیح راستے پر چلتے ہوئے ٹھوکر لگنے (Erring on the right side) کا نام دینا چاہیے۔ ان کے خلوص کا عالم یہ تھا کہ جب ہندستان میں ان کی انسانی خدمات کے صلے میں ضلع بجنور کا ایک ضبط شدہ علاقہ بطور عطیہ دینا تجویز ہوا تو انھوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔ سنہ 1869 میں اپنا گھر بار، مال واسباب بیچ کر ملت کی ایک ذمے داری کو پورا کرنے کے لیے لندن کا سفر کیا۔ سوسائٹی کے کام کو اپنا کام سمجھا، اپنا قیمتی وقت دیا، اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اس کے کاموں پر خرچ کیا۔ اپنا ذاتی پریس جو آٹھ دس ہزار کا تھا اس کی نذر کردیا۔ حتیٰ کہ بیگم بھوپال کی طرف سے ملی ہوئی انگوٹھی بھی دے دی۔ مدرسے کے لیے گلے میں جھولی ڈال کر بھیک مانگی۔ کسی زمانے میں دربار دہلی سے انھیں جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب ملا تھا۔ انگریزوں نے انھیں Companian of the Star of India کا خطاب دے کر وائسرائے کی مجلس مشاورت کا رکن نامزد کیا تھا۔ وہ چاہتے تو رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرسکتے تھے لیکن انھوں نے درویشانہ زندگی کو پسند کیا۔ ان کی موت بھی کسی دوست کے گھر میں ہوئی۔ اور احباب نے مل کر کفن دفن کا انتظام کیا۔

ایک کامیاب مصلح کا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کتنی راہیں روشن کرجاتا ہے، کیا کیا امنگیں اور حوصلے جگا جاتا ہے۔ سرسید خود تو کسی ایک فن میں یگانۂ روزگار نہ تھے لیکن یہ ان کی غیر معمولی شخصیت تھی۔ جس کی وجہ سے کتنے ہی باصلاحیت اصحابِ قلم اپنی قیمتی تحریروں سے قوم وملک کو فیض پہنچا گئے۔ ان سب میں حالی بہت نمایاں تھے جنھوں نے اپنے رفقا کی مدد سے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور اپنے طور پر مدوجزرِ اسلام جیسی معرکہ آرا مسدس لکھی۔ سرسید کہا کرتے تھے کہ اگر قیامت میں خدا نے پوچھا کیا لایا تو اپنے ساتھ کیا لایا تو میں کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔ بے ساختہ زبان سے نکلنے والا یہ خراج جو بیک وقت تحسین و عقیدت کے جذبے سے بھرپور ہے اپنے اندر ایک جہانِ معانی رکھتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کے کسی ادب میں کسی شخص یا اس کے کارنامے کے لیے ایسا Tribute نہیں ملا ہوگا۔

اس طرح علی گڑھ تحریک جتنی تمدنی تھی اتنی ہی ادبی تھی۔ وہ جہاں تہذیب کو رفتارِ زمانہ کے مطابق بنانے میں مصروف تھی وہاں شعر وادب کے دائرے میں آکر ادبی بھی بن گئی اور قومی ہم آہنگی کی عمارت کا اہم ستون ثابت ہوئی۔

ماخذومراجع:

1 تہذیب الاخلاق 2 علی گڑھ گزٹ 3 مقالات دلوائے آزادی 4 مقالات از ہندوستان مسلم کارابطہ 5 مقالات درجن ہند اشرف انصاری (1969) 6 مقالات سرسید 7 آشفتہ بیانی میری 8 میری کہانی 9 حیات جاوید 10 خطبات عبد الحق 11 مضامین محمد علی 12 Indian Muslims 13 فروغ یک جہتی میں اردو زبان کا رول

Abdullah Salman, 26, Haines Road, 1st Floor, Egyptian Block, Bangalore -560051.
Mob: 9341378921.
E-mail: salman_pbh@rediffmail.com

جاوید اختر انصاری

سرسید اور بنارس کی اصلاحی سرگرمیاں

سرسید احمد خاں اس اعتبار سے امتیازی مقام کے حامل ہیں کہ ان کا تصور اصلاح بہت بلند اور اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے ان کے کاموں کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ وہ عام طور پر مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت، جدید علوم و فنون کے فروغ اور ان میں فکری و عملی طور پر ایک انقلابی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ اگر ہم سرسید کی پوری زندگی پر نظر ڈالیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مختلف شہروں کے ساتھ ساتھ انگلستان کا بھی سفر کیا اور اس دوران مختلف شہروں میں قیام کر کے اپنے کاموں کو وقت کے تقاضے کے عین مطابق پورا کرتے گئے۔ سرسید نے جن شہروں میں رہ کر قوم کی فلاح اور اصلاح کے کاموں کو آگے بڑھایا ان میں بنارس کا نام بھی قابل ذکر ہے۔

سرسید احمد خاں 15 اگست 1867 کو عہدۂ جج کاز کورٹ پر ترقی پا کر علی گڑھ سے بنارس آئے۔ علی گڑھ سے چلتے وقت انھوں نے اپنی ساری ذمے داری سوسائٹی کے راجہ جے کشن داس سی ایس آئی کو سپرد کر دی جو اس وقت علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ حالانکہ سرسید بنارس میں رہ کر بھی سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کو برابر تقویت دیتے رہے اور ان کے مفید آرٹیکلس اور مضامین اسی طرح سوسائٹی کے اخبار میں برابر چھپتے رہے۔ اگرچہ سرسید کا تعلق ملازمت کے آخیر زمانے یعنی جولائی 1876 تک بنارس کے ساتھ رہا لیکن چونکہ وہ یکم اپریل 1869 کو بنارس سے ولایت چلے گئے تھے، اس لیے پہلی بار بنارس میں ان کا قیام ایک برس اور ساڑھے سات مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔ چنانچہ سرسید نے اپنی اس قلیل مدت میں بنارس میں چند اہم کام کیے جو قابل ذکر ہیں:

(1) ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک:

یکم اگست 1867 کو جب سرسید علی گڑھ میں تھے تو انھوں نے ایک درخواست انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال مغرب کی طرف سے وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کی خدمت میں بھیجی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا:

(i) اعلیٰ درجے کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہو۔

(ii) دیسی زبان میں ان مضامین کا سالانہ امتحان بھی ہو کیونکہ کلکتہ یونیورسٹی میں طلبہ انگریزی میں امتحان دیتے تھے۔

(iii) جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو علم کی مختلف شاخوں میں عطا ہوتی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو بھی دی جائیں جو دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوتے ہیں۔

(iv) ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمال مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک

ممکن ہوگا سوسائٹی انجام دے گی۔

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے خصوصی توجہ کی۔ چنانچہ جو مکتوب سکریٹری گورنمنٹ ہند کا مورخہ 5 ستمبر 1867 سرسید کے نام بمقام بنارس موصول ہوا اس میں لکھا تھا:

"نواب گورنر جنرل اور تمام اکل کونسل نہایت خوشی سے ان تمام کوششوں کی قدر کریں گے جو ایسی سوسائٹیاں جیسی کہ آپ کی سوسائٹی ہے یا خاص خاص آدمی اس مقصود (یعنی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے) کو ترقی دینے کے لیے کریں گے جو آپ کی سوسائٹی کو اور گورنمنٹ کو برابر منظور نظر ہے۔"

"ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ ہو جائیں بلکہ علوم و فنون کے وسیع دائرہ میں طلبا کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ دیسی زبان میں اب تک موجود نہیں ہے اس لیے کچھ عرصہ تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے سے یہ بات حاصل کرنی ہوگی۔"

"نواب گورنر جنرل بہادر با اجلاس کونسل اُن تدبیروں سے خاص رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو دیسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے اختیار کی ہیں۔"

اس طرح اول اول سرسید بہت سرگرمی کے ساتھ اپنی عادت کے موافق اس یونیورسٹی کے قیام کی تدبیروں میں مصروف رہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو صرف بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی چنانچہ سرسید نے بنارس انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسے میں جو اسی معاملے پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ:

"مسٹر کیمسن (ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اضلاع شمال مغرب) نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان سکھلائی جائے اور اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ مانا جائے بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اس کے ساتھ ایک اور سررشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعے سے بہ کثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں یا کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو۔"

اس کے بعد اپریل 1868 میں جب نواب لیفٹیننٹ گورنر بھی بنارس انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھے۔ سرسید نے پھر اس تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیوں کر پہنچے۔"

غالباً اس میں طرح طرح کی مشکلات حائل ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ سرسید اور ان کے رفقا سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ دلی سوسائٹی کے ممبر یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا مقام دلی ہونا چاہیے جب کہ سائنٹفک سوسائٹی اور بنارس انسٹی ٹیوٹ کی خواہش تھی کہ اس کا مقام شمال مغربی اضلاع کا کوئی شہر ہو۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں یہ بحث چھیڑ دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے اور ساتھ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ ہندی زبان سر دست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی، اس امر پر زور دیا کہ اس کی ترقی میں کوشش کر کے اس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔

Remains of Sir Syed's old bungalow at Aligarh. (near Tasveer Mahal).

(2) ہومیوپیتھک علاج کی حمایت:

سرسید کو بنارس میں ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقے سے بہتر کوئی دوسرا طریقۂ علاج نہیں ہے۔ اور جیسا کہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو تجویز ملک کے لیے مفید لگی اس کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انھوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے 1867 میں ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور ہندوستانیوں کو اس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکریٹری سرسید قرار پائے۔ اور کمیٹی کی تجویز سے 25 ستمبر 1867 کو بنارس میں ایک شفا خانہ بنام "ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل" کھولا گیا۔ سرسید نے ہر طریقے سے جو ان کے اختیار میں تھا لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائی اور بعض اپنے دوستوں کو جو کسی مرض میں مبتلا تھے بنارس میں بلانے کے لیے خط لکھے اور جو وہاں نہ پہنچ سکے ان کے لیے دوائیں بھجوائیں۔ اس طرح شفا خانے کا چرچا چند روز میں دور دور تک ہو گیا۔ پاینیر کے پرچہ میں 4 دسمبر 1867 میں اس شفا خانے کی نسبت یہ چھپا تھا کہ "پہلے ہی مہینے میں پانسو سولہ بیمار علاج کے لیے ہوسپٹل میں آئے۔ 17 دسمبر کو سرسید نے ایک طول طویل لکچر ہومیوپیتھک طبابت کی تاریخ اور اس کے اصول پر اور اس بات پر کہ یہ طریقۂ علاج تمام طریقوں سے زیادہ مفید اور بے خطر ہے، کمیٹی کے عام جلسے میں دیا۔ اور 1868 میں ایک رسالہ ہیضہ کے علاج پر بموجب اصول ہومیوپیتھک کے لکھا۔ یہ لکچر اور یہ رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

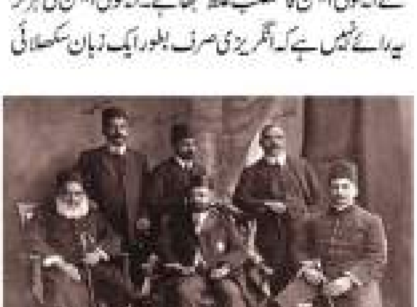

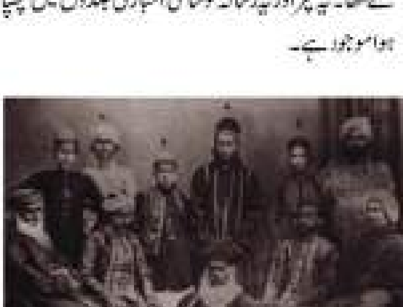

(3) اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت:

1867 میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی خط کو موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اُس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ دوسری طرف ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی کہ اردو زبان اور فارسی خط کو کسی بھی طرح سے ختم کیا جائے اور اس کے لیے کئی کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں۔ چنانچہ ان واقعات سے سرسید کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال تھا۔ ان کا بیان ہے کہ:

"انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشن گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

اس کے بعد مارچ 1898 میں سر انٹونی لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے بھیجا تا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس وقت ان سبھی چیزوں کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اس حالت میں انھوں نے اس موضوع پر ایک آرٹکل لکھا جو 19 مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ اس آرٹکل میں انھوں نے لکھا کہ:

"ہندوستان میں کوئی زبان اردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی، اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں اردو دوسری زبانوں کی بہ نسبت کم بولی جاتی ہے مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں اردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں۔ خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کرچکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اردو ہے اور اسی بنا پر 1835 میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تامل بھی ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی تامل نہیں ہوسکتا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہے۔ یہ صوبہ ان دو شہروں سے گھرا ہوا ہے جو اردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں یعنی دلی اور لکھنؤ۔ اس صوبے کے ہندو عموماً اردو سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے مسلمان..........."

(4) سرسید کے ذریعہ رسالۂ احکام طعام اہل کتاب جاری ہونا:

سرسید نے 'رسالہ احکام طعام اہل کتاب' 1868 میں بنارس سے جاری کیا جس میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور

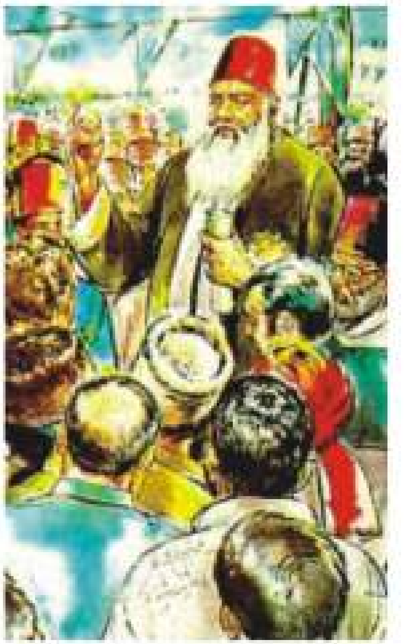

روایات فقہی سے اور خاص کر شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوے سے جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود ان کے ساتھ انھیں کے ہاتھ کا پکا ہوا، انھیں کے برتنوں میں اور انھیں کا ذبیحہ جس طرح کہ انھوں نے کیا ہو، کھانا درست ہے؟ صرف سور اور شراب اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

اس رسالے میں ان تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علمائے اسلام مواکلت اہل کتاب پر کرتے تھے اور جن شبہات کی وجہ سے مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں کی ہر ایک کھانے پینے کی چیز اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب تھا، نہایت شافی طور پر جو ایک منصف مزاج آدمی کی تسلی کے لیے کافی تھا، لکھا۔ جب یہ رسالہ چھپا تو اول اول بہت شور وغل ہوا۔ سرسید کو بہت برا بھلا کہا گیا۔ ان کے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کیا گیا۔ ان کے رسالے کے جواب لکھے گئے۔ مگر سرسید جانتے تھے کہ یہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک بگولا اٹھا اور خاک اڑا کر چلا گیا پھر سب کچھ صاف ہوگیا۔ اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے ہاں جاکر اور ان کو اپنے ہاں بلا کر ساتھ کھانے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تقوے اور طہارت پر بدستور قائم ہیں۔

(5) کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان:

سرسید نے 1870 میں قومی فلاح وبہبود اور مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ دینے کے لیے بنارس میں ایک کمیٹی بنائی جس کا نام 'کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان' تھا۔ اس کمیٹی کی طرف سے ایک انعامی اشتہار شائع کیا گیا کہ لوگ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مضامین لکھ کر بھیجیں۔ اچھے مضامین کے لیے تین انعام پانچ سو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپے کے مقرر کیے گئے۔ منتخب مضامین میں مہدی علی خاں اور مولوی مشتاق حسین کے مضامین بھی شامل تھے۔ ان مضامین کی مدد سے اردو اور انگریزی میں ایک رپورٹ تیار کی گئی۔ جبکہ ایک دوسری کمیٹی رقم کی فراہمی کے لیے بنائی گئی۔ اس کا نام 'کمیٹی خزینۃ البضاعۃ' طے پایا۔ رقم جمع ہونی شروع ہوگئی اور طے پایا کہ تعلیمی ادارے یعنی کالج کے لیے زمین خریدی جائے۔ اس کے لیے مقام کا انتخاب ضروری تھا۔ جولائی 1872 میں کمیٹی خواستگار تعلیم کی طرف سے اشتہار جاری کرکے ممبران سے دریافت کیا گیا کہ مدرسۃ العلوم کس شہر میں قائم کیا جائے۔ ممبران نے کثرت رائے سے علی گڑھ پسند کیا۔ اب کالج کا قائم ہونا یقینی نظر آنے لگا۔

اس طرح سرسید نے اپنی ساری زندگی جدوجہد کے عنوان سے گزار دی اور اس جدوجہد کے نتیجے میں بے شمار کارنامے وجود میں آئے۔ انھوں نے بنارس میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا:

تیرے احساس رو رو کر سدا یاد آئیں گے ان کو
کریں گے ذکر ہر مجلس میں دہرائیں گے ان کو

■

Javed Akhtar Ansari, Research Scholar,
Department of Urdu, BHU,Varanasi

اردو زبان اور اس کی عہد بہ عہد کی ترقی

یہ مضمون سرسید نے 1847 میں اس وقت لکھا تھا جب انہوں نے نہایت محنت اور جاں فشانی کے بعد دھلی کی عمارات اور اس کے محلات و مزارات کی جامع تاریخ 'آثار الصنادید' کے نام سے مرتب کی۔ اس مضمون میں سرسید نے بتایا ہے کہ اردو زبان کیا ہے؟ اور کیوں وہ اردو کے نام سے موسوم ہوئی؟ کس طرح رفتہ رفتہ وہ صاف و شستہ ہوتی گئی اور کن کن لوگوں نے اس کی ترقی و عروج میں حصہ لیا؟ اب منجھ منجھا کر وہ کیسی ہو گئی ہے؟ اور عام طور پر کس شہر کی بولی سب سے زیادہ صحیح اور مستند سمجھی جاتی ہے؟

اس مضمون میں سرسید نے اردو کے ادیبوں اور انشاپردازوں کو نہایت قابل قدر نصیحت یہ کی ہے کہ اگر تم اردو زبان میں فارسی کی تراکیب اور الفاظ زیادہ لاؤ گے تو یہ کوئی خوبی نہیں ہوگی بلکہ عیب ہوگا۔ اور ایسا کرنے کا نقصان یہ ہوگا کہ زبان میں 'اردو پن' نہیں رہے گا۔ سرسید کی یہ نصیحت آج بھی ایسی ہی ضروری اور اسی قدر لائق عمل ہے جیسا اب سے ایک سو تیرہ برس پہلے تھی۔ یہ مفید اور معلوماتی مضمون سرسید نے اپنی کتاب 'آثار الصنادید' کا چوتھا باب شروع کرتے ہوئے اس میں شامل کیا تھا۔''

(محمد اسماعیل پانی پتی)

اس ملک میں اب جو زبان مروج ہے اور جس میں سب لوگ بولتے چالتے ہیں اس کا نام 'اردو' ہے اور تحقیق اس کی یوں ہے کہ 'اردو' فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی 'بازار' کے ہیں اور اردو سے مراد اردوئے شاہ جہاں ہے۔

اگرچہ دلی بہت قدیم شہر ہے اور ہندوؤں کے تمام راجہ پرجاؤں کا ہمیشہ سے دارالسلطنت رہا ہے، لیکن سب اپنی اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ایک کی دوسرے سے زبان نہیں ملتی تھی۔ جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عملداری ہوئی اور مسلمان لوگ ان شہروں میں آئے (تو) اور بھی مشکل پڑی اور نئی زبان کے لوگوں کے آنے سے سودا سلف لینے، بیچنے بچانے، میں دقت پڑنے لگی۔ اول اول تو مسلمانوں کی عملداری میں اختلاف رہا۔ کبھی کسی کی بادشاہت رہی اور کبھی کسی کی، کبھی غوری آئے اور کبھی لودھی اور کبھی پٹھان اور کبھی مغل، اس سبب سے زبان کا بدستور اختلاف چلا گیا اور کوئی شخص اس کی اصلاح کے پیچھے نہ پڑا۔ جبکہ اکبر بادشاہ ہوا ایک گونہ سلطنت کو قیام ہوا اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے بیٹھے اور علم کا بھی چرچا ہوا لیکن اس زمانہ میں فارسی زبان کی ایسی قدر تھی کہ لوگ اور کسی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے تھے۔ جبکہ شہاب الدین شاہ جہان بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلی شہر کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہ جہاں آباد اس کا نام رکھا۔ اس وقت اس شہر میں تمام لوگوں کا مجمع ہوا، ہر ایک کی گفتار رفتار جدا جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین لفظ دوسرے کی زبان کے، ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود ایک نئی زبان ہو گئی اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر امراء اسی کو بولا کرتے تھے، گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے خود اس زبان ہی کا 'اردو' نام ہو گیا۔

اس وقت سے اس زبان نے ایک رونق حاصل کی اور دن بہ دن تراش خراش اس میں ہوتی گئی یہاں تک کہ جس زمانہ میں میر اور سودا نے آوازہ اپنی خوش زبانی کا بلند کیا تھا اور یہ آوازہ ہر ایک کے کان میں پہنچایا تھا۔ اس وقت یہ زبان بہت درست ہو گئی تھی اور عجب رنگ ڈھنگ نکال لائی تھی، ان کے بعد کچھ کچھ اس زبان میں اور تغیر و تبدیل ہوئی اور اب ایسی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں اور اس زبان کو شاہ جہان آباد سے ایسی نسبت ہے جیسے فارسی کو شیراز سے، یعنی یہاں کے لوگوں کی زبان تمام اردو بولنے والوں کو سند ہے۔ نہیں تو بقول میر امن کے اپنی دستار، رفتار، گفتار کو کوئی برا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر والوں کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند۔

اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی اور عربی اور سنسکرت کے الفاظ مستعمل ہیں اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر و تبدیل کر لی ہے لیکن اس زمانہ میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کی لغت بہت ملا دیتے ہیں اور یہ فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں، یہ دونوں باتیں اچھی نہیں۔ ان سے اردو پن نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ اس بات کے لیے کہ کس قدر فارسی کی ترکیب دی جاوے، اور کون کون سی لغت اور زبانوں کی نہ بولی جاویں۔ کوئی قاعدہ نہیں مقرر ہو سکتا۔ یہ بات صرف اہل زبانوں کی صحت پر منحصر ہے۔ ■

اردو زبان اور اس کا بیان

(آثار الصنادید مطبوعہ 1854 و 1904)

اردو زبان کے متعلق یہ مضمون سر سید مرحوم نے 'آثار الصنادید' کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ 1854 کے آخر میں لکھ کر شامل کیا تھا۔ 1904 کے کان پور والے ایڈیشن میں بھی یہ مضمون موجود ہے۔ صرف پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔ اردو زبان کی مختصر تاریخ اور اس کی بتدریج اشاعت کے سلسلہ میں غالباً یہ پہلا مضمون ہے جو سرسید کے قلم سے نکلا۔ لسانیات کے متعلق بھی بہت سی نئی باتیں آپ کو اس مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوں گی۔

(محمد اسماعیل پانی پتی)

(1) ہندوؤں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے چالنے لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ 587 ہجری مطابق 1911 عیسوی موافق سمت 1248 بکرماجیت کے جب مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پکڑا تو بادشاہی دفتر فارسی ہوگیا۔ مگر زبان رعایا کی وہی بھاشا رہی۔ 894 ہجری مطابق 1488 تک بجز بادشاہی دفتر کے رعایا میں فارسی کا رواج نہیں ہوا۔ اس کے چند روز بعد سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں میں سے کائستھوں نے جو ہمیشہ سے امورات ملکی اور ترتیب دفتر میں مداخلت رکھتے تھے، فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اور قوموں نے بھی شروع کرلیا اور فارسی لکھنے پڑھنے کا ہندوؤں میں بھی رواج ہوگیا۔

(2) اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں تغیر و تبدل نہیں ہوئی تھی، مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پر جب بھی امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں ہی کے زمانے سے یعنی حضرت مسیح سے تیرہویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کیے تھے اور کچھ پہیلیاں اور مکریاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہی تھیں۔ جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا۔ مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جائے۔ جبکہ شاہ جہاں بادشاہ نے 1058 ہجری مطابق 1648 کے شہر شاہ جہاں آباد آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا اس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بسبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدیل ہوگئی۔ غرض کہ بادشاہی اور اردو معلیٰ میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہوگئی اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا۔ پھر کثرت استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہوکر اس زبان کو اردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ تخمیناً 1100 ہجری مطابق 1688 کے یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔ اگرچہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اس زبان میں ولی نے شعر کہا مگر خود ولی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کسی نے اس زبان میں شعر کہا ہے کیونکہ اس کے شعروں میں اور شاعروں کی زبان پر طرز تعلق ہے مگر اس زمانے کے شعر بہت پھیکے اور نہایت سست بندش کے تھے۔ پھر دن بدن اس کو ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میر اور سودا نے اس کو کمال پر پہنچا دیا۔

(3) میر کی زبان ایسی صاف اور شستہ ہے اور اس کے شعروں میں ایسے اچھے محاورات بے تکلف بندھے ہیں کہ آج تک سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سودا کی زبان بھی اگرچہ بہت خوب ہے اور مضامین کی تیزی میر پر غالب ہے مگر میر کی زبان کو اس کی زبان نہیں پہنچتی۔

(4) اردو نثر لکھنے والوں میں میر امن جس نے باغ و بہار لکھا۔ سب پر فوق لے گیا۔ حقیقت میں نظم لکھنے میں جیسا کمال میر کو ہے نثر لکھنے میں ویسا ہی کمال میر امن کو ہے۔

(5) عربی زبان کا اردو میں ترجمہ سب سے پہلے مولوی عبدالقادر صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب نے کیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب کا اردو ترجمہ کلام اللہ کا اردو لغات کے لیے ایک بڑی سند ہے اور مولوی رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ترکیب نحوی کے لیے ایک بہت دستاویز ہے۔

(6) اردو زبان کے شعروں کا بھی طریقہ فارسی شعروں کے قاعدے پر یوں بھی آن پڑا، کہ گویا جوان مرد، خوبصورت لڑکے کی تعریف میں شعر کہتا ہے۔

(7) ہندی بھاشا میں دستور تھا کہ عورت کی زبان سے مرد کی نسبت شوقیہ شعر ہوتے تھے۔ بعضی بعضی وقت اردو زبان میں اسی طرح پر بھی شعر کہا جاتا ہے اور اس کو ریختی بولتے ہیں۔ غالب ہے کہ تخمیناً 1220 ہجری مطابق 1805 کے انشاء اللہ خاں نے اس کو رواج دیا۔

(8) فارسی شعروں میں جو بحریں اور اقسام ہیں وہ سب اردو میں مروج ہیں۔ (مکری اور پہیلی کہنے کا وزن بھی اور یہ زبان بھی ایسی ہے، جس میں اکثر بھاشا ملی ہوئی ہو۔

(9) نسبتیں جو مشہور ہیں، فقرے ہوتے ہیں کہ ان میں دو یا تین یا زائد چیزیں جس میں کچھ باعتبار ظاہر کے مناسبت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بیان کی جاتی ہیں اور مخاطب سے پوچھا جاتا ہے کہ ایسی ایک بات جو جامع بیان کرے۔ جو سب میں پائی جائے۔

(10) پہیلی میں کسی چیز کے اوصاف اور خصائص اور پتے بیان کیے جاتے ہیں اور مخاطب سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے۔ بڑی خوبی پہیلی کی یہ ہے کہ اس میں اس چیز کا نام بھی آجائے جس کے اوصاف اور خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ پھر اس پر بھی مخاطب نہ سمجھے۔

(11) مکری میں عورت کی زبان سے ذو معنی بات بیان کی جاتی ہے جن میں ایک سے معشوق مراد ہوتا ہے اور دوسری سے اور کچھ تاکہ اس کا جب چاہے معشوق کی بات سے مکر جائے۔

پہیلیاں

بالا تھا تو سب کو بھایا   بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
میں نے دیا اس کا ناؤں   بوجھو تو نہیں چھوڑو گاؤں
(دیا یعنی چراغ)

فارسی بولی آئی نہ   ترکی بولی پائی نا
ہندی کہتے عارسی آوے   منہ دیکھوں جو اسے بتاوے
(آئینہ)

مکری

آپ ہلے اور موکو ہلاوے   وا کا ہلنا موکو بھاوے
ہل ہل کے بھیا لسکھا   اے سکھی ساجن نا سکھی پنکھا
(پنکھا)

نسبتیں

گوشت کیوں نہ کھایا   ڈوم کیوں نہ گایا   گلا نہ تھا
انار کھایا کیوں نہیں   وزیر رکھا کیوں نہیں   دانا نہ تھا
سموسہ کیوں نہ کھایا   جوتا کیوں نہ پہنا   تلا نہ تھا

ریختی

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم
لو میں بھی نہ بولوں گی خدا کی قسم اچھا

شعر اردو

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دیوانے ہیں
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

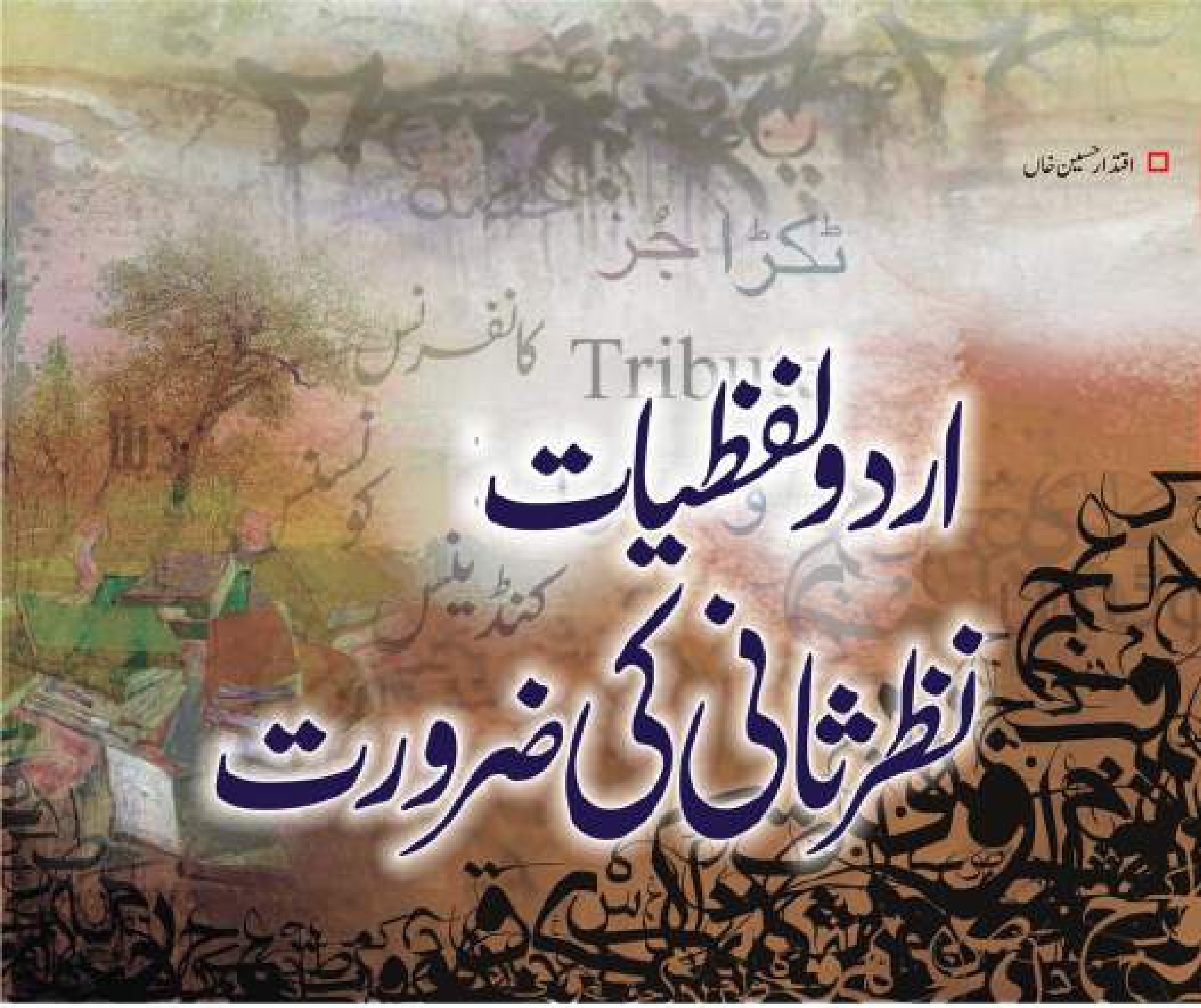

اقتدار حسین خاں

اردو لفظیات نظرِ ثانی کی ضرورت

علی سردار جعفری اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:
"ایک زبان دوسری زبان کے مقابلے میں ہمیشہ کوتاہ دامن ہوتی ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اردو انسانی سرگرمیوں اور زندگی کے بہت سے پہلوؤں کے بیان کے لیے ایک وسیع اور متنوع لفظیات اور محاورے اپنے وافر اثاثہ میں رکھتی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی اردو داں طبقہ اور دانشور واقف ہے کہ اردو میں علمی اصطلاحات و الفاظ کی کمی ہے۔ جب کبھی کبھی علمی مسئلے پر قلم اٹھایا جاتا ہے تو مضمون نگار کے منشا کے مطابق مفہوم کے اظہار کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ بعض تصورات اور احساسات کے لیے مصنفین جن الفاظ کا استعمال کرتے ہیں ان سے قاری کو کسی قدر ناموزونیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر دیکھا گیا ہے کہ اپنے مفہوم کے اظہار کے لیے مصنفین انگریزی اور ہندی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ اردو زبان کی بنیادی خصوصیات میں اس کی شیرینی، موسیقی، فصاحت و بلاغت شامل ہیں۔

انگریزی الفاظ کے بے تحاشہ اور کثرت کے ساتھ استعمال سے اردو کی نہ صرف روح مجروح ہوتی ہے بلکہ قاری بھی اکثر ذہنی خلل اندازی محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اکثر علمی اور غیر مرئی تصورات کے اظہار کے لیے اردو میں موزوں الفاظ و اصطلاحات دستیاب نہیں ہوتے اور "ان مسائل پر لکھنے کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔" برسوں پہلے علامہ اقبال نے جس کمی کا شکوہ اس شعر سے کیا تھا:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

آج بھی اس کا احساس ہوتا ہے:
ایسا نہیں ہے کہ نئے لکھنے والے ہی انگریزی الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ بعض معتبر اور مشہور مصنفین بھی انگریزی الفاظ و محاورات کا بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول "گردش رنگ چمن" میں انگریزی الفاظ کا برجستہ استعمال کیا ہے۔ ذیل میں ایک اور مضمون سے ایک مختصر اقتباس پیش ہے:

"اس لیے یادتاژ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔۔۔ وہاں رپورٹنگ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔۔۔ اپنے سبجیکٹ کے ساتھ۔۔ اسے ہم flashback کہہ سکتے ہیں۔۔۔ یہ زوال آمادہ فیوڈل طبقہ کے لوگ۔۔۔ معنی خیز بیچ ہے۔ خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہے تھے۔"[1]

ایک اور مصنف کا کہنا ہے "سرسید کا طرز تحریر نہایت موثر vigorous style تھا۔"[2]

اردو میں موزوں اور مناسب لفظ نہ ملنے پر انگریزی یا ہندی کا لفظ استعمال کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ لیکن اگر اجتماعی یا انفرادی کاوشوں سے اردو میں نئے الفاظ اختراع کر لیے جائیں تو اردو کا سرمایہ الفاظ مزید وسیع ہوسکتا ہے۔ ذیل میں ہم ایک لفظ 'حسن' پر لسانیاتی اور معانیاتی رو سے بحث کریں گے اور پھر ہم اکثر دانشوروں کا اس لفظ کے استعمال پر تبصرہ کریں گے۔

لسانیات میں کسی لفظ کے معنی کو دو خاص نظریوں سے سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر ٹرائر کا عملی دائرہ کا نظریہ

دیکھیے مضمون 'علی سردار جعفری' فکر و نظر، جون 2011 ص 151

(Words-in-action) یعنی یہ لفظ کسی تصور یا شے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا نظریہ پروفیسر وٹن اسٹائن کا ''لفظ کا متاثرہ علاقہ (Semautic field) کا ہے۔ جس میں لفظ کے معنی کے حدود متعین کرتا ہے۔ ان تصورات کی روشنی میں لفظ 'حصہ' کے معنی کا مطالعہ کیجیے۔ کسی بھی اردو بولنے والے شخص سے اگر آپ 'حصہ' کے معنی پوچھیے تو وہ بے تکلف اس کے معنی جز، ٹکڑا، Part, Portion یا Share بتائے گا۔ اسی معنی میں یہ لفظ عموماً استعمال ہوتا ہے۔ یہ جملے عام ہیں: مجھے جائداد میں حصہ چاہیے۔ قربانی میں حصہ لیجیے۔ اس حصے میں آفس بنتا ہے۔ برابر کا حصہ کرو۔ وغیرہ۔ کسی بھی پہلو سے لفظ 'حصہ' سے 'Contribution' یا یوگ دان کا مفہوم نہیں نکلتا۔

لسانیات میں کسی لفظ کے معنی کو سمجھنے کے لیے اس کے جزوی پہلوؤں کا بھی تجزیہ کیا جاتا ہے جس کو (Componential Analysis) کہا جاتا ہے۔ اب اگر انگریزی لفظ (Contribution) اور اردو لفظ 'حصہ' کا جزوی تجزیہ کریں تو دونوں کے معنی میں فرق آسانی سے واضح ہو جاتا ہے۔

اردو لفظ حصہ انگریزی لفظ (Contribution) کے ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اب اوپر بیان کیے گئے نظریوں کے مطابق اس انگریزی لفظ میں دو مارفیم ہیں: 'Con' اور 'Tribute'۔ 'Con' انگریزی کے بہت سے الفاظ میں آتا ہے جیسے کانفرنس، کنڈینس، کونسنس (Consenus) وغیرہ۔ ان سب میں 'Con' کے معنی ہیں 'یکجا کرنا' جمع کرنا، قریب لانا' 'Tribute' ایک لفظ بھی ہے جس کے معنی ہیں خراج پیش کرنا، وغیرہ۔ اس طرح 'Contribute' کے معنی ہوئے ''ایک بڑی اکائی تعمیر کرنے میں خراج یا تعاون پیش کرنا''

اس تجزیے سے یہ ظاہر ہے کہ اس لفظ میں دو اہم معنوی جزو ہیں: ایک، بڑی مقدار یا جمع کرنا، اور دوسرے: دینا، پیش کرنا، نذر یا خراج دینا۔

اب لفظ 'حصہ' کے معنوی پہلوؤں کو دیکھیں تو یہ پہلو تو ظاہر ہے کہ یہ ایک 'ٹکڑا' یا 'جزو' ہے۔ مثلاً ان جملوں میں یہ معنی صاف ہیں: مکان کے اس حصے میں آفس ہے۔'' اپنی آمدنی کا ایک حصہ غریبوں کے لیے الگ کرو۔'' وغیرہ۔ لیکن اس لفظ 'حصہ' کے معنی میں دوسرا پہلو یعنی 'دینا' کا تصور مفقود ہے۔ اس کے برخلاف اس میں 'لینے' یا 'وصول' کرنے کا پہلو زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جملے: ''مجھے جائیداد میں حصہ چاہیے۔ ہر ایک کو برابر کا حصہ ملے گا۔ تم اپنا حصہ لو۔''

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ 'حصہ' میں 'جزو' کا پہلو تو ہے لیکن 'دینا' کے بجائے 'لینا' کا تصور موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مضمون نگار 'Contribution' کے لیے 'حصہ' کا استعمال کرتا ہے تو ایک نامعلوم کمی یا کوتاہی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا سیاق و سباق اور لسانی ماحول سے 'Contribution' کا ہی مطلب سمجھ لیتا ہے۔ اب اگر ذیل میں دیے گئے عنوانات پر نظر ڈالیے تو ان کے معنی میں 'ابہام' یا 'گنجلک' کا احساس ہوتا ہے:

1. اردو نثر کی ترقی میں سرسید کا حصہ۔ اس کے ایک معنی یہ بھی اخذ کیے جاسکتے ہیں کہ اردو نثر میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے سرسید کو کیا ملا۔
2. ہندوستان کی بڑھتی ہوئی معاشی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ۔ اس عنوان کا مطلب یہی ہوگا کہ ہندوستان میں معاشی ترقی ہوتی ہے تو اس میں سے مسلمانوں کو کیا ملا؟

> **اردو لفظ 'حصہ' انگریزی لفظ (Contribution) کے ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اب اوپر بیان کیے گئے نظریوں کے مطابق اس انگریزی لفظ میں دو مارفیم ہیں: 'Con' اور 'Tribute'۔ 'Con' انگریزی کے بہت سے الفاظ میں آتا ہے جیسے کانفرنس، کنڈینس، کونسنس (Consonus) وغیرہ۔ ان سب میں 'Con' کے معنی میں 'یکجا کرنا' جمع کرنا، قریب لانا' 'Tribute' ایک لفظ بھی ہے جس کے معنی میں خراج پیش کرنا، وغیرہ۔ اس طرح 'Contribute' کے معنی ہوئے ''ایک بڑی اکائی تعمیر کرنے میں خراج یا تعاون پیش کرنا''**
>
> **اس تجزیے سے یہ ظاہر ہے کہ اس لفظ میں دو اہم معنوی جزو ہیں: ایک، بڑی مقدار یا جمع کرنا، اور دوسرے: دینا، پیش کرنا، نذر یا خراج دینا۔**

حقیقت یہ ہے کہ 'Contribution' کا ہم معنی یا مساوی لفظ اردو میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رضوان اللہ آروی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں انگریزی لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''یہ شوکت تھانوی کا ایسا 'Contribution' ہے جس سے بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا۔''4

ہندی میں اس تصور کے لیے نہایت موزوں اور آسان لفظ موجود ہے: 'یوگ دان'۔ کچھ مصنفین نے حصہ یا انگریزی لفظ کی جگہ 'یوگ دان' کو ترجیح دی ہے۔ لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی بہنیں ہیں اور دونوں میں صوتی، لفظی اور نحوی سطحوں پر کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے شاعر اور ادیبوں نے ہندی الفاظ کا استعمال بخوبی کیا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

انگریزی زبان نے اپنے لچکیلے رویے سے دنیا کی کئی زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر اپنے ذخیرے کو وسیع بنایا ہے جس سے انگریزی میں علمی و تحقیقی مضامین بآسانی تحریر ہو رہے ہیں۔ خود اردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس میں عربی و فارسی ہندی اور انگریزی کے الفاظ بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن آج بھی اردو کا لفظی سرمایہ اور نحوی ساخت بہت سے تصورات کو پیش کرنے میں معذور و نحیف نظر آتے ہیں۔ کمپیوٹر، موبائل اور دیگر ایجادات کے پیش نظر اردو میں لفظیات کو وسیع اور گہرا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ عمل اختراع اور مستعار دونوں طرح سے کیا جاسکتا ہے جس سے مضمون نگار کو اپنے مفہوم و منشا کو پیش کرنے میں موزوں الفاظ کے لیے جدوجہد کرنا پڑے۔

حوالہ جات و حواشی

1. خالد سعید: تعبیرات، پیش رفت پبلی کیشنز، گلبرگہ، ص 53
2. عبداللطیف اعظمی: اردو نثر کی ترقی میں سرسید کا حصہ، رسالہ 'ادیب' جامعہ اردو علی گڑھ، خصوصی شمارہ، جولائی۔ ستمبر 1993، جلد 17، ص 171
3. ایضاً، ص 170
4. جان ٹرائر (J. Trier)، 1934، جرمنی
5. وٹن اسٹائن (L. Wittenstein) 1953، جرمنی۔
6. رضوان اللہ آروی: اردو میں ناول نگاری کی روایت 'ادیب' علی گڑھ، شمارہ جولائی ستمبر 1993، ص 197
7. دیکھیے پروفیسر بی شیخ علی کی کتاب 'ابوالکلام آزاد: بصیرت اور عمل' 2012، ناشر: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، فرماتے ہیں: ''ایک نئی انسانیت پسندی اور امن و آشتی کی تلاش میں یقیناً ان کا عظیم یوگدان (Contribution) رہا ہے۔'' ص 8۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ''آزاد کا دیریا یوگدان (Contribution) سیاست کے بجائے مذہب اور ادب کے میدان میں رہا ہے۔'' ص 29۔ ان دونوں جگہوں پر جہاں 'یوگدان' استعمال ہوا ہے کیا ہم 'حصہ' کا استعمال کر سکتے ہیں!

■

Prof. Iqtidar Husain Khan, 4/757, Friends Colony, Sir Syed Nagar, Aligarh - 202002 (UP)

زبان و تعلیم

ریاض احمد

برنن کالج کی اردو خدمات

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ اسی طرح جنوبی ہند میں تلیچری کے برنن کالج کی خدمات بھی قابل قدر اور ناقابل فراموش ہیں۔ شمالی ہند کے برعکس اردو کے مرکز سے دور کیرلا جیسی ناموافق فضا میں بھی اگر اردو زبان کی نشو و نما ہوئی ہے اور اردو زبان نے ترقی کے منازل طے کیے ہیں تو اس میں مالابار میں واقع اس تاریخی کالج کا بھی ایک اہم کردار رہا ہے۔ یہ کالج گذشتہ دو صدیوں سے اس علاقے میں اردو کا مرکز رہا ہے۔

کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج، مدراس کا سینٹ جارج (St. George College) اور لری کا برنن کالج بحر عرب کے ساحلی علاقوں میں واقع ہیں اور تینوں کالج انگریزوں نے خاص کر اپنے لوگوں کو اردو زبان سکھانے کی غرض سے قائم کیے تھے۔

فورٹ ولیم کالج اور سینٹ جارج کالج سے اردو سیکھنے میں انگریزوں کو بڑی آسانیاں ہو گئی تھیں۔ ملیالم چونکہ ایک دراوڑی زبان ہے، اس لیے اس کو سیکھنے میں ان کو دشواری محسوس ہوتی تھی۔ کیرلا میں ایک اردو زبان مسلمانوں میں رائج تھی جس کو عربی ملیالم کا نام دیا گیا تھا۔ یہ دراصل ملیالم کو عربی رسم الخط دینے کی ایک کوشش تھی جس کو سمجھنا اردو بولنے والے دکنیوں کے لیے بھی دشوار تھا۔ دکنی لوگ انگریزوں کے حامی مانے جاتے تھے اور مقامی مسلمان جن کی زبان ملیالم تھی، انگریزوں کے باغی خیال کیے جاتے تھے۔ ان مسلمانوں کو ماپلا کہا جاتا ہے۔

اڈورڈ برنن (Edwerd Brennen) نامی ایک انگریز جو جہاز میں افسر تھا، تلیچری کے قریب سے بحر عرب سے گزر رہا تھا۔ اچانک دریا میں طغیانی آگئی اور جہاز غرقاب ہونے لگا۔ ایڈورڈ برنن کسی طرح کشتی کے ایک تختے کے سہارے تلیچری کے ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور یہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ اس نے پورٹ آفس میں افسری کی نوکری حاصل کر لی۔ اس طرح اپنے قیام کے دوران تلیچری کے سیاسی، سماجی و تعلیمی حالات کو قریب سے دیکھنے کا اس کو موقع ملا۔ اس نے اونچ نیچ، چھوت چھات اور ذات پات جیسی سماجی برائیوں اور نئے تعلیمی نظام سے تنفر کے پیش نظر یہاں ایک ایسا اسکول شروع کرنے کا ارادہ کیا جس میں بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل ہر طبقے کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں۔ رفتہ رفتہ اس نئے طریقہ تعلیم نے عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی اور شائقین علم کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ عیسائیوں کی زبان کی حیثیت سے معروف انگریزی کو بھی لوگ شوق سے سیکھنے لگے۔

برنن صاحب کا قائم کردہ تعلیمی ادارہ تیز رفتاری سے ترقی کے منازل طے کرتا ہوا، اسکول سے کالج بن گیا۔ انھوں نے یکم ستمبر 1862 میں ایک کرائے کی عمارت میں اسکول کی شروعات کی۔ آغاز میں باسل مشن ہائی اسکول (Basel Mission High School) اور بی جی ایم (BGM) انگریزی اسکول کے اشتراک سے تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ 1883 میں برنن اسکول اور مڈل اسکول (Middle School) 1884 میں ہائی اسکول ہو گیا۔ 1890 میں انٹرمیڈیٹ ایف اے (FA) کا آغاز کر دیا گیا۔ یکم جون 1919 میں اس تعلیمی ادارے کی کارکردگی اور ترقی کے پیش نظر انگریز سرکار نے اس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ 1890 میں کالج کے لیے نیا ہال تیار کیا گیا۔ 1925 میں اسکول میں معلم بننے کے خواہاں افراد کے لیے ٹریننگ اسکول (Training School) شروع ہوا۔ جون 1987 میں مدارس (واضح رہے کہ اس وقت کیرلا کا یہ خطہ مدراس پریسیڈنسی کے تحت آتا تھا) کے پبلک انسٹرکشن ڈائرکٹر (Public instruction Director) آر ایم اسٹاتھم (R.M Statham) نے اسکول کا دورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا مڈل اسکول کو بند کر کے کالج شروع کیا جائے اور ہائی اسکول ایک کرائے کی عمارت میں برقرار رکھا جائے۔

1945 میں تلیچری میونسپل کونسل Muniscipal council) کے چیئرمین موصاحب نے برنن کالج کو فرسٹ گریڈ کالج کی حیثیت سے ترقی دینے کی غرض سے ایک درخواست کا مسودہ تیار کیا تو کونسل کے تمام ممبران نے ان کی تائید و حمایت کی۔ ان کی درخواست شعبہ تعلیم کے افسر کے پاس مدراس بھیجی گئی، جسے منظوری مل گئی اور اس طرح 1945 میں کالج کو اسکول سے بالکل علاحدہ کر دیا گیا اور اسی سال اردو بی اے (BA) ڈگری کی تعلیم بھی شروع کر دی گئی۔

قابل ذکر ہے کہ اول دن، جب سے اس ادارے کی داغ بیل اسکول کی حیثیت سے ڈالی گئی، یہاں اردو زبان کی تعلیم بھی شروع ہو گئی تھی۔ 1926 میں مدراس پریسیڈنسی کے پبلک انسٹرکشن کے ڈائرکٹر (Director Public Istruction) اور ایم ستیا تھی، مالابار ڈویژنل انسپکٹر آف اسکول (Malabar Divisional Inspector of School) راؤ بہادر اور منسٹر فار ڈیولپمنٹ (Minister for Developement) ایم سی راجا اور گریپا (Griappa) کے ہمراہ برنن کالج کے دورے پر آئے تو

انھوں نے پری ڈگری کی سطح تک ثانوی حیثیت سے اردو کی تعلیم کی حمایت کی۔ اس طرح پہلی بار کالج کی سطح پر اردو کی تعلیم کا راستہ ہموار ہوا۔

جی ایم پی اسکول کے طرز پر ابتدا ہی سے برنن کالج میں اردو کی تعلیم کا نظم رہا ہے۔ کالج سے پہلے اس شعبے کو اورینٹل لینگویج (Oriental Language) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا جس میں انگریز اور دکنی لوگ ملازمت کرتے تھے۔ اسکولی سطح پر اردو کے استاد کو اردو انسٹرکٹر (Urdu instrueter) کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ بعد میں مقامی لوگ بھی اردو زبان سکھانے لگے۔

مقامی لوگوں میں عثمان سیدھی (1928) عمر سیدھی (1930-36) صاحبان شامل ہیں جنھوں نے گلیمس صاحب کا اردو، انگریزی لغت تیار کی۔ موئی دو۔ سیدھی (Moidu Seethi) وغیرہ اردو سکھانے والوں میں شامل ہیں۔

1945 میں فرسٹ گریڈ کالج کا درجہ دینے کے ساتھ ہی، ڈگری کی سطح پر تعلیم پانے والے طلبہ کو ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو زبان سیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں ہندی زبان داخل نصاب نہیں تھی۔ ہندی کا داخلہ 1949 میں ہوا تھا۔

جن اساتذہ نے وقتاً فوقتاً اس کالج میں اردو زبان کی تدریس کا فریضہ انجام دیا ان میں محبوب پاشا محبوب مدراس (1944-46)، ذی ایس محمد اسماعیل، مدراس (1945-47)، پی ذی عبدالرحمن منشی فاضل (1947-50)، سید عباس میاں (1957)، یوسف کوکن (1951-53)، پروفیسر محمد حسین شاکر مدراس (1951-78)، میر احمد علی حیدرآباد (1969-99) کے نام شامل ہیں۔

برنن کالج میں ثانوی حیثیت سے اردو سیکھنے والوں کی تعداد اردو بی اے (Main) پڑھنے والوں سے زیادہ رہی ہے۔ یونیورسٹی نے بی اے ڈگری میں 24 طلبہ کو داخلہ کی منظوری دی۔ شروع شروع میں داخلے کے خواہش مند طلبہ کی تعداد میں کمی محسوس ہوتی تھی لیکن اب صورت حال میں خوشگوار تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اب داخلہ کے خواہش مند طلبہ کی تعداد مقررہ تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

انگریزوں نے عہدے داروں، منصفوں اور حاکموں کو اردو سکھانے کی غرض سے شعبہ اردو کا آغاز کیا تو اس کا اثر مقامی لوگوں پر پڑا۔ کیونکہ اردو سند یافتہ حضرات کو جب ملازمتیں ملنے لگیں تو غیر مسلم بھی اردو کی طرف راغب ہونے لگے۔ حالانکہ وہ اس وقت تک اردو کو مذہبی زبان سمجھ کر اس کو اپنانے میں تامل کرتے تھے۔ 1970-71 میں دو غیر مسلم طلبا روی پی (Ravi.P) اور اموپی (Ammu.P) نے اردو میں داخلہ لیا۔ آگے چل کر دونوں اردو استاد بنے۔ روی کو لوگ اردو روی کے نام سے پکارنے لگے۔ 1976-77 میں پریمن۔ سی (Preman.C) اور 1977-78 میں نکولن کے وی (Nakulan. K.V) نے اردو میں ڈگری حاصل کی۔ پریمن ہائی اسکول میں اردو کے استاد بنے اور سبکدوش ہو کر وظیفہ یاب ہوئے۔ نکولن یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کر رہے ہیں۔ ان اساتذہ سے مہمیز پا کر سیکڑوں کی تعداد میں غیر مسلموں نے اردو میں سند حاصل کر کے اسکولوں اور کالجوں میں ملازمت حاصل کی۔

جب کیرالہ کے کالجوں میں اردو پڑھانے کے لیے اساتذہ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تو دوسری ریاستوں سے اساتذہ کو منگوانا پڑا۔ لیکن بیرونی ریاستوں کے اساتذہ کو ناموافق ماحول کی وجہ سے یہاں دشواری محسوس ہوئی تو خود برنن کالج کے بعض طلبا نے اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے اعلیٰ تعلیم کے لیے میسور یونیورسٹی کا رخ کیا اور میسور یونیورسٹی سے اردو

گورنمنٹ برنن کالج اٹھارہویں صدی سے ہی اردو کی نشو و نما اور فروغ میں مصروف ہے۔ جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اردو زبان میں اپنی قابلیت بڑھائی اور ڈگریاں حاصل کر کے اسکول اور کالج میں ملازمتیں حاصل کیں۔ اس طرح اردو کی خوشبو پوری ریاست میں پھیلنے لگی۔ کیرل میں اردو بنام ہندی فلموں کی آمد اور مقبولیت نے بھی یہاں کے منظر نامے کو کافی متاثر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس ریاست میں عربی، سنسکرت اور ہندی زبانوں کی تعلیم کے رواج پانے سے پہلے ہی سے یہاں اسکولوں میں اردو کو مقبولیت عام کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔

میں ایم۔ اے کی سند حاصل کر کے اپنی ریاست میں یونیورسٹی اساتذہ کی حیثیت سے اردو کی خدمات انجام دیں۔ ان طلبا میں صفیہ بی، ایم حسن (حسنو) اور محمد قاسم شامل ہیں۔

گورنمنٹ برنن کالج اٹھارہویں صدی سے ہی اردو کی نشو و نما اور فروغ میں مصروف ہے۔ جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اردو زبان میں اپنی قابلیت بڑھائی اور ڈگریاں حاصل کر کے اسکول اور کالج میں ملازمتیں حاصل کیں۔ اس طرح اردو کی خوشبو پوری ریاست میں پھیلنے لگی۔ کیرل میں اردو بنام ہندی فلموں کی آمد اور مقبولیت نے بھی یہاں کے منظر نامے کو کافی متاثر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس ریاست میں عربی، سنسکرت اور ہندی زبانوں کی تعلیم کے رواج پانے سے پہلے ہی سے یہاں اسکولوں میں اردو کو مقبولیت عام کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ سو سال قبل ہی صرف تلچری میں ٹاؤن اپر پرائمری اسکول (Town U P School)، بی ای پی اسکول، سنٹ جوزف اسکول اور زنانہ اسکول میں اردو زبان کی تعلیم ہوتی تھی۔ ان اسکولوں سے تعلیم مکمل کرنے والے طلبا برنن کالج میں داخلہ لیتے رہے ہیں۔

گورنمنٹ برنن کالج کے تعلیمی مقاصد اور آپسی تبادلے کی (Own Exchanges) کی غرض سے ملک کے 35 تعلیمی مراکز سے تعلقات قائم تھے۔ یہ وہ مراکز تھے جہاں اردو زبان کی تعلیم ہوتی تھی۔ ان اداروں میں بی ایم پی اسکول تلچری، کوچین HEH مدراس، نظامس کالج، حیدرآباد، سنٹ جارج کالج، مدراس، نوراس کالج ویلور (Vellor) وغیرہ شامل ہیں۔

1971 میں پہلی بار گورنمنٹ برنن کالج کی تاریخ میں سالانہ کالج میگزین میں تین زبانوں (اردو، ملیالم، انگریزی) میں شعری ونثری مضامین اور تخلیقات شامل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ قبل ازیں صرف ملیالم اور انگریزی زبانوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں کیرلا میں اردو خوش نویسی کی سہولت میسر نہیں تھی، جس کی وجہ سے اس کام کے لیے بنگلور جانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی اردو حصہ کی تکمیل میں تاخیر کی وجہ سے میگزین کی اشاعت میں تاخیر بھی ہو جاتی تھی۔

جب پنجاب کے ڈاکٹر کرم چند صاحب کالج کے پرنسپل بنے تو اردو کے شعبے کو کافی ترقی ملی۔ انھوں نے شعبہ اردو کے لیے بہت ساری کتابیں منگوائیں اور رسالے جاری کروائے۔ وہ خود بھی اردو کلاس لیتے تھے۔ وہ 'یار جنگ' منگواتے تھے۔ اس سے چند کہانیاں انھوں نے ملیالم میں ترجمہ بھی کی تھیں۔ انھوں نے گلیمس صاحب کا اردو ڈراما اسٹیج کرایا اور شام غزل منعقد کرنے کی اجازت دی۔

7 اکتوبر 1978 کو یو جی سی (UGC) کی طرف سے بیسک گرانٹ (Basic Grant) کے ذریعے پانچ لاکھ روپے ملے تو انھوں نے اس سے شعبہ کی لائبریری کو بہت ساری کتابیں فراہم کرائیں۔ کالج میں کل کتابوں کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ ہے جس میں اردو کی کتابیں تین ہزار سے زائد ہیں۔ ہندی، ملیالم اور انگریزی کے مقابلے اردو کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ پرانی اور بوسیدہ کتابوں کی حفاظت کا بھی معقول انتظام پایا جاتا ہے۔

گورنمنٹ برنن کالج سے تعلیم مکمل کرنے والے طلبا نے شعبہ اردو سے اپنے روابط کو قائم رکھنے کے لیے برنن کالج اردو لورس (BUL) کے نام سے قارئین کی انجمن بھی تشکیل دی ہے۔ یہ انجمن 'بل بل' کے نام سے معروف ہے۔ سیکڑوں طلبا اس انجمن کے رکن ہیں۔ ہر سال انجمن کی

طرف سے کوئی نہ کوئی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔

بل بل کے علاوہ پہلی بار 1957 میں جب کالج طلبہ یونین کے چناؤ کی شروعات ہوئی تو اردو ایسوسی ایشن کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔ اس ایسوسی ایشن کے پہلے سکریٹری جناب ای احمد (سابق مرکزی وزیر) بنے۔ ہر سال ایسوسی ایشن کی طرف سے کوئی نہ کوئی پروگرام منعقد ہوتا ہے جس میں عام اردو دانوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

جب بھی کوئی بڑی سیاسی یا ادبی شخصیت اردو علاقوں سے بطور مہمان تلچری تشریف لاتی تو یہاں کے اردو اداروں کو ان کی سیر کرائی جاتی۔ یہاں کا اردو حلقہ ان مہمانوں کا خاص خیال رکھتا اور ان کی عزت افزائی کرتا۔ کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ طلبا و اساتذہ ایسے مہمانوں کی آمد کے منتظر رہتے اور ان سے استفادہ کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ شعبۂ اردو میں جن نمایاں شخصیات نے قدم رنجہ فرمایا ان میں نواب زادہ لیاقت علی خان، ابراہیم سلیمان سیٹھ، حاجی عبدالستار سیٹھ، مولانا محمد علی، سیماب اکبرآبادی، ابوبکر حسین کملوی بنگلوری، مولانا ظفر علی خان، بہادر شرف الدین، اے کے قادر کٹی (MLA)، قادر محمد تیتار بہادر (Dist Session Judge Talassery) کے ایم سیدمحی الدین صاحب وغیرہ شامل ہیں۔

برنن کالج میں اردو کی تدریس سے وابستہ

چند شخصیات

محبوب پاشا محبوب

جون 1915 میں مدراس کے نواب آرکاٹ کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ 1944 میں مدراس محمڈن کالج سے برنن کالج تلچری ان کا تبادلہ ہوگیا۔ 1946 تک تلچری میں مقیم رہ کر اردو لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اچھے شاعر تھے اور محبوب تخلص کرتے تھے۔ قیام تلچری کے دوران یہاں کے مقامی شعرا اختر، تاج، صابر اور عائشہ سے ان کے خوشگوار مراسم تھے۔ انھوں نے شعبۂ اردو میں مشاعرے منعقد کیے اور عائشہ بائی کو سامعین کے سامنے آکر اپنا کلام پیش کرنے پر آمادہ کیا جبکہ عورتوں بالخصوص میمن برادری کی عورتوں کا اس طرح سامنے آنا معیوب تھا۔ عاشورہ کے دن انھوں نے تابوت گلی میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔ برنن کالج کی ملازمت کے دوران، انھوں نے بہت ساری غزلیں اور نظمیں کہی تھیں۔ ان کا کلام 'متاع محبوب' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ برنن کالج میں محبوب نے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

یوسف علی کوکن:

مدراس میں پیدا ہوئے۔ 1944 میں مدراس محمڈن کالج میں ملازمت شروع کی۔ 1946 میں برنن کالج تلچری ان کا تبادلہ ہوگیا۔ اپریل 1948 میں مولانا محمد حسین کے ریٹائر ہونے کے بعد دوبارہ مدراس یونیورسٹی واپس آگئے۔ کوکن صاحب ادیب، مفکر شاعر اور عالم تھے۔ انھوں نے کل 35 کتابیں مختلف موضوعات پر عربی، فارسی اور اردو میں لکھیں۔

کوکن صاحب نے بعض کتابیں قیام تلچری کے دوران لکھیں۔ انھوں نے برنن کالج کے طلبا کے لیے نظام حیدرآباد کی طرف سے اسکالرشپ کے لیے کوششیں بھی کیں۔ انھوں نے نواب زادہ لیاقت علی خاں اور ابوالکلام آزاد کی تلچری آمد کے موقعے پر ان کی اردو تقریروں کا ملیالم میں ترجمہ بھی کیا۔ تلچری سے مدراس واپسی کے بعد عرصے تک ان کا رابطہ یہاں سے قائم رہا۔ وہ کالی کٹ یونیورسٹی میں

بل بل کے علاوہ پہلی بار 1957 میں جب کالج طلبہ یونین کے چناؤ کی شروعات ہوئی تو اردو ایسوسی ایشن کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔ اس ایسوسی ایشن کے پہلے سکریٹری جناب ای احمد (سابق مرکزی وزیر) بنے۔ ہر سال ایسوسی ایشن کی طرف سے کوئی نہ کوئی پروگرام منعقد ہوتا ہے جس میں عام اردو دانوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ جب کبھی کوئی بڑی سیاسی یا ادبی شخصیت اردو علاقوں سے بطور مہمان تلچری تشریف لاتی تو یہاں کے اردو اداروں کو ان کی سیر کرائی جاتی۔ یہاں کا اردو حلقہ ان مہمانوں کا خاص خیال رکھتا اور ان کی عزت افزائی کرتا۔ کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ طلبا و اساتذہ ایسے مہمانوں کی آمد کے منتظر رہتے اور ان سے استفادہ کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

عربی، اردو اور فارسی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر اور چیئرمین رہے۔ اکتوبر 1966 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

پروفیسر محمد محسن شاکر

پروفیسر محمد محسن شاکر مدراس کے قریب مینامبور (Meenambur) میں 1922 میں پیدا ہوئے۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد سے انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد انھوں نے مدراس یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ شاکر صاحب کو 1951 میں برنن کالج میں اردو لکچرر کی ملازمت ملی اور ستائیس (27) سال کے طویل عرصے تک تلچری میں مقیم رہ کر اردو کی زلف پریشاں کو سنوارنے میں ہمہ تن مصروف رہے۔ انھوں نے KM سیدمحی صاحب کے ذریعے سی ایچ۔ محمد کویا (وزیر تعلیم) سے اردو طلبا کے لیے دو فیصد 2% ریزرویشن کا حکم نامہ جاری کروانے کی کامیاب کوشش کی۔ اسی طرح مسلم لیگ کے رہنماؤں (سلیمان سیٹھ، اپنی صاحب، قادر کٹی AK(MAL) سے خوشگوار تعلقات کی بنا پر کالی کٹ یونیورسٹی میں ادیب فاضل، اور ایڈوانسڈ (Lower & higher) کورس متعارف کرانے میں کامیاب رہے۔ شاکر صاحب کی سب سے بڑی خدمت بی اے ڈگری کو روبہ عمل لانے کی ان کی انتھک جدوجہد تھی۔ چنانچہ جب ای احمد صاحب نے مسلم لیگ کے قائدین اور تلچری کے MLA وی آر کرشن ایر کے ذریعے کوشش کا آغاز کیا اور انجمن اصلاح المسلمان نے آل کیرلا اردو کنونشن کی تیاریاں شروع کیں ان کو سووینیر کا چیف ایڈیٹر بنایا گیا۔ انھوں نے روزنامہ چندریکا اور چندریکا ویکلی میں کئی بار اردو زبان کو متعارف کرانے کی غرض سے مضامین لکھے اور غالب، حالی اور آزاد کے کلام کا ملیالم میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اقبال کی مشہور نظمیں 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' اور بال جبریل کی دوسری نظموں کا ملیالم میں ترجمہ کیا۔

جب کالی کٹ یونیورسٹی میں اردو و فارسی کے لیے بورڈ آف اسٹڈیز کی تشکیل عمل میں آئی تو شاکر صاحب نے مولانا میر محمد حسین، یوسف سرمست، یوسف کوکن جیسے نامور ادیبوں کو اس کا ممبر بنوایا جس کی وجہ سے ایک عمدہ نصاب ترتیب دیا جاسکا۔ شاکر صاحب برنن کالج میں ایم اے اردو کے لیے بھی کوششیں کرتے رہے لیکن شعبۂ اردو میں سہولیات کی کمی کی بنا پر ان کی کوشش بارآور نہ ہوسکی۔ لہٰذا انھوں نے 1968-69 اور 1969-70 میں اپنے چند طلبا کو اردو میں ایم اے کے حصول کی غرض سے میسور یونیورسٹی کا رخ کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سینکڑوں طلبا نے میسور یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور واپس آکر اپنے وطن میں اردو کی تدریس کی ذمے داریاں بحسن و خوبی انجام دیں۔

میر احمد علی

حیدرآباد سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے 1969 میں شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ شاعری بھی کرتے تھے اور خورشید تخلص کرتے تھے۔ اس زمانے کے مختلف اردو رسالوں میں ان کی نظمیں اور غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ اس کالج کے طلبا سے وہ بے انتہا محبت کرتے تھے۔ کمزور طلبہ کو امتحان میں کامیاب کرانے کے لیے ان کی دست گیری کرتے تھے۔ جب داخلے کے خواہش مند طلبا کی تعداد مطلوبہ تعداد سے زیادہ ہوتی تو وہ خلاف ضابطہ کے ذریعہ اہل طلبا کا انتخاب کرتے۔ وہ 1999 میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

■

Dr. R.I. Riyaz Ahmad., Tharif Kayyath Road, Tellicherry - 670101 (Kerala)

وحید الظفر خان

فلسفۂ وجودیت کے اساسی محرکات

فلسفۂ وجودیت نہ تصور ہے اور نہ تخیل، دراصل یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسان کے شعوری تجسس کے بطن سے پیدا ہوا ہے کیونکہ اس کائنات کے منظم دروبست کے ساتھ انسانی زندگی کی ابتدا اور انتہا ایک راز سربستہ کی طرح ہے۔ روز آفرینش سے اس کائنات کا منظر نامہ اپنی جگہ ساکت نظر آتا ہے۔ وہی چاند وہی آسمان، وہی سورج وہی ستارے، وہی موسموں کا تغیر وہی ہواؤں کا پس منظر۔ اس روئے زمین پر صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح اس سطح زمین پر ابھرتی ہے، بڑھتی ہے، پھیلتی ہے سکڑتی ہے اور پھر ناپید ہوجاتی ہے۔ ایک تسلسل بود وعدم کا ڈرامہ سطح زمین پر جاری ہے۔ صرف انسان اس کائنات کے وسیع ترین منظر نامہ میں ایک ایسی ذی روح ہستی ہے جس کے پاس تحیر و تجسس کا ایک پیچیدہ ترین ذہنی نظام موجود ہے جس میں تفکر و تفہم کی ایسی بنیادی صلاحیتیں پیوست ہیں جو کائنات کے آفاقی وجود اور زمین کے جسمانی وجود کے بارے میں واقفیت کی تلاش میں مضطرب رہتی ہیں۔ (To know the unknown) حصول علم کی تشنگی اس کی فطرت اولیٰ ہے۔ کائنات کیا ہے؟ انسان کیا ہے کیوں ہے؟ دونوں کے وجود کا ربط کیا ہے؟ مقصد کیا ہے؟ اور اس عظیم ترین تخلیق کا خالق کون ہے؟ انسانی شعور کی بیداری کے یہ سوالات آج تک اسی طرح موجود ہیں۔ صدیوں سے ایسے سوالات کے جوابات انسانی استعداد کے مطابق وجود میں آتے رہے ہیں جن کی ایک بسیط تاریخ مرتب ہوچکی ہے لیکن اطمینان بخش واقفیت کی تلاش ابھی تک جاری ہے۔ انسان کی دانشوری اور ذکاوت نے مختلف ادوار میں مختلف نظریات کو جنم دیا ہے۔ دلائل و براہین کے رد و قبول کا لامتناہی سلسلہ انسانی تاریخ میں محفوظ ہونے کے باوجود ہنوز راز سربستہ ہے۔ عدم سے وجود اور وجود سے عدم کی داستان انسانی ذہن کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے۔

''ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات''

خدا، انسان، کائنات، مکاں، لامکاں اور وقت کے بحر بیکراں میں ابھرتی، ڈوبتی زندگی کا باہمی ربط، ایسے پیچیدہ سوالات ہیں جو شاید ہمیشہ انسانی ذہن کے لیے سوالات ہی رہیں گے۔ کیونکہ آفاقی اسرار کا بیکراں علم، انسانی فہم و ذکا اور عقل و دانش کے محدود دائرے میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن انسانی فطرت میں سمویا ہوا اضطراب سب کچھ جان لینے کا تقاضا کرتا ہے۔ مسلسل سفر عدم واقفیت سے واقفیت کا، تاریکی سے روشنی کا، لاعلمی سے علم کا، ضلالت سے نور کا انسانی وجود کے رواں دواں رہنے کا بین ثبوت ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسئلہ وجودیت انسانی ذہن میں پیوست کرنے کے بعد انسان کی تخلیق کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ وقت اور مقام کی پابندیوں سے آزاد ہے جو صدیوں اور قرنوں کی بسیط وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ انسانی شعور کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا ہے اور عالمی جنگ کے بعد کے منظر نامہ میں یہ مسئلہ ایک تحریک بن کر ابھرا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے انسانی ذہن کو ایک انتہائی خوفناک پس منظر سے روشناس کرایا جس نے انسانی وجود کی لایعنیت اور خدائی تصور کی اہمیت کو از سر نو پرکھنے اور نظر ثانی (Review) کرنے پر اصرار کیا۔ حالانکہ اس سے کہیں پہلے یہ مسئلہ وجودیت، یونانی مفکرین کے یہاں بھی زیر بحث رہا ہے جس کا مرکز اس ہستی کی تلاش رہا ہے جو اس کائنات کی تخلیق کا سبب ہے۔ مثال کے طور پر Thales کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر شے کی تخلیق کا ماخذ ایک آفاقی اصول ہے۔ ہر چیز پانی ہے اور پانی سے ہر چیز پیدا ہوئی ہے۔ گویا بنیادی عنصر جس سے ہر شے وجود پذیر ہوئی ہے وہ صرف پانی ہے اور تمام مظاہر موجودات کا سبب یا قوت تخلیق پانی ہے۔ اس نظریہ کا مکمل اعتراف قرآن میں بھی بالصراحت موجود ہے۔ سورۂ الانبیا ((30-21) اس کے بعد Anaximander کا اس مسئلے پر یہ خیال تھا کہ کوئی لامحدود پُر اسرار شے ہی وہ ہستی ہے جس میں مختلف النوع عناصر ابھرتے اور ڈوبتے ہیں۔ وجود وعدم اور فنا وبقا کا بنیادی سبب صرف ایک ہی اور ایک ہی وجود ہے۔

اس کے شاگرد Anaximenes کی سوچ کے مطابق اس کائنات کی تخلیق کا بنیادی سبب 'ہوا' ہے۔ اس عالم اشیا میں کمی بیشی اور تبدیلی کا اصول ہوا کے دباؤ اور پھیلاؤ میں پوشیدہ ہے۔

Parmanides ایک دوسرے فلسفی کی تھیوری یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا سبب ایک ایسی ہستی ہے جو اپنے آپ میں مکمل ہے دائروی ہے اور جامد ہے۔ نہ اس سے پہلے کچھ ہے اور نہ ہی اس سے کچھ ماورا ہے۔ Pythagoras کا خیال ہے کہ وہ ہستی لامحدود ہے اور جو لامحدود ہے وہی حقیقت ہے۔ وہی لامحدود ہستی متضاد اشیا میں مختلف محدود شکلوں میں جلوہ گر ہے۔

اس مسئلے میں افلاطون کا نظریہ ہے کہ مظاہر موجودات انسانی تخیل کی انتہائی اعلیٰ اشکال ہیں جو مادے کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ دراصل یہ مظاہر ہی اس ہستی کے حقیقی علم کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن ارسطو افلاطون کی تھیوری سے متفق نہیں تھا اس کی دلیل تھی کہ تخیل کی بنیاد پر کسی ایسی ہستی کے وجود کو منطقی طور پر نہیں سمجھا جاسکتا جس کا زندہ ثبوت مظاہر فطرت ہوں۔ اور بالخصوص ایک ایسا زندہ متحرک انسان جو غیر معمولی صفات کا حامل ہو۔ اس کی دلیل ہے کہ صفت کا وجود موصوف کے بغیر ناممکن ہے۔

Aquinas کا دعویٰ ہے کہ:

''خدا کے ذہن میں تمام شکلیں اپنے وجود کی ساخت کے ساتھ ایک تصور کی طرح ہر وقت موجود رہتی ہیں وہ جب چاہتا ہے اُن کو وجود بخش سکتا ہے''۔

یہ نظریہ قرآنی نص 'کُن فیکون' کا حقیقی پرتو معلوم ہوتا ہے۔ ڈیکارٹ (Decartes) اُس دور کا مفکر ہے جب انسانی ذہن تصور و تخیل کی وادیوں سے نکل کر عقلی و منطقی دنیا میں داخل ہوچکا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ Mind اور Matter دونوں متضاد چیزیں ہیں لیکن دونوں کو بذریعہ عقل کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اسپنوزا (Spinoza) Mind اور Matter کو ایک

ہی وجود کے وہ پہلو تسلیم کرتا ہے۔ لائبنیز (Leibniz) کی فلاسفی کے مطابق یہی وجود روحانی طاقت کا وہ مرکز ہے جو انسانی شعور کی رہنمائی کرتا ہے۔ John Locke کا خیال ہے کہ انسان حواس خمسہ کے ذریعے علم تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے لیے کسی وجدانی یا بطونی تصورات کی حاجت نہیں۔ برکلے کا انفرادی آئیڈیلزم اور ہیوم (Hume) کی تشکیک سے لبریز فلاسفی منطقی طور پر لاک (Locke) کی اس انقلابی تھیوری سے ماخوذ ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ برکلے (Berkley) کے مطابق مادی وجود انسانی ادراک سے ماورا کوئی وجود نہیں رکھتا۔

ہیوم (Hume) کے بقول انسانی علم کا ماخذ وہ تاثرات (Impressions) ہیں جو اتصال اور انفصال کا طریقۂ کار اپنا کر ذہنی کینوس پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی ذہن اور مادی وجود میں اتصال کا کوئی جواز نہیں سوائے اس کے کہ یہ اتصال صرف عادتاً ہوتا ہے۔ کانٹ (Kant) نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ یہ اتصال انتہائی ضروری ہے کیونکہ انسانی شعور کی ساخت اس اتصال کی متقاضی ہے۔ دونوں فلسفیوں کے نظریات میں غیر معمولی فرق ہے۔ لیکن کانٹ کے نظریے میں ہیوم کی تشکیک آمیز سوچ کا جواب موجود ہے۔ کانٹ کا موقف یہ ہے کہ کوئی بھی وجود بے معنی ہے اگر اس کے بارے میں انسانی ذہن کو واقفیت حاصل نہیں ہے۔ انسانی ذہن کو موجود کا ادراک دیا گیا ہے۔ ایسے خیالات جن میں کوئی واضح اور نمایاں تصور نہ ہو ایک جنگل کی مانند ہیں جہاں سے رہنمائی ممکن نہیں:

Thoughts without concepts are" blind" کسی موجود کی وجودیت کو تسلیم کرنے کے لیے انسانی ادراک اور تجربے کا باہمی اتصال ضروری ہے۔

فختے (Fichte) جو کانٹ کے تابعین میں سے ہے، کا عقیدہ ہے کہ انسان کی خودی یا احساس انا اس حقیقت کبریٰ کا واضح اشاریہ ہے جو افراد کے شعور پر حکمراں ہے جس کا وجود مکمل متحرک اور غیر فانی ہے اور ہمیشہ مائل بارتقا ہے۔

شیلنگ اور فختے (Schelling اور Fichte) اس نظریے میں ہم خیال ہیں کہ وہ حقیقت کبریٰ یا God انسانی شعور کے ذریعے اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ اُن کے نظریے کے مطابق یہ وجود وقت میں ایک گذرگاہ کی مانند ہے جس کی معراج عقل اولیٰ یا ذہن عظیم ہے۔ ہیگل (Hegel) کے فلسفیانہ نظریے کے مطابق ذہانت وذکاوت کا اعلیٰ ترین اصول اس عظیم ہستی کی حقیقت کا جزو لاینفک ہے۔ مثال کے طور پر انسانی سماج اس کے قوانین، رسم و رواج، روایات وحکایات وغیرہ وانسانی فہم وفراست اس کی آرزو اور خواہش کی بین دلیل ہیں۔ انسانی تاریخ کسی ایک فرد کی عقل وفراست کا ریکارڈ نہیں بلکہ ایک انبوہ عظیم کے مسائل ووسائل ضروریات، خواہشات اور مقاصد واسباب کا جائزہ ہے۔

ہیگل (Hegel) کے عقلیت پسندی کے فلسفیانہ نظریے کی بالادستی کو ایک نئے رومانی رجحان نے رد کر دیا۔ شوپنہار، نطشے اور ولیم ڈلتھے (Schopenhaser, Nietzsche, William Dithey) کے بقول قوت ارادی (Will Power) جس کو وہ تخلیقی اصول سمجھتے تھے، کی بنیاد پر عقلیت پسندی کو پس پشت ڈال دیا گیا:

عالم آب و خاک و باد سرعیاں ہے تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں
اقبال

مغربی فکر وقت کی راہداریوں سے گذرتے ہوئے اسی عالم آب وخاک وباد (کائنات) جو سرّ عیاں ہے، کی ماہیت

ہیوم (Hume) کے بقول انسانی علم کا ماخذ وہ تاثرات (Impressions) ہیں جو اتصال اور انفصال کا طریقۂ کار اپنا کر ذہنی کینوس پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی ذہن اور مادی وجود میں اتصال کا کوئی جواز نہیں سوائے اس کے کہ یہ اتصال صرف عادتاً ہوتا ہے۔ کانٹ (Kant) نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ یہ اتصال انتہائی ضروری ہے کیونکہ انسانی شعور کی ساخت اس اتصال کی متقاضی ہے۔ دونوں فلسفیوں کے نظریات میں غیر معمولی فرق ہے۔ لیکن کانٹ کے نظریے میں ہیوم کی تشکیک آمیز سوچ کا جواب موجود ہے۔ کانٹ کا موقف یہ ہے کہ کوئی بھی وجود بے معنی ہے اگر اس کے بارے میں انسانی ذہن کو واقفیت حاصل نہیں ہے۔

وغایت میں سرگرداں رہی ہے۔ اقبال کی فلسفیانہ بصیرت نے وجود مطلق کے وجود کی گواہی دے کر مسئلہ وجودیت کا حل تلاش کر لیا۔ اقبال کا فلسفہ صرف عقل وادراک یا صرف منطقی دلائل تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا وژن، وجدان کی گہرائیوں سے برآمد ہوتا ہے۔ عالم آب وخاک وباد میں اقبال کی فکر رسا نے وہ تمام تخلیقی عناصر تلاش کر لیے جو اس کائنات کو منضبط انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ (نباتات، حیوانات، موسموں کے تغیرات آبی اور فضائی زندگی) یہ رنگ وصوت کی دنیا۔ یہ چشم وگوش کی دنیا سامنے ہوتے ہوئے بھی ایک سرّ عیاں ہے جو سوال بن کر ابھرتی ہے اور لاجواب کر دیتی ہے۔ اقبال کا وژن اسی سرّ عیاں تک محدود نہیں بلکہ اس جہاں کا بھی گواہ ہے جو نظر سے نہاں ہے۔

مغرب کی متحرک فکر، سائنس کی علمی قوت اور عملی رویے (Practical Approach) نے علم کو نئے زاویے عطا کیے۔ علم کی روشنی میں ہی عقل کی آنکھ بیدار ہوتی ہے اور ہر دعویٰ کی دلیل طلب کرتی ہے۔

برگساں کی فکر نے انسانی وجود کو ایک غیر معمولی طاقتور مرتعش رو کا حصہ بتایا جو اس عظیم کائنات میں گردش کناں ہے جس کا نام اس نے Elan Vital (ترنگ) رکھا۔ اس سرعیاں کی تلاش میں برگساں کی تھیوری کو Dynamic / Institutionism کا نام دیا گیا۔

ہسرل (Hussrel) کی فکر نے اس عملی دنیا کو اپنی فکر کا محور بنایا جس کو ہر انسان ہر روز برتتا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ تمام سائنسی علوم اسی دنیا کے بطن سے ابھرتے ہیں اور سائنسی ارتقا کے امکانات اسی دنیا میں موجود ہیں۔

سارتر (Sartre) کا عقیدہ ہے کہ انسانی شعور ایک خود مختار، خود مطلق آزاد قوت ہے جو کسی بھی حالت میں دوسری اشیا سے اتفاقی رشتہ بھی نہیں رکھتی۔ جو دنیا ہمارے تجربے میں ہے اور جس دنیا میں ہم جی رہے ہیں، ہم سے ہمارے تعاون کی متقاضی ہے۔ اس ضمن میں نطشے، سارتر کا ہم خیال نظر آتا ہے کہ اس دنیا کے باہر کسی دنیا کا خیال ایک خیال خام کے سوا اور کچھ نہیں۔

سارتر کے فلسفے نے باضابطہ وجودیت کے فلسفے کو جنم دیا اور انسانی شعور کو مرکز مان کر اسی جیتی جاگتی دنیا میں باہمی تعامل کے ذریعے ربط پیدا کیا۔ جس کا بنیادی محرک انسانی ارادے کو مانا گیا۔ انسان کا باہری دنیا کے ساتھ تعلق انسانی ارادہ بناتا ہے اور انسانی ارادہ کسی مقصد کی اہمیت کسی معنویت کے بغیر پیدا نہیں ہوتا اور اس ارادے کا منبع انسانی شعور ہے چنانچہ انسانی شعور ہی بامقصد ارادے کے تحت باہری دنیا سے تعلق جوڑتا ہے۔ Hussrel کا یہ قول کہ "فلسفہ کے مطالعے کا حقیقی وظیفہ صرف عقلی وذہنی موشگافی یا دانشورانہ ایکسرسائز نہیں بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے تلاش ذات کا"۔ اس لیے اہم ہے کہ اس قول میں ہمیں مسئلہ وجودیت کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر کارل جسپر (Karl Jasper) کا یہ کہنا کہ وجودیت کے فلسفے کے ذریعے انسان اس دنیا میں اپنے لیے ایک مقام کا تعین کرتا ہے۔

انسانی وجود کے شعور وادراک کی نورانی لہروں نے جب باہری دنیا کے وجود سے ارتعاشی لمس محسوس کیا تو فلسفۂ وجودیت نے جنم لیا۔ یہ فلسفہ صرف فلسفے کی عقلی توجیہ تک محدود نہیں رہا بلکہ آہستہ آہستہ انسانی زندگی کے تعامل وتصادم کے تجربے کا ایک وسیلہ بن گیا اور بے فائدہ، بے ذائقہ اور خشک تجریدی دانشورانہ موشگافیوں سے باہر نکل کر فرد، معاشرہ اور کائنات کے سیاق میں اس کی اہمیت تلاش کرنے لگا۔ وجود

کی موجودگی کے اثبات کے لیے تحریک وعمل کو اساس مانا گیا۔ صرف وجود بحیثیت وجود کوئی وجود نہیں رکھتا۔ وجودیت مقصدیت کی متقاضی ہے۔ کسی عقیدے کی فنا وبقا کا انحصار تجریدی تخیلات پر نہ ہو کر ماوی دنیا کے مقصدی اصولوں پر ہونا ضروری ہے۔ اس فلسفہ وجودیت کی زد میں پوری انسانیت کا عروج وزوال ہے۔ کسی غیر مرئی دنیا یا کسی غیر مرئی وجود پر غور وفکر کا اس فلسفے سے سروکار نہیں۔ ہر انسان اپنے مادی وجود کے پیش نظر اپنے عقیدے کی تشکیل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ایسا محسوس کرتا ہو۔ فرد کے وجود کا اثبات دراصل اجتماعی زندگی میں پوشیدہ ہے۔ جو فرد اپنی ذات کو افراد کے اجتماعی مسائل سے بے نیاز رکھتا ہے اور اپنے خوابوں میں جیتا ہے وہ وجودیت کے فلسفے کے تحت فرد کی ذات کا زیاں ہے گویا اس کے وجود اور عدم وجود کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

اپنی ذات میں گم رہنے والا فرد خود کو مسرور بنانے کے لیے بے چین رہتا ہے تا کہ اپنی زندگی کی ناکارگی اور بے معنویت کے احساس کو زائل کر سکے جس سے نجات پانے کا فطری طریقہ کریکیگارڈ نے یہ بتایا ہے کہ وہ فرد اپنی شخصیت کو اجتماعی زندگی کے شب وروز میں مدغم کر دے۔

Keierkkegaard کی فلسفیانہ فکر کے بموجب فرد کی قوت انتخاب، مرکزی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ انتخاب کے طریقہ کار سے گذرتے ہوئے ایک طرح کی Tension ہوتی ہے جو در پردہ خوف کو جنم دیتی ہے۔ کسی بھی مرحلۂ انتخاب میں فرد کی ذاتی پسند اور حصول کی خواہش بھی ہم آمیز ہوتی ہے اور وہ کیفیت (Situation) بھی اسی کے مدنظر ہوتی ہے جس میں انتخاب کیا گیا ہے۔ اس طرح فرد کو اپنی پُرسکون اور محفوظ ترین دنیا کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ ایسے لمحوں میں جب فرد کو کسی انتخاب کی مہم سے گذرنا پڑتا ہے تو وہ کسی سے کوئی رہبری یا کسی طرح کی کوئی رہنمائی طلب نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنی ذات کی اندرونی گہرائیوں میں سفر کرتا ہے تا کہ وہ اپنے انتخاب کی صداقت کو پہچان سکے اور کسی عقیدے کو اپنا سکے۔ خود مختاری کی آزادی ہی دراصل فرد کو اپنے لیے ذمے دار بناتی ہے اور یہ احساس ذمے داری ہی ایک قسم کا خوف پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ ممکنات کی ایسی دنیا میں داخل ہونا چاہتا ہے جو اس کے سامنے کلی طور پر اجنبی اور خطرناک ہو سکتی ہے۔ اپنی ذات کے عرفان کے سلسلے میں اس کو مانوس امکانات سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔

فلسفۂ وجودیت سے متعلق ایک اہم نکتہ وقت اور ابدیت (Time and Eternity) سے متعلق بھی ہے۔ جیسپر اور کریکیگارڈ دونوں مفکرین کے زاویۂ نظر میں وقت اور ابدیت میں غیر معمولی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ Jasper کی فکر کے مطابق وجودیت وقت اور ابدیت کا باہمی اتصال ہے۔ اس کی توجیہ وہ اس طرح کرتا ہے کہ موجودہ وقت جس میں فرد اہم فیصلے کرتا ہے جو اس کی آزادیِ نفس وذات کو یقینی بناتے ہیں یا مستقبل کا وقت جس میں آزادیِ انتخاب کے لامحدود امکانات موجود ہیں۔ اس لیے وجود اپنا ایک ذاتی وقت جس میں اس کا اپنا انفرادی حال و مستقبل ہوتا ہے اور جس کی صداقت کی پرکھ اس قوت فیصلہ پر منحصر ہوتی ہے جو وہ موجودہ لمحوں میں کرتا ہے۔

کریکیگارڈ بھی حقیقت کبریٰ کے وجود کو ابدیت سے جوڑ کر ہی سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کی فکر کے مطابق دراصل یہ ابدیت ہی ہے جو عارضی دنیا کی موجود وجودیت میں داخل ہو کر رونما ہوتی ہے۔ چنانچہ وقت اور ابدیت ہی وہ بنیادی وسائل فراہم کرتی ہیں جس میں وجودیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ نطشے کا تصور بھی اس دنیا کے وجود کے بارے میں عجیب وغریب ہے وہ کہتا ہے کہ یہ دنیا ایک ایسا خاکہ Blank Picture ہے جس میں نہ کوئی تنظیم ہے نہ کوئی اسٹرکچر نہ کوئی معنویت نہ کوئی مقصد۔ صرف انسان جبلی قوت ارادی سے اس پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اس کو ایک شکل وصورت عطا کرتا ہے تا کہ وہ اس کو ایک مفید، محفوظ اور بامقصد کائنات میں تبدیل کر سکے۔ یہ دنیا انسانی توقعات سے پوری طرح بیگانہ اور بے حس ہے۔ وہ آرزوئیں اور خواہشیں جو مذہب نے انسان کو تسلی دینے کے لیے اس دنیا سے وابستہ کر رکھی ہیں یہ دنیا ان سے لاتعلق ہے لیکن اس کے باوجود بھی انسان کو اس دنیا میں غم ومسرت کے تنوع کے ساتھ زندگی کو گلے لگانا چاہیے اور غالباً یہی وہ نکتہ ہے جو اس فلسفیانہ انداز فکر میں رجائیت کی نمو پذیری کرتا ہے۔

مغربی مفکرین کے یہاں وجودیت کا تصور منطقی دلائل کے مفروضات پر مبنی نظر آتا ہے جب کہ اقبال اور ٹیگور کے حیطۂ فکر میں حقیقت کبریٰ کے موجود ہونے پر مکمل ایقان واعتماد موجود ہے جس کا واضح ترین فرق بصیرت کی سطحوں میں ملتا ہے۔ مغرب میں دانش برہانی کا تسلط ہے اس لیے تخمین وظن غالب ہے۔ مشرق میں دانش نورانی کا پرتو ہے جہاں ہر شے ایک ثبوت بن کر اعتماد کی توثیق کرتی ہے۔ انسان، کائنات اور خالق ایک ایسا مثلث ہے جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔

انسانی ذہن کی باطنی قوتوں کا ادراک پوری طرح نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انسان خود بھی ایک راز ہے جس کے بارے میں ہر لمحہ نیا انکشاف ہوتا رہتا ہے تا آنکہ اس وجود کے بارے میں سوچا جا سکے جس نے انسان کو سر کائنات بنا کر تخلیق کیا ہے۔

ٹیگور کا نظریہ ہے کہ ''انسان اپنی ذات کے شعوری ارتقا کے ساتھ اس پر اسرار قوت کے ادراک سے بھی آشنا ہوا جس کا مظاہرہ اس کی ذات کے سماجی ربط سے پیدا ہوا۔ اور یہ ارتباط کسی مقصد یا مفاد پر مبنی نہ تھا بلکہ ایک عظیم صداقت اور زندگی کی بیش قیمت قدروں میں سے ایک قدر تھی۔ انسان نے محسوس کیا کہ باہمی ربط کی یہ ہمہ گیری فطری طور پر ہر فرد سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ سماج میں اپنی ذات کو ضم کر دے۔ اس کی اعلیٰ ترین اہمیت ومعنویت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے حدود سے باہر نکل کر اپنی بہترین آزادی کا اظہار کرے۔''

اس نظریے کی توثیق اقبال کے شعر میں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اس ضمن میں اقبال کی مثنوی 'اسرار خودی' فرد کے وجود کے روحانی، جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی اہمیت ومقصدیت کی انتہائی عارفانہ اور عالمانہ انداز میں وضاحت کرتی ہے اور دوسری مثنوی 'رموز بے خودی' افراد کے باہمی تعامل وتفاعل اور ربط وضبط کی اہمیت کے ساتھ معاشرے کے مہذب طرز حیات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اگر بنظر غائر اقبال کی ان دونوں مثنویوں کا مطالعہ کیا جائے تو انسان کے وجود کے وجوب اور شرف حیات کا ایک منطقی جواز مل سکتا ہے۔

کائنات کے وجود کے متوازی انسانی وجود کی معنویت واہمیت کو پرکھنے کے لیے اقبال نے جو پیمانے تجویز کیے ہیں وہ انسانی وجود کے ہر پہلو کی تصدیق کے لیے ایک طرح کا Litimus Test کا کام کرتے ہیں۔ وجود کی ہستی اور عدم ہستی کی گواہی انسانی ذات کے قلزم فکر سے ابھرتی ہے۔ اس شہادت کے لیے کسی فلسفیانہ بحث وتکرار کی حاجت نہیں بلکہ ذات کے محاسبہ کرنے کا مکمل Mechanism درون ذات ہی فراہم کر دیا گیا ہے جس کو شعور کا نام دیا گیا ہے۔ جہاں زندگی محض سانس کی آمد ورفت سے ہی مراد نہیں بلکہ معنویت کے حصول کے لیے ان تقاضوں سے لبریز ہے جن کے لیے ایک نظام باہمی استوار کیا گیا ہے جس میں تمام مخلوقات ارضی وسماوی ایک لاسلکی رشتے سے منسلک ہیں۔ انسانی وجود کی غایت شعور ذات حق میں مکمل ہوتی ہے۔ جو اس کے جسمانی وجود کو روحانی وجود سے جوڑتی ہے اور Physics سے Metaphysics کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ شعور کی یہی وہ منزل ہے جس کے لیے وجود انسانی کو کائناتی وجود کا جز و لاینفک بنا کر تخلیق کیا گیا ہے۔

■

Waheed Uzzafar Khan (Alig) (W.Z.Khan),
Ex-professor & Head, Masood Mahal Lal Diggi Road, Civil Lines, Aligarh - 202 002

قدوس جاوید

مابعد جدید تنقید: پس منظر و پیش منظر

'مابعد جدیدیت' ادب کا ایک توسیعی تصور ہے۔ ایسا تصور جس کے لاتعداد پہلو ہیں۔ اسی لیے مابعد جدیدیت کی سب کے لیے قابل قبول، کوئی واحد جامع تعریف (Definition) ممکن نہیں، پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ "انفارمیشن ٹکنالوجی اور کنزیومرزم کے زائیدہ گلوبلائزیشن کے سبب مختلف و متضاد جدید ترین علوم کے ارتقا اور سماجی و ثقافتی اور معاشی و تاریخی نشیب و فراز کے زیر اثر عالمی پیمانے پر آج کا انسان جس نئی ثقافتی حالت (Cultural condition) تک پہنچا ہے اس حالت کو مابعد جدیدیت کہتے ہیں۔"

اس مابعد جدید صورت حال میں، جب زندگی اور زمانہ کی حقیقت اور معنی کی تہہ داری اور امکانات کی نئی تعبیر اور تشکیل کرنے والی کوئی تحریر فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ وجود میں آتی ہے تو اسے مابعد جدید ادبی تحریر کہتے ہیں اور ایسی تحریروں پر مشتمل ادب کو مابعد جدید ادب کہا جاتا ہے اور یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ تنقید ہر حال اور ہر شکل میں تخلیقی ادب کی قرأت کا استعارہ ہے۔ اس لیے جب مابعد جدید دور کے مباحث، مسائل، توقعات اور تعصبات کو مرکز میں رکھ کر، نئی فکریات اور علمیات (Epistemology) یعنی تھیوریز کے حوالے سے شعر و ادب کا تجزیہ و محاسبہ کرنے والی تحریر سامنے آتی ہے تو اسے مابعد جدید تنقید کہتے ہیں۔ لیکن معاملہ مابعد جدید تخلیق کا ہو یا تنقید کا، دونوں صورتوں میں زبان، متن، مصنف، موضوع، معنی اور مہابیانیہ (Grand Narration) وغیرہ کے بارے میں مابعد جدید تھیوریز کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن، آپ یاد رکھیں کہ انھیں سمجھنے کے لیے اول تو جدید (Modern) جدت پسندی (Modernity) جدیدیت (Modernism) جدید کاری (Modernisation) اور مابعد جدیدیت (Post Modernism) جیسی ملتی جلتی اصطلاحوں کو ان کے تمام تر تاریخی، سماجی، فلسفیانہ اور ثقافتی تناظرات اور امکانات کے ساتھ سمجھنا پڑے گا اور یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ اٹھارہویں صدی کے روشن خیالی کے فلسفیانہ منصوبہ ارتقا (Enlightenment Philosophical Project of Modernity) انیسویں صدی کی جوابی روشن خیالی (Counter Enlightenment) اور انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی جدیدیت اور اینگلو امریکن اعلیٰ جدیدیت (High Modernism) اور خاص طور پر سوسیئر کے نظریہ لسان، رومن جیکب سن اور چامسکی کے ساختیات (Structuralism) رولاں بارتھ کے تصور معنی (Signification) ژاک دریدا کے رد تشکیل (Deconstruction) اور روسی ہیئت پسندی وغیرہ کا آپس میں افتراق یا مماثلت کا کیا رشتہ ہے اور ان سب کا مابعد جدیدیت کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ ان ساری باتوں کو سمجھے بغیر مابعد جدیدیت، مابعد جدید ادب اور مابعد جدید تنقید کو سمجھنا محال ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس کے لیے ایک عمر چاہیے اور ہمارے طالب علموں کے پاس نہ تو اتنا وقت ہے اور نہ اتنا صبر۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اگر طلبا کم از کم درج ذیل چار موضوعات کا مطالعہ کر لیں تو مابعد جدید ادب اور تنقید کو بڑی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ چار موضوعات ہیں:

1. سوسیئر کا نظریہ لسان
2. مابعد ساختیاتی فلسفہ اور ادبی تھیوری۔ (Post Structural Philosophy And Literary Theory)
3. مابعد جدید جمالیات (Post Modern Aesthetics)
4. مابعد مارکسی سماجیات (Post Marxist Sociologies)

ظاہر ہے کہ یہ چاروں مکاتب فکر انسانی حیات و کائنات اور ادب و فن سے متعلق نئی فکریات اور علمیات کے کم و بیش تمام موضوعات کو اپنے اندر سمیٹنے کے لیے کافی ہیں۔

یہاں شروعات میں ہی یہ جان لینا ضروری ہے کہ مغرب میں (Post Modern) کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے ٹوئن بی نے اپنی کتاب The Study Of History.volume,8 میں 1940 کے آس پاس کیا تھا۔ 1948 میں میکس ویبر (Max Weber) نے انسانی معاشروں میں قدروں کے بڑھتے ہوئے تضادات کی بنیاد پر Neo Kantian Value Spheres اور وٹگنسٹائن (Wittgenstein) کے Language Game کے حوالے سے اپنے مضمون Science As A Vocation میں مابعد جدید ثقافتی صورت حال سے متعلق اپنی تھیوری پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

"Scientific pleading for practical and interested stands,is meaningless in principle because the various value spheres of the world stand in irreconcilable conflict with each other.It is a piece of everyday wisdom that something may be true although it is neither beautiful nor holy or good.These are only the most elementary cases of the struggle between the Gods of the various orders and values."

"اب معاشرے میں ہر طرح کے دلائل اور توضیحات، چاہے وہ سائنسی ہی کیوں نہ ہوں، لایعنی ہیں ان کی کوئی مستقل اور حتمی حیثیت نہیں ہے۔"

میکس ویبر کے چالیس سال بعد فرانسیسی دانشور لیوتار نے 1984 میں جب (The Post Modern Condition) کے عنوان سے اپنی تھیوری پیش کی تو لیوتار نے بھی میکس ویبر کی تھیوری کو ہی تراش خراش کر پیش کیا۔

شروع میں 1960,65 تک پوسٹ ماڈرن کی اصطلاح کا استعمال صرف فن تعمیر (Architecture) کے لیے ہوتا تھا لیکن 1970 کے آس پاس سے مصر کے ایہاب حسن اور لیزلی فیڈلر نے ادب اور خاص طور پر فکشن کے لیے مابعد جدیدیت اور مابعد جدید ادب جیسی اصطلاحات کا استعمال شروع کیا۔ اسی دوران (Daniel Bell) اور خاص طور پر اوونس (Craig Owens) نے اپنے تنقیدی مضامین

کے ذریعے مابعد جدیدیت کو ایک تھیوری کے طور پر قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں اووبیس کے تین مضامین مابعد جدید تنقید کی بنیاد مانے جاتے ہیں۔

1. تانیثیت پسند اور مابعد جدیدیت Femenists: And Post Modernism (1983)

2. مابعد جدید ثقافت (Postmodern Culture)

1981 میں جرگن ہیبر مس (Jurgen Habermas) نے مابعد جدیدیت کو عہد حاضر کی تشخیص قرار دیتے ہوئے لکھا:

It is Diagnosis of our time. Postmodernity definitely presents itself as anti modernity.

اردو میں مابعد جدید تنقید کے خط و خال یوں تو 1990 کے آس پاس نمایاں ہوتے ہیں لیکن 1993 میں گوپی چند نارنگ کی تصنیف 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' کی اشاعت (اور پھر حامدی کاشمیری، وزیر آغا، ضمیر علی بدایونی، اور وہاب اشرفی وغیرہ کی تحریروں) کے بعد مابعد جدیدیت ایک اہم ادبی تصور کے طور پر قبولیت کی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو کل ہند ترقی پسند مصنفین کی بھیمڑی کانفرنس (منعقدہ 1949) کے منشور میں مابعد جدید تصور ادب کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور پھر 1977 میں محمد علی صدیقی نے اپنے مضمون 'ترقی پسند ادب، تحریکات و رجحانات' میں تیسری دنیا کے ادب اور مسائل کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں، گوپی چند نارنگ نے 'نیا اردو افسانہ' کے دیباچے میں ان کی تصدیق ہی کی ہے۔ ویسے بھی ایک زاویے سے مابعد جدیدیت کو جارج لوکاچ، رالف فاکس، میری ایگلٹن اور تودوروف وغیرہ کی نو مارکسیت (NeoMarxism) کی توسیع بھی کہا جاتا ہے۔

دراصل اردو میں تنقید کا عصری منظر نامہ مابعد جدید تھیوری سے عبارت ہے۔ اور اردو میں مابعد جدید تصور ادب جن نظریات و تصورات (Theories) کے راستے سے داخل ہوا وہ یوں تو کئی ہیں مثلاً امیت پسندی، ساختیات، پس ساختیات، تانیثیت، رد تشکیل، قاری اساس تنقیدی تھیوری، معنیت اور بین المتونیت وغیرہ اور اب ان میں حامدی کاشمیری کے نظریہ اکتشاف کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں سب سے اہم تھیوری ساختیات (Structuralism) ہے۔ (میں نے اپنی تازہ ترین کتاب 'متن، معنی اور تھیوری' 2015 میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔)

ساختیات ایک فلسفہ، ایک زاویہ فکر ہے جس کا سرچشمہ سوئس ماہر لسانیات سوسیئر (Ferdinand de Saussure (1857-1913)، روسی نژاد دانشور رومن جیکب سن Roman Jacobson اور فرانسیسی ماہر بشریات لیوی اسٹراس Clavde Levi Strauss (1908-2009) وغیرہ کے نظریات و تصورات ہیں۔

سوسیئر نے اپنے نظریہ لسان میں، رومن جیکب سن نے زبان کی جہات کی تھیوری میں اور لیوی اسٹراس نے بشریاتی ساخت (Anthropological Structure) کے نظریہ میں اشیا، حقائق، زبان اور معنی وغیرہ کے بارے میں جو مختلف فلسفیانہ افکار و تصورات پیش کیے ہیں ان سب کے باہمی اشتراک سے ساختیاتی تھیوری (Theory of Structuralism) وجود میں آئی۔ لیکن اس کے علاوہ ساختیاتی تھیوری کا تعلق نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) اور کوانٹم تھیوری (Quantum Theory) سے بھی ہے جس کے مطابق 'حقیقت' کا تعلق

> **اردو میں مابعد جدید تنقید کے خط وخال یوں تو 1990 کے آس پاس نمایاں ہوتے ہیں لیکن 1993 میں گوپی چند نارنگ کی تصنیف 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' کی اشاعت (اور پھر حامدی کاشمیری، وزیر آغا، ضمیر علی بدایونی، اور وہاب اشرفی وغیرہ کی تحریروں) کے بعد مابعد جدیدیت ایک اہم ادبی تصور کے طور پر قبولیت کی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو کل ہند ترقی پسند مصنفین کی بھیمڑی کانفرنس (منعقدہ 1949) کے منشور میں مابعد جدید تصور ادب کی آہٹ سنائی دیتی ہے**

بصارت سے زیادہ بصیرت سے ہوتا ہے۔ یعنی حقیقت صرف وہی نہیں ہوتی جو ہمیں نظر آتی ہے بلکہ 'حقیقت' وہ ہے جو سامنے کی شے یا اشیا کے اندر موجود حقائق کے ادراک اور شعور کی بنا پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ گویا ساختیات کے مطابق، اصل حقیقت سامنے کی حقیقت نہیں بلکہ اس کے اندر چھپی حقیقت کی اصل حقیقت ہے۔ اسی لیے ساختیاتی تھیوری کے مطابق یہ دنیا صرف طرح طرح کی اور الگ الگ چیزوں کے مجموعے سے عبارت نہیں، بلکہ ہر چیز یا شے کے پیچھے ایک دنیا ہوتی ہے اور زبان ان اشیا کو مستقل اور قطعی نام دینے سے قاصر ہے کیونکہ ہر شے کی اہمیت اور معنویت وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، بدل سکتی ہے۔ اسی لیے سوسیئر نے کہا ہے کہ زبان اشیا کو نام دینے والا نظام (Nomenclature) نہیں ہے۔ بلکہ ساختیاتی تھیوری کے مطابق اشیا یا چیزوں کے نام یا معنی، ان اشیا یا چیزوں کی 'ساخت' (Structure) سے پیدا ہوتے ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں۔ تنقید میں ساختیاتی تھیوری نے ادب کی تفہیم و تعبیر کے نئے دروازے کھولے ہیں جو ہر اعتبار سے منطقی اور سائنٹفک ہیں۔

گوپی چند نارنگ نے بیدی، انتظار حسین اور غالب پر، وزیر آغا نے منٹو پر، حامدی کاشمیری نے شیخ العالم پر اور ضمیر علی بدایونی نے میر و بیدل پر اور بیگ احساس نے قرۃ العین حیدر پر جو مضامین لکھے ہیں وہ ساختیاتی تھیوری کے حوالے سے مابعد جدید تنقید کے عمدہ نمونے ہیں۔ دراصل ساختیاتی تنقیدی تھیوری، زبان و ادب اور انسانی ذہن کی ساخت اور کارکردگی سے بحث کر کے فن پارے کی اہمیت اور معنویت کا جائزہ لیتی ہے۔ ادب کی تفہیم و تعبیر کے اس عمل میں ساختیاتی تنقید زبان کے لسانی برتاؤ، ادبی متن، متن میں معنی کی نوعیت، متن سے اخذ معنی میں قاری کے کردار اور قرأت کے نتائج وغیرہ متعدد پہلوؤں پر غور و فکر کرتی ہے۔ ساختیاتی تنقیدی تھیوری نے ادب کے سابقہ تصورات کے بارے میں کئی سوالیہ نشانات بھی قائم کیے ہیں۔ مثلاً ادب کے بارے میں اب تک عام طور پر تین باتیں کہی جاتی رہی ہیں:

1. ادب زندگی کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے
2. ادب مصنف کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔
3. ادب زندگی کی سچائیوں کا اثبات کرتا ہے۔

ساختیاتی تنقید نے سب سے زیادہ آخر الذکر مفروضے سے بحث کی ہے۔ اسی لیے ساختیات کو ادراک حقیقت کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے اور اس نظریے کی بنیاد سوسیئر کا 'نظریہ لسان' ہے۔ سوسیئر کے مطابق زبان کوئی قائم بالذات (Substantive) چیز نہیں بلکہ نسبتی (Relational) چیز ہے اور لفظ کے معنی صرف وہ نہیں ہوتے جو خارجی طور پر بالائی سطح پر نظر آتے ہیں بلکہ وہ بھی ہوتے ہیں جو لفظ (زبان) کے باطن میں تہہ در تہہ موجود ہوتے ہیں لیکن لفظ یا زبان کے ان داخلی معانی کو قاری ہی اپنی قرأت کے ذریعے موجود بناتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ادب پارے میں ظاہری طور پر جو حقیقت نظر آتی ہے وہ اصل حقیقت نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ اصل حقیقت وہ ہوتی ہے جو فن پارے (شعر، نظم، افسانہ وغیرہ) کے اندر سیال صورت میں موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساختیاتی اعتبار سے مابعد جدید تنقید کسی فن پارے کی تفہیم و تعبیر کے لیے عموماً درج ذیل نکات کو سامنے رکھتی ہے

1. فن پارہ (شعر، نظم، افسانہ) کی تخلیق کن حالات میں کی گئی ہے۔
2. فن پارہ کی تخلیق کی کوئی تجرباتی یا مشاہداتی بنیاد ہے یا نہیں۔
3. فن پارہ سے قاری، متن میں موجود تجربہ، مشاہدہ یا معنی و مفہوم اخذ کر پاتا ہے یا نہیں۔

4. فن پارہ میں جو موضوع، خیال، فکر یا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے اس کے اظہار یا بیان کے لیے کون سا طریقہ کار یا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

5. فن پارے کے لسانی نظام سے قاری کو جذباتی، فکری اور عملی اعتبار سے کس طرح کی تحریک ملتی ہے۔

6. فن پارے میں زبان، زندگی، زمانے کے حوالے سے جس تخلیقی تجربے کی تخم ریزی کی گئی اس سے فن پارے سے کن حقائق، تاثرات یا کیفیات کا اخراج ہوتا ہے

سوسئیر نے (A General Course In Linguistic) میں اپنے فلسفۂ لسان کے ضمن میں زبان کے جس ماڈل کو پیش کیا ہے اس نے ادب میں زبان کے کردار کے بارے میں بحث کے کئی دروازے کھول دیے ہیں۔ سوسئیر کے اس ماڈل کے مطابق زبان میں لفظ معنی رکھتے ہیں اور زبان میں معنی رشتوں کے جامع نظام کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ ساختیات کی لسانی بنیادوں پر بحث کرتے ہوئے سوسئیر کا یہ موقف بیان کیا گیا ہے کہ "زبان تسمیہ یعنی اشیا کو نام دینے والا نظام نہیں ہے بلکہ زبان افتراقات کا نظام (System Of Differences) ہے۔ یعنی معنی اور مطلب کے لحاظ سے زبان میں صرف فرق ہی فرق ہوتا ہے سوسئیر کا مشہور قول ہے

IN LANGUAGE THERE ARE ONLY DIFFERENCES WITHOUT POSITIVE TERMS.

اردو میں مابعد جدید تنقید کے بنیاد گذار پروفیسر نارنگ کے خیال میں:

"ساختیات کے بنیادی اصول سوسئیر کے خیالات پر مبنی فلسفۂ لسان سے ماخوذ ہیں"

زبان کے بارے میں سوسئیر کے خیالات اس قدر انقلاب آفریں تھے کہ لسانیاتی فکر پر ان کا گہرا اثر مرتب ہوا اور آگے چل کر یہ ساختیات اور پس ساختیات کی بنیاد ثابت ہوئے۔ سوسئیر کے تصور لسان کی دو اہم اصطلاحوں لانگ (Langue) اور پارول (Parole) کے مفاہیم پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر نارنگ دونوں کے فرق کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"بقول سوسئیر، لانگ اور پارول میں فرق یہ ہے کہ زبان کا جامع نظام (جو زبان کی کسی بھی فی الواقعہ مثال سے پہلے موجود ہے) لانگ ہے اور تکلم یعنی بولا جانے والا کوئی بھی جملہ واقعہ پارول ہے جو زبان کے جامع نظام کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اور اس کے اندر خلق ہوتا ہے"

ان میں سے لانگ تجریہ سے عبارت ہے اور پارول اس تجربہ یا واقعہ کے بیان سے۔ ان دونوں کا فرق سوسئیر کے فلسفۂ لسان کا کلیدی نکتہ ہے۔ آگے چل کر ان اصطلاحوں کی وضاحت نارنگ نے ان الفاظ میں کی ہے:

"اس حقیقت کے شعور نے کہ زبان ایک مجرد نظام ہے جو کلی حیثیت سے کہیں ایک جگہ نظر نہیں آتا لیکن انفرادی تکلم میں تھوڑا بہت ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ جدید لسانیات کے آئندہ سفر کی راہ کا تعین کردیا"

اپنے فلسفیانہ نکات کی مدد سے سوسئیر اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ لسانی ساختیں بند، خود کفیل اور اپنے قوانین خود طے کرنے والی یعنی خود مختار ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں سوسئیر کا مرکزی خیال جس نے زبان اور حقیقت کے بارے میں سوچنے کے انداز کو ہی بدل دیا یہ ہے کہ "زبان یعنی اصوات یا الفاظ فی نفسہ چیزوں کو ظاہر نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا تصور قائم کرتے ہیں۔ مثلاً لفظ آگ کہنے یا پڑھنے سے ہمارا منھ جلتا یا گرم نہیں ہوتا حالانکہ آگ کے معنی ہی جلانے یا گرمی پہنچانے والی شے کے ہیں۔ سوسئیر کے مطابق ہم کسی لفظ کے معنی کا تصور دوسرے لفظوں کی مدد سے زبان کے اندر رکھتے ہیں یعنی جن اشیا کا زبان ذکر کرتی ہے وہ اصل اشیا Real Object نہیں ہوتیں جو زبان سے باہر وجود رکھتی ہیں۔ بلکہ ان اشیا کا تصور ہوتا ہے جو زبان کے اندر واقع ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ زبان کے نشانیاتی نظام سے ہٹ کر خارج میں ٹھوس دنیا وجود نہیں رکھتی ہے لیکن ہمیں اس کا علم ہوتا ہے یا یہ ہمارے ادراک کا حصہ بنتی ہے۔

مابعد جدید تنقید کی ایک اہم ترین شق یا پہلو بین المتونی تنقید ہے جس کے عناصر تو اکثر و بیشتر مابعد جدید ناقدین کے یہاں ملتے ہیں لیکن تفصیلی بحث حامدی کاشمیری، قاضی افضال حسین اور پروفیسر ظہور الدین کے یہاں ہی ملتی ہے۔ پروفیسر ظہور الدین نے اپنی تصنیف "تنقیدی مباحث و تجزیے" میں شامل ایک مضمون "متن، غیر متن، فن پارہ" میں متن، متنیت اور ادبی فن پارہ کے معنی و مفہوم کی وضاحت علم معانی، ادب میں زبان کے تخلیقی کردار، متن سے اخذ معنی، متن میں معنیاتی تہہ داری اور متن یا فن پارے کی قرأت اور اثر انگیزی وغیرہ کے حوالے سے نہایت عالمانہ انداز میں کی ہے۔

مابعد جدید تنقید متن میں معنی کی تکثیریت پر بہت زور دیتی ہے اس ضمن میں ظہور الدین لکھتے ہیں "متن میں معنیاتی تہہ داری اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک خیال کی ترسیل کے لیے مناسب پیرایہ اختیار نہیں کیا جاتا۔ یعنی خیال کو ایسا پیرایہ عطا کیا جائے کہ ایک خیال ملتے جلتے دوسرے کئی خیالات کو جنم دینے کا کام کرے اور اس طرح ایک خیال جیسے مرکزی خیال بھی کہا جاسکتا ہے، کے گرد خیالات کا جھرمٹ یا ہالہ سا پیدا ہو جائے۔ یہ جھرمٹ یا ہالہ نہ صرف مرکزی خیال کی جمالیاتی تفہیم میں اضافہ کرے بلکہ فکری بلندی یا ارتفاع کا باعث بھی ہو"

(پروفیسر ظہور الدین: تنقیدی مباحث و تجزیے، ص 25،26)

مابعد جدید تنقید کا ایک اہم زاویہ 'تانیثیت' بھی ہے گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، پروفیسر ظہور الدین، شہناز نبی، قاضی افضال حسین، شافع قدوائی، ساجدہ زیدی اور معین الدین جینابڑے سے لے کر الطاف انجم، مشتاق دانی اور رغبت شمیم وغیرہ تک نے تانیثیت کے بارے میں عمدہ تاثراتی اور معلوماتی مقالے لکھے ہیں لیکن برصغیر کی نئی ثقافتی صورت حال کے تناظر میں نتیجہ خیز نئے تنقیدی مطالعات کا سامنے آنا ابھی بھی باقی ہے۔ البتہ تانیثیت کے مختلف و متضاد پہلوؤں کی تقابلی اور موازناتی تنقیدی تحریریں اب سامنے آنے لگی ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ تانیثیت اور تانیثی تنقید کے مرکز میں عورت ہی ہوتی ہے لیکن تانیثی ادب یا تنقید شرطیہ طور پر عورت کا ہی لکھا ہوا ہو یہ تصور غلط ہے۔ تانیثیت ایک طرز فکر ہے جو زندگی کے کسی بھی شعبے میں عورت اور مرد کے بیچ کسی بھی امتیاز کو رد کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تانیثی تنقید وہ تنقید ہے جس میں کسی بھی شعبۂ حیات میں عورت کو مرد کے برابر حقوق دیے جانے کی حمایت، اور اس راہ کی رکاوٹوں کی مخالفت، تنقید کے اصولوں کے مطابق کی جاتی ہے۔ ادھر اکیسویں صدی تک آکر تانیثی تنقید کے تقابلی اور موازناتی مطالعے بھی سامنے آنے لگے ہیں مثلاً:

1. ثقافتی تانیثیت بہ مقابلہ پس ساختیاتی تانیثیت۔

2. صنفی مساوات پر مبنی تانیثیت بہ مقابلہ صنفی امتیازات پر مبنی تانیثیت۔

3. اساسیت پسندی اور تانیثیت۔

4. تانیثیت اور نسلی روایات، مفروضات اور تعصبات

مابعد جدید تنقید کی ماہیت، مقام اور عصری معنویت کی تفہیم کے حوالے سے قاری اساس تنقید، امتزاجی تنقید اور اکتشافی تنقید کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ گوپی چند نارنگ نے قاری اساس تنقید پر 1992 میں ہی کتاب لکھی تھی ساختیات پس ساختیات...... میں اس میں مزید اضافہ کیا اور متن، مصنف اور قاری کے حوالے سے واضح کیا کہ:

"متن میں معنی مضمر تو ہیں، یعنی متن میں معنی بالقوت موجود ہیں لیکن وہ عامل قاری ہی ہے جو متن کے معنی کو موجود بناتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ متن، بارود کی تھیلی ہے، قرأت کا عمل فلیتہ دکھاتا ہے جو اشتعال پیدا کرتا ہے، اور یوں وہ پھلجھڑی روشن ہو جاتی ہے جس کو معنی کا چراغاں کہتے ہیں"

(گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات...... ص 279)

ناصر عباس نیر نے قاری اساس تنقید کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

قاری اساس تنقید، قاری کو مرکز توجہ بنا کر قاری کی اقسام، عمل قرأت، طریق ہائے قرأت، متن کی معنی یابی میں قاری اور قرأت کا تفاعل، قاری اور متن کا رشتہ اور عمل قرأت کے قاری پر اثرات، نیز قرأت کے بعد متن کی صورت حال، جیسے نکات کو فلسفیانہ شکل دینے کی کوشش کرتی ہے۔

(ناصر عباس نیر: جدید اور مابعد جدید تنقید، ص 162)

امتزاجی تنقید وزیر آغا سے منسوب ہے لیکن دیکھا جائے تو تنقید میں امتزاجی رویے کم و بیش، ہر قماش کے ناقدین کے یہاں ملتے ہیں۔ اسی طرح حامدی کاشمیری کے نظریہ اکتشاف، یعنی اکتشافی تنقید کی معنویت کا اعتراف اب نارنگ اور فاروقی وغیرہ بھی کرنے لگے ہیں۔ حامدی کاشمیری نے اپنی تصنیف 'اکتشافی تنقید کی شعریات' میں جو اطلاقی نمونے پیش کیے ہیں وہ اکتشافی تنقید کی اہمیت اور معنویت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، حامدی کاشمیری، نظام صدیقی، قاضی افضال حسین، ضمیر علی بدایونی، ابوالکلام قاسمی اور ظہورالدین کے بعد ناصر عباس نیر، شافع قدوائی، انیس اشفاق، ارتضیٰ کریم وغیرہ اردو میں مستند مابعد جدید ناقدین تصور کیے جاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ نئی نسل میں خاص طور پر الطاف انجم، اور رحمت شمیم، کوثر مظہری، شاہد کلیم وغیرہ کے نام بھی اہم ہیں۔ راقم کی کتاب "متن معنی اور تھیوری" مئی 2015 میں شائع ہوئی ہے جس میں مابعد جدید تنقیدی تھیوریز کا مفصل تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اب مابعد جدید تنقید کے پیش منظر کے حوالے سے ایک آخری بات۔ ادب میں تخلیق ہو یا تنقید، سماج اور ثقافت کے خارجی مادی حالات کے حوالے سے ہی وجود میں آتی ہے۔ رومانوی دانشوروں سے قطع نظر، جو ورڈز ورتھ (Words Worth) کی زبان میں کہتے تھے کہ The world is too much with us. ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید ہر قماش کے تخلیق کار اور ناقدین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا بر صغیر میں مابعد جدید تنقید کے پیش منظر پر، ہند و پاک کی عصری سماجی و ثقافتی صورت حال کے تناظر میں ہی گفتگو ہو سکتی ہے۔

آج اردو دنیا کے سب سے بڑے منطقے ہندوستان اور پاکستان ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں اردو ادب کی تخلیق و تنقید کا تسلسل شد و مد سے جاری ہے لیکن جس طرح نادر شاہ درانی کے حملے اور 1857 میں پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پورا ہندوستان سیاسی و سماجی اور معاشی و ثقافتی بحران سے دو چار ہو گیا تھا، اور اس کے نتیجے میں عام ہندوستانی خصوصاً مسلم قوم میں سنجیدہ تعمیری اور نتیجہ خیز غور و فکر کا عمل بھی شروع ہو گیا تھا، اردو کے علمی اور ادبی میدانوں میں جدت پسندی کے اولین نقوش اسی بحرانی سماجی، سیاسی اور ثقافتی حالات میں ہی سامنے آتے ہیں۔ غالب کے خطوط، سرسید کے مضامین، کرامت علی کی تصنیفات، محمد حسین آزاد کی نظمیں، حالی کی غزل اور مقدمہ اور سرسید کے رفیق خاص مولوی چراغ علی کی اردو اور انگریزی تصنیفات اس کے بین ثبوت ہیں۔ اسی طرح تقسیم ملک کے آس پاس کے فرقہ وارانہ فسادات اور پھر 1990 کے آس پاس سے جب سے، اردو میں مابعد جدیدیت نے سر اٹھانا شروع کیا، تہذیبی قومیت (Cultural Nationalism) کا روز افزوں عروج بھی ہوا۔

دوسری جانب گلوبلائزیشن کے حوالے سے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی بازاریت اور صارفیت (Consumerism) کی حکمت عملی، انفارمیشن ٹکنالوجی کی

اردو کے دونوں بڑے مرکزوں ہند و پاک کے معاشروں میں خواص اور عوام کے درمیان فاصلے ٹھوس اور مستقل نہیں رہ گئے ہیں۔ برتری یا کمتری، اجارہ داری یا محرومی کے احساسات اب بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس تیز رفتار تبدیلی یا Fluctuating gap کے سبب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب کی تخلیق اور تنقید کے فکر و نظر، موضوعات، اسالیب اور رویوں میں بھی تبدیلی آنا لازمی تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں مابعد جدید تصور ادب اور تنقید کے فروغ کا جواز بھی ہے۔

فراوانی اور ان تک عام لوگوں کی آسان رسائی کے سبب ہند و پاک کے معاشرے، میڈیا سوسائٹی یا تماشا سوسائٹی (Spectacle society) میں بدل گئے ہیں۔ کیونٹ کلچر کی جگہ کنزیومر کلچر نے لے لی ہے۔ نئی نسل 'سٹیزن Citizen' کی جگہ 'نیٹیزن Netizen' ہوتی جا رہی ہے۔ اردو کے دونوں بڑے مرکزوں ہند و پاک کے معاشروں میں خواص اور عوام کے درمیان فاصلے ٹھوس اور مستقل نہیں رہ گئے ہیں۔ برتری یا کمتری، اجارہ داری یا محرومی کے احساسات اب بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس تیز رفتار تبدیلی یا Fluctuating gap کے سبب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب کی تخلیق اور تنقید کے فکر و نظر، موضوعات، اسالیب اور رویوں میں بھی تبدیلی آنا لازمی تھا، ہندوستان اور پاکستان میں مابعد جدید تصور ادب اور تنقید کے فروغ کا جواز یہی ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو دنیا یعنی ہند و پاک کی سماجی و ثقافتی صورت حال، ایک مریضانہ صورت حال ہے۔ مابعد جدید تنقید، ادب کے حوالے سے سماج اور ثقافت کے امراض کی تشخیص کر کے انسان کو مابعد جدید صورت حال میں زندگی جینے کا ہنر سکھانے کا فریضہ انجام دینے کی کوشش تو کر رہی ہے لیکن اردو مابعد جدید تنقید میں مغربیت اور تقلیدیت کے عناصر زیادہ ہیں۔ اپنے ماحول اور معاشرے کی حقیقی صورت حال کے تناظر میں دانشورانہ اور تعمیری رویوں کی کمی کھٹکتی ہے۔

اکثر مابعد جدید ناقدین یہ بھول جاتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کے ایک اہم بنیاد گزار بودریارد (Jean Baudrillard) نے شروع میں ہی واضح کر دیا تھا کہ "یہ قطعی ضروری نہیں کہ دنیا کے ایک علاقے میں وجود میں آنے والا کوئی نظریہ یا رجحان دوسرے علاقے کے لیے بھی من و عن قابل قبول ہو۔"

گوپی چند نارنگ نے بھی لکھا ہے کہ:

"پیڑ پر نئے برگ و بار کی تمنا پالنا خوش آئند ہے لیکن ہوش جنوں میں ان جڑوں پر ہی وار کرنا جس پر پیڑ قائم ہے اپنے آپ میں ادب کی موت کا اعلان کرنا ہے۔ زندہ ادب اور ثقافت میں پرانے اور نئے کے مابین جو جدلیاتی رشتہ روایت کے اندر، روایت کی رو سے ہوتا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

مہابیانیہ اور معنی کی تکثیریت دونوں کے حوالے سے مابعد جدید تنقید نے ابھی تک اپنا سروکار ادبی متون تک ہی محدود رکھا ہے۔ گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، وزیر آغا، ضمیر علی بدایونی، وہاب اشرفی، ابوالکلام قاسمی، بیگ احساس، ارتضیٰ کریم اور ظہورالدین وغیرہ نے راجندر سنگھ بیدی، انتظار حسین، منٹو، قرۃ العین حیدر، غالب، اقبال، افسانہ، نظم اور غزل وغیرہ پر جو مضامین لکھے ہیں۔ ان میں عورت، جنس اور فرقہ واریت، زبان، زندگی، زمانہ، متن، مصنف، معنی، تخلیقیت اور شعریات ادبی روایات اور رسومیات وغیرہ کے حوالے سے بعض مسلمہ لیکن فرسودہ سماجی روایات اور مفروضات کی نفی ضرور ہے کیونکہ ادب اختلاف و افتراق سے ہی پنپتا ہے لیکن ان پرانے اور نئے مابعد جدید ناقدین نے اپنے مابعد جدید ادبی تصورات کا اطلاق مذہبی متون پر کرنے سے گریز ہی کیا ہے۔ اردو دنیا کی عصری مریضانہ صورت حال کے پیش نظر مابعد جدید تنقید سے دلچسپی رکھنے والے نئی نسل کے ناقدین کو بھی تو ہی تشخص کے پیش نظر، غیر مقلدانہ رویہ اپنا کر مابعد جدید تنقید کو اپنے ایمان و ایقان اور مقامی معاشرتی و ثقافتی اقدار کے گرد سے باندھ کر ہی برتنا ہوگا۔

Prof. A.Q. Jawaid, Baitul-Zehra, 27, Green Hills Colony, Near Govt. Higher, Secondry School, Bhatindi, Jammu - 181152 (J&K)

ابوالکلام قاسمی

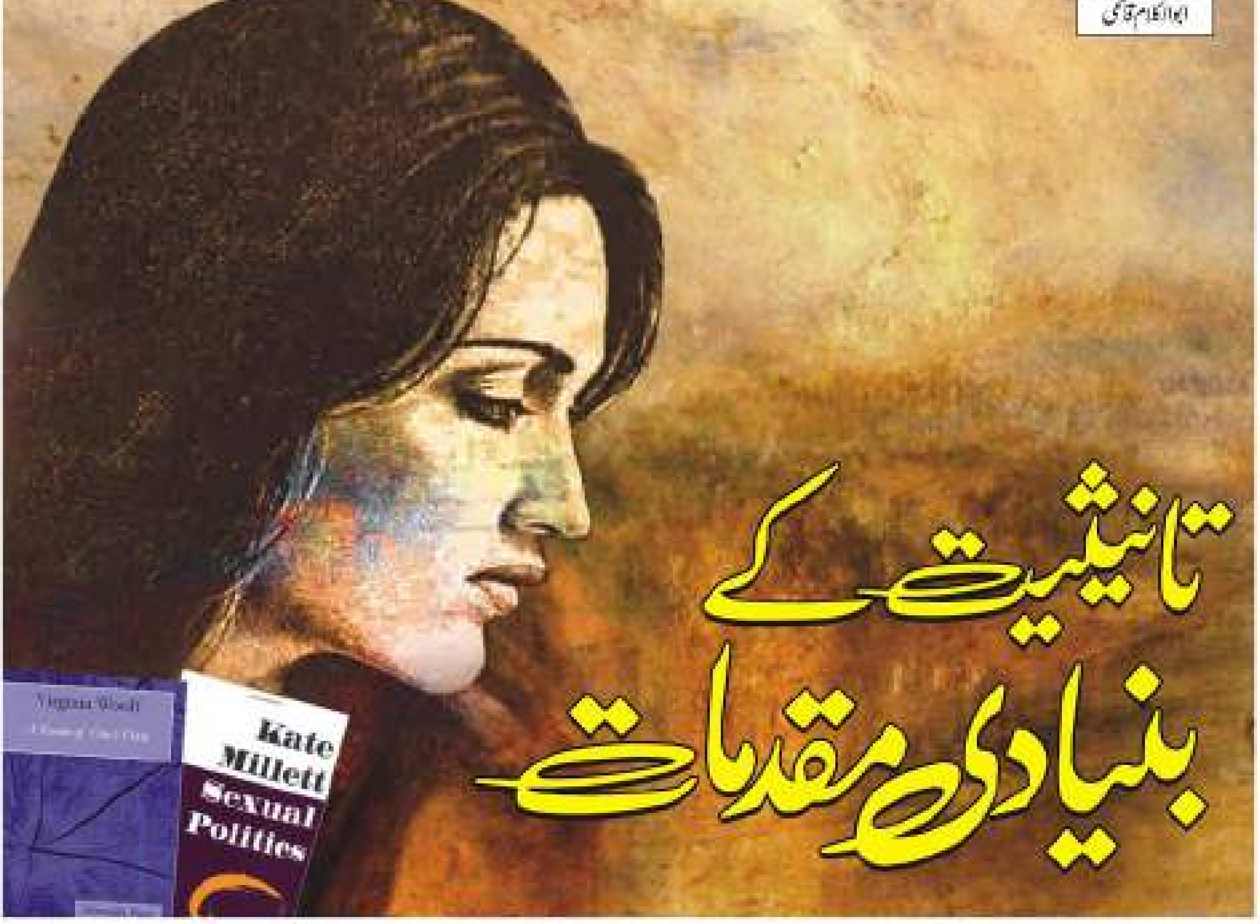

تانیثیت کے بنیادی مقدمات

تانیثیت، نسائیت اور آزادیٔ نسواں، جیسی مماثل اصطلاحوں سے متعلق اردو میں اطلاقی نوعیت کی تحریریں گذشتہ دو دہائیوں میں بڑی تعداد میں جمع ہو چکی ہیں۔ لیکن چونکہ نظری طور پر ان اصطلاحوں کی جزوی تفریق پر بہت کم لکھا گیا ہے اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے بالعموم ان تمام اصطلاحوں کو مترادفات کی حیثیت سے ادبی مباحث کا حصہ بنایا ہے۔ اس لیے Feminism یا تانیثیت کے بنیادی تصورات کو نسائیت یا آزادیٔ نسواں سے الگ کر کے دیکھنے کی ہنوز ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ نسائیت کو ہم زیادہ سے زیادہ زنانہ پن کا ہم معنی قرار دے سکتے ہیں، جس کی تلاش کو تانیثیت پسند مصنفین پوری طرح مسترد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نسائیت اور زنانہ پن کو جس طرح مردانہ پن سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کا محرک مرد اساس معاشرے کے وہ مفروضات یا مسلمات ہیں جو مردوں کے بنائے ہوئے ہیں اور ان ہی بنیادوں پر عورتوں کے لیے نازک دلی، رقیق القلبی، شرم وحیا یا ضد اور ہٹ دھرمی کی صفات کو اس طرح مخصوص کر دیا گیا ہے کہ ان صفات کے وسیلے سے بظاہر تو حمایتِ صنفِ بہتر کا تصور ابھرتا ہے مگر اصل میں ان کے پیچھے عورت کے کمزور، کم عقل اور قابلِ رحم ہونے کے مضمرات شامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک آزادیٔ نسواں کا سوال ہے تو یہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کا وہ وقت طلب، بول اور رومانی اندازِ فکر تھا جس کے زیرِ اثر مجبور اور زیر دست عورت کو ہر طرح کی فکری اور عملی آزادی کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ تانیثیت کی اصطلاح زیادہ سے زیادہ نصف صدی پرانی اصطلاح ہے، جس کے کچھ بنیادی مقدمات ہیں۔ ان مقدمات پر ایک نگاہ ڈالے بغیر تانیثیت کی اصطلاح کے ساتھ انصاف ممکن ہے اور نہ اس کو ادبی تشریح و تعبیر میں پوری طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے اردو میں تانیثیت کی اصطلاح کو عموماً ڈھیلے ڈھالے معنوں میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور عورت سے متعلق رائج مفروضات کی تلاش و جستجو کو اکثر تانیثیت کا نام دیا ہے۔ چنانچہ تانیثیت کے نام سے جو تنقیدی جائزے لیے جاتے ہیں ان میں یا تو عورت کے بارے میں رائج تصورات اور مرد اساس معاشرے کے ان مفروضات کو عورتوں کے تخلیق کردہ متن میں تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو مردوں کے اپنے قائم کردہ یا عورتوں سے منسوب کردہ صفات سے عبارت ہیں۔

یوں تو مغرب میں نسائی جد و جہد کی تقریباً دو سو سال کی تاریخ ہے، جس کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا۔ تاہم نسائیت کے تصور کی بنیادیں استوار کرنے میں ان تحریروں کا بھی اہم کردار ہے جو انیسویں صدی میں ہی منظرِ عام پر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ویسے ورجینیا وولف نے 1929 میں اپنی کتاب "A Room of ones own" اور دوسرے مضامین میں عورتوں کی شناخت کے مسئلے پر بعض بنیادی باتیں لکھی تھیں۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد جب سیمون دی بوار نے "Second Sex" لکھی تو گویا عورت کو باقاعدہ مرد کے متوازی طبقے کے طور پر قائم کرنے کی کوشش کی اور عورتوں کے بارے میں رائج

مفروضات کو عورتوں کی بطور طبقہ شناخت میں سب سے بڑی رکاوٹ بتایا۔ اس کتاب میں سیمون دی بوار کا لب و لہجہ کچھ ایسا غیر متوقع اور غیر یقینی تھا کہ ان کے ساتھی اور شریک زندگی سارتر جیسے روشن خیال دانش ور نے بھی زیادہ پسند نہیں کیا تھا۔ اس کتاب میں سیمون کا کہنا تھا کہ عورت پیدائشی طور پر ہمارے طے کردہ صفات کی حامل نہیں ہوتی بلکہ پدری معاشرے یا Patriarchal society میں وہ عورت بنادی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ بھی خود کو ان ہی صفات سے متصف سمجھنے لگتی ہے جو مردوں کی طرف سے ان کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہیں۔ یوں تو Kate Millet نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "Sexual Politics" میں ان تمام مضمرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور سگمنڈ فرائڈ کے تصور تحلیل نفسی سے لے کر ڈی۔ ایچ۔ لارنس تک کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور بتانے کی کوشش کی ہے کہ مردانہ تصورِ زن کے اثرات عورتوں کے بارے میں فلسفیانہ یا نفسیاتی تصورات میں ہی نہیں بلکہ ادبی اظہار میں بھی کیوں کر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس ضمن میں جولیا کرسٹوا اور سوزان سونتاگ کے نقاط نظر اب اتنے عام ہوگئے ہیں کہ صحیح معنوں میں ان ہی نقاط نظر نے Feminism کے بنیادی مقدمات کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

لیکن تانیثیت کے بنیادی مقدمات کی تفہیم کا حق صرف اسی طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ ہم اسے کسی تحریک یا رجحان سے زیادہ ایک طرز قرأت یا انداز مطالعہ سے تعبیر کرنے کی کوشش کریں۔ اس پس منظر میں اس حقیقت سے کسی بھی ادبی اور لسانی معاشرے میں انکار مشکل ہے کہ جو ادبی متن تخلیق یا تیار کیا جاتا ہے وہ اگر مردوں کا تخلیق کردہ متن ہے جب بھی اور اگر عورتوں کا تخلیق کردہ متن ہے تب بھی اس میں پدرانہ معاشرے میں رائج عورتوں سے متعلق تصورات کی افراط ہوگی۔ تانیثیت پسند مصنفین کا کہنا ہے کہ کسی پدری معاشرے میں زندگی گزارنے کا ہی نہیں بلکہ سوچنے سمجھنے تک کا انداز مرد اساس ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کی جاتی کہ مردوں کے لکھے ہوئے متن کو ایک عورت کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا گیا ہوگا۔ مگر یہاں تو عورت کے نقطۂ نظر کا مسئلہ بھی خاصا وضاحت طلب ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ایک پدرانہ معاشرے میں عموماً ایک عورت بھی مرد کے نقطۂ نظر سے نہ صرف زندگی گزارتی ہے بلکہ اس کے سوچنے سمجھنے کا انداز بھی مرد اساس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس صورت حال میں عورت کے لیے بھی اپنے اندر مردوں کے قائم کردہ تصوراتِ زن سے نجات حاصل کرنا اور ان کے متن میں ان عناصر کی نشان دہی کرنا جو طبقہ اناث کی فطری سوچ پر مبنی ہو۔ پورے نظامِ فکر اور رائج زاویہ نظر کی تبدیلی کا متقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ طبقہ اناث کی فطری سوچ کو عورت کی عزت نفس، طبقاتی یا Gender Base شناخت سے مربوط کیے بغیر کسی بھی متن میں ان مفروضات اور تعصبات کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جو عورت کے خلاف جاتے ہیں اور تانیثیت اسی نشان دہی کا دوسرا نام ہے۔

شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ مردوں کی قرأت متن کا انداز اس پس منظر میں عورتوں کی قرأت متن سے مختلف ہوگا۔ تاہم یہ دیکھنے کی ضرورت بھی ہوگی کہ انداز قرأت کا یہ فرق نہ صرف یہ کہ محض مردانہ صفات کی شناخت پر مبنی نہ ہوگا زنانہ صفات کی تفریق کے ہم معنی ہوگا۔ اس لیے کہ

تانیثیت کے بنیادی مقدمات کی تفہیم کا حق صرف اسی طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ ہم اسے کسی تحریک یا رجحان سے زیادہ ایک طرزِ قرأت یا انداز مطالعہ سے تعبیر کرنے کی کوشش کریں۔ اس پس منظر میں اس حقیقت سے کسی بھی ادبی اور لسانی معاشرے میں انکار مشکل ہے کہ جو ادبی متن تخلیق یا تیار کیا جاتا ہے وہ اگر مردوں کا تخلیق کردہ متن ہے جب بھی اور اگر عورتوں کا تخلیق کردہ متن ہے تب بھی، اس میں پدرانہ معاشرے میں رائج عورتوں سے متعلق تصورات کی افراط ہوگی۔ تانیثیت پسند مصنفین کا کہنا ہے کہ کسی پدری معاشرے میں زندگی گزارنے کا ہی نہیں بلکہ سوچنے سمجھنے تک کا انداز مرد اساس ہوتا ہے۔

مرد کے تخلیق کردہ متن میں پدرانہ معاشرے کے مسلمات کی بالادستی کے باعث ایسے تعصبات کا پایا جانا ناگزیر ہے جو عورت کے خلاف جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اگر ہم ایک لاطینی امریکی مصنفہ وکٹوریا اوکامپو (Victoria Ocampo) کے اس اقتباس کو سامنے رکھیں تو طرزِ قرأت کے اس فرق کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھا جاسکتا ہے:

"زمانۂ حال تک ہم عورتوں کے بارے میں مرد گواہوں سے سنتے آئے ہیں۔ وہ گواہ جس کو کوئی بھی عدالت گواہی کی اجازت نہیں دے گی جس کی گواہی مبنی بر تعصب سمجھی جائے گی۔ خود عورت نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ اور اب عورت پر اس بات کا دارومدار ہے وہ اس نامعلوم برّاعظم کو دریافت کرے جس کی وہ نمائندہ ہے، بلکہ اپنی ذاتی حیثیت سے مشکوک معاون کے طور پر مردوں کے بارے میں بھی بات کرے۔"

چنانچہ اگر عورت کی اپنی کوئی بھی حیثیت ہے تو اس کو اس بات کا حق تو ہونا ہی چاہیے کہ وہ مطالبہ کرسکے کہ ایک متن کو بھی مردوزن سے متعلق مفروضات یا مسلمات سے بلند ہو کر پڑھا جانا چاہیے۔ جولیا کرسٹیوا نے تو اس بحث کو مختلف فلسفوں اور سماجی تعبیرات کے حوالے سے بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا تو یہ تک کہنا ہے کہ کارل مارکس کی قائم کردہ سماجی طبقاتی تقسیم محض سماجی اور معاشی طور پر انسانی معاشرے کی عمودی یا Vertical تقسیم کو دکھاتی ہے مگر جنسی یا صنفی طور پر جو زن و مرد کی طبقاتی تقسیم ہے وہ دراصل افقی یا Horizental ہے اور یہ تقسیم زیادہ آفاقی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لیے مارکسزم بھی عورت اور مرد کے درمیان طبقاتی تفریق قائم نہ کرکے ایک نامکمل اور محدود طبقاتی نظام کی بات کرتی ہے اور دوسری طرف وہ محض پیداوار یا Production کی بنیاد پر اپنی فکری عمارت تعمیر کرتی ہے Re-production کی اس اہمیت کا احساس تک نہیں رکھتی جس کا دارومدار عورت پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جنس کے بجائے عورت اور مرد کی Gender Based طبقاتی تقسیم، سماج کی مارکسی تقسیم سے کہیں زیادہ بنیادی اور جبلّی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کرسٹوا کا کہنا ہے کہ مرد اساس معاشرہ نہ تو پوری طرح عورت کے انفرادی تجربے اور ادراک کا شعور رکھتا ہے اور نہ پدرانہ معاشرے میں دور تک سرایت کیے ہوئے تعصبات سے الگ تانیثی انداز قرأت کا ثبوت فراہم کرسکتا ہے۔

تانیثیت پسند مصنفین کا موقف یہ بھی ہے کہ مردوں کی طرف سے بھی عورتوں کے لیے تخلیق کردہ متن کو تفریقی انداز میں پڑھنا اور اس کی تعبیر کرنا مریضانہ نہیں بلکہ برابری کی سطح پر ہونا چاہیے۔ چنانچہ جب تک متن کا مطالعہ اس طرح نہ کیا جائے کہ یہ پتہ لگایا جاسکے کہ متن میں جنسی تفریق پر مبنی جو تصورات یا مفروضات یا تعصبات ہیں ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کے محرکات کیا ہیں، کہیں یہ تصورات محض جنسی تفریق پر مبنی تو نہیں، ایسی تفریق پر جو عورت کو بطور طبقہ تسلیم ہی نہ کرتی ہو، تانیثیت پسندوں کے نقطۂ نظر کے مطابق کچھ تجربات صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی ایسے معاشرے میں جو اس حد تک پدری نظام کا زائیدہ اور مردوں کے جنسی تعصبات پر مبنی ہو ان تک مرد قاری کا پہنچنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے معاشروں میں جہاں عورت بھی خود تعبیر متن کا حوصلہ نہیں رکھتی یا تو وہ مردوں کی تعبیرات کو قبول کرتی ہے یا پھر اس کو کسی اور

طرح کے الفاظ میں ابھرتی رہتی ہے۔ تانیثیت کا نقطۂ نظر اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ عورتوں کے بارے میں جو اسٹیریو ٹائپ معاشرے میں رائج ہے اور جس طرح اس کا اظہار ادبی متن میں بھی ہوتا رہتا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے رائج ہونے کے محرکات کے ساتھ اس کی صداقت یا عدم صداقت کا پتہ لگانے کی کوشش بھی کی جائے۔ تانیثی تنقید دراصل عورت کو نہ صرف ادب میں اس کا صحیح مقام دلانا چاہتی ہے بلکہ عورت کے نقطۂ نظر کے فقدان کی تلافی بھی کرنا چاہتی ہے۔ ماضی قریب میں چوں کہ مغرب میں شعوری طور پر مردوں کے تخلیق کردہ متن سے مختلف متن عورتوں نے تیار کرنے پر توجہ صرف کی ہے۔ اس لیے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ عورت کے لکھے ہوئے متن کو مرد نہ تو پوری طرح سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کے مضمرات تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ تانیثیت پسند مصنفین کا کہنا ہے کہ پدرانہ معاشرے کے معتقدات اور رائج تصورات، اس وقت تک ایک عورت کے لیے مبنی بر تعصب بن جاتے ہیں جب وہ اس معاشرے میں تخلیق ہونے والے متن کا مطالعہ بطور طبقہ (Gender) ایک عورت کی امیج یا کردار کے ساتھ انصاف کی تلاش و جستجو کرتی ہے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ انداز فکر کی کسی معمولی تبدیلی سے اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا، اس لیے اس طرز فکر کے برخلاف اور متوازی اب ایک نوع کے Paradigm Shift کی ضرورت ہے۔

تانیثیت، کے بنیادی مقدمات کی روشنی میں تانیثی تنقید کا بنیادی موقف بالکل واضح ہوجاتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس بات کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ ماضی کے متن سے جنسی تعصبات پر مبنی عناصر کا اخراج کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں متعدد ایسی کوششیں تانیثیت پسندوں کی طرف سے ہوئی ہیں اور آج بھی ہورہی ہیں، تاکہ کلاسیکی شعر و ادب کو تانیثی انداز قرأت سے گزار کر ایسے متون سے جنسیاتی تفریق اور طبقاتی تعصبات کو کسی طرح منہا کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کی بعض کوششیں پاکستان کی تانیثی تنظیم 'وعدہ' کے پلیٹ فارم سے سامنے آنے لگی ہیں۔ اس ادارے میں شامل فہمیدہ ریاض، خالدہ حسین اور فاطمہ حسن نے خاموشی کی آواز اور اردو ادب کی تانیثی رد تشکیل کے نام سے متعدد کتابیں شائع کی ہیں، جن میں ڈپٹی نذیر احمد، پریم چند، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور بعض دوسرے مرد اور عورت مصنفین کے متن کی تانیثی رد تشکیل (یعنی ان کو Deconstruct) کرنے کی بہت کامیاب کوششیں کی ہیں۔

اگر تانیثیت کو محض رسمی طور پر نسائیت یا زنانہ پن کی تلاش سے الگ اس کے مخصوص دائرہ کار تک محدود رکھا جائے تو ہم کسی بھی متن کو نمونہ بنا کر تانیثی نقطۂ نظر سے اس کی رد تشکیل کرسکتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے عملی اطلاق کے نمونے کے طور پر ایک ایسی نظم کو پیش کیا جاسکتا ہے جو ایک مرد درگا پرشاد سرور جہان آبادی نے 'پدمنی' کے عنوان سے لکھی تھی۔ سرور نے پدمنی کے کردار کے ساتھ اپنی پوری نظم کو بھی عظمت، عفت اور پاکیزگی کا نمونہ بنانے کی کوشش کی ہے اور پدمنی جو دراصل علاء الدین خلجی کے زمانے کی ایک ایسی عورت ہے جو سپاہ گری اور شوہر کی ہلاکت کے بعد بے دست و پا ہوکر رہ جاتی ہے۔ بالآخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی عصمت و عفت کے تحفظ کی خاطر آگ کے شعلوں میں جلنا گوارہ کرتی ہے مگر کسی غیر مرد کی چیرہ دستیوں کا شکار نہیں بننا

تانیثیت، کے بنیادی مقدمات کی روشنی میں تانیثی تنقید کا بنیادی موقف بالکل واضح ہوجاتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس بات کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ ماضی کے متن سے جنسی تعصبات پر مبنی عناصر کا اخراج کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں متعدد ایسی کوششیں تانیثیت پسندوں کی طرف سے ہوئی ہیں اور آج بھی ہورہی ہیں، تاکہ کلاسیکی شعر و ادب کو تانیثی انداز قرأت سے گزار کر ایسے متون سے جنسیاتی تفریق اور طبقاتی تعصبات کو کسی طرح منہا کیا جاسکتا ہے۔

چاہتی۔ درگا پرشاد سہائے نے پدمنی کو وفا کی دیوی اور عصمت وعفت کی ملکہ جیسے القاب سے نوازا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ صفات خود عورت کے لیے بھی بطور ایک طبقہ قابل شناخت ہیں بھی یا نہیں۔ کیا یہ صفات عورت کے لیے ہی مخصوص ہیں؟ کیا مرد کا باعصمت ہونا، پاکیزہ ہونا، ظلم و جور کے ساتھ کسی بے قصور خاتون کا اپنا لقمہ ہوس بنانا، کچھ مثبت یا قابل تعریف صفات ہیں؟ اب ذرا پدمنی نظم کے دو بند ملاحظہ کیجیے:

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم
اور پروانوں کو دی سوز فنا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم
آئی حصے میں ترے ذوق فنا کی تعلیم
نرم و نازک تجھے اعضا دیے جلنے کے لیے
دل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کے لیے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا
خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبد نور میں پتلا تیرا
ید قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا
بھر دیا کوٹ کے سوز غم شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلہ مضطر دل میں

ان مصرعوں سے اندازہ ہوتا ہے گویا عورت کی بنیادی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے وجود کو دوسرے ہی نہیں بلکہ دوسرے مرد یا شوہر کے وجود کے لیے قربان کردے۔ اس نظم کا شاعر اس حد تک مردوں کے ذریعے طے کردہ زنانہ صفات سے مشروط ہے کہ اس سے الگ ہوکر کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ تمہید یہ قائم کرتا ہے کہ جب خالق کائنات نے اپنی مخلوق کی جبلتوں کا تعین کیا تو جس طرح بلبل کو آہ و بکا کی صفت عطا کی، اسی طرح پروانوں کو شمع کے عشق میں جل مرنے کی جبلت کا تعین کیا۔ علیٰ ہٰذا القیاس عورت کو اس حد تک محکومی اور مرد پر انحصار کرنے والی مخلوق بنایا کہ اس کی بنیادی صفات وفا، یا عصمت، یا پاکیزگی، یا قربانی یا جذباتیت سے اسے سرشار کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے پدمنی تم صرف اور صرف اپنے شوہر کی چتا پر جلنے کے لیے بنائی گئی اور تمہارے نرم و نازک اعضا صرف اس لیے بنائے گئے کہ وہ آسانی سے شوہر کی عزت کی بقا کی خاطر جل کر خاکستر ہوسکیں۔ مزید یہ کہ تم کو دل بھی صرف اس لیے عطا ہوا کہ وہ عشق کے شعلوں سے تابندہ ہونے کے بجائے آگ کے شعلوں میں پگھل جائے اور اس طرح تم مردوں کی نصف ثانی یا نصف بہتر ہونے کی حیثیت مرد اساس معاشرے کی عظمت کی نمائندہ بن جاؤ:

ناز آیا ترے حصے میں ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی محبت بھی وفا بھی آئی

یا ایک اور بند میں وہ کہتے ہیں کہ:

آگ پر بھی نہ تجھے آہ، مچلتے دیکھا
تپش حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

اگرچہ اس نظم کا تاریخی پس منظر بھی ہوتا جب بھی نظم اپنی کلیت میں عورت کی اس قربانی کی تمثیل بنائی گئی ہے جو صرف اور صرف مرد کے لیے باعث تسکین ہوسکتی ہے۔ اگر تاریخی سیاق و سباق کو الگ کرکے اس نظم کو پڑھا جائے تو اس سے زیادہ ہیبت ناک تصویر ابھرتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا پوری نظم میں ستی کی رسم کی پرزور تائید کرکے مردوں کے معاشرے کی نہایت شقی القلب اور ظالمانہ تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

■

Prof. Abul Kalam Qasmi, Dept of Urdu, Aligarh Muslim university, Aligarh 202002 (UP), Mob.:+91-571-2701504, Email.: akqasmi@gmail.com

غلام نبی خیال

دنیائے ادب کی دس عظیم کتابیں

جان کیننگ (John Canning) نے عظیم کتاب کی یہ تشریح کی ہے کہ وہ ادبی لحاظ سے غیر معمولی طور پر معیاری ہو، اس میں علم کے شعبہ جات کے ساتھ شاندار فکر و ذہن کی آگہی کا اظہار ہوا اور روحانیت کے فقیدالمثال ادراک پر مبنی ہو۔

دُنیا بھر میں جن کتابوں کو عظیم کہا جاتا ہے اُن میں مذہبی صحائف کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ اہل اسلام کے نزدیک دنیا کی سب سے عظیم بلکہ عظیم ترین کتاب الہامی صحیفہ قران پاک ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب کے پیروکار اپنی اپنی الہامی کتب کو سب سے زیادہ فوقیت دیتے ہیں جو اُن کا حق بجانب عقیدہ ہے۔

ادبیات کے تعلق سے چند ہی تصانیف کو عظیم کہلائے جانے کا افتخار حاصل ہو سکا ہے۔ ان کے انتخاب میں بھی اختلافات کی گنجائش موجود ہے لیکن یہاں بھی انتخاب کرنے والے کی ذاتی پسند وناپسندی کو ملحوظ نظر رکھا جا سکتا ہے۔ اسی امر کے پیش نظر اس مقالے میں چند ایسی کتب کو زیر بحث لایا گیا ہے جو میری نظروں میں بہت بڑی عظمت کی حامل ہیں۔ اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس زمرے میں مکالمات افلاطون، مادام بواری، مارکس کی کیپٹل، یولیسز، ڈاکٹر ژواگو، دیوان حافظ، بیم وامنزلاست، گلنار، شیکسپیئر کے ڈرامے اور کئی لاجواب کتب کو بآسانی شامل کیا جا سکتا ہے مگر یہ مقالہ محض میری ذاتی پسند کا ماحصل ہے اور اختصار کے پیش نظر اس میں بھی صرف دس کتابوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

ہومر کی ایلیاڈ:

ہومر (9th Cen BC) قدیم یونان کا سب سے مشہور شاعر تھا جس کی پیدائش دنیا کے اولین مورخ ہیروڈوٹس کے مطابق 850 قبل مسیح میں ہوئی۔ ہومر نے ایلیاڈ (Iliad) جیسا شاندار رزمیہ تخلیق کر کے دنیائے سخن گوئی میں ایک ایسی جگہ بنائی کہ تین ہزار سال گذرنے کے باوجود آج تک اس مرتبے کو کوئی اور نہیں پہنچ سکا ہے۔ البتہ رینان کی یہ پیش گوئی کہ "ایک ہزار سال کے بعد دنیا کی ساری کتابیں دھول چاٹتی ہوں گی اور اگر کوئی باقی رہے گا تو وہ ہے ہومر" اس کی اپنی صوابدید کی عکاسی کرتی تھی۔

سماجیات کے تناظر میں کہا جاتا ہے کہ فتنہ وفسادات کی جڑ "ز" حرف سے ہی متعلق ہوتی ہے یعنی زر، زن اور زمین۔ ایلیاڈ کی کہانی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا مرکزی کردار بھی ایک خوبصورت عورت ہیلن ہی ہے جو دو ممالک یعنی یونان اور ٹرائے کے درمیان دس سالہ خون ریز جنگ کا باعث بنی۔ اس جنگ کے نتیجے میں ٹرائے کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

ٹرائے کا اصلی نام الیم تھا۔ اسی مناسبت سے ہومر نے اپنی کتاب کا نام ایلیاڈ رکھا۔ ہومر قدیم یونان کا ایک نابینا گویا تھا جو گھر گھر جا کر یونان کی حکایاتی داستانیں اور سینہ بہ سینہ چلنے والی دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں سنا سنا کر لوگوں سے کچھ پیسے کما کر اپنا گذر بسر کر لیتا تھا۔ وہ رباب جیسا ایک آلہ موسیقی بجا کر بھی عام لوگوں کے دل بہلاتا تھا۔

ایلیاڈ کا قصہ قدیم یونان کی دیومالائی حکایات پر مشتمل ہے جس میں انسان انہی دیوتاؤں کو خدائیت کا درجہ دے کر انہی کی مرضی کے مطابق زندگی گذارتے ہیں۔

ایلیاڈ میں یونان اور ٹرائے کے درمیان بارھویں صدی قبل مسیح میں لڑی گئی اس جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے جو دس سال تک جاری رہی اور جس نے ہزاروں انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ شاعر نے بہر حال اس جنگ کے دسویں سال یعنی 184 قبل مسیح کا حال اپنے رزمیہ میں اس لیے نظم کیا ہے کہ اگر وہ اس جنگ کے سارے عرصے پر محیط واقعات کو نظم بند کرتا تو داستان کی چاشنی اور اثر انگیزی متاثر ہو جاتی۔

ہومر نے جن لوگوں کے لیے ایلیاڈ لکھی وہ اس کے تمام واقعات سے واقف تھے لیکن شاعر نے جس انداز میں ان کی شیرازہ بندی کی اس نے ہومر کو یونان قدیم کا سب سے مقبول اور محبوب سخن گو بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ دارا نے اپنی جنگی مہمات کے دوران لوٹ کا جو مال جمع کیا تھا اس میں سے اسے ایک چھوٹا سا صندوق بہت پسند آیا۔ مصاحبوں سے پوچھا کہ اس میں کون سی چیز رکھی جائے؟ ساتھیوں نے الگ الگ مشورے دیے جن میں سے کوئی بھی اس کی پسند کا نہیں تھا اور پھر وہ خود ہی

اخیر پر بولا "میں اس میں ہومر کی ایلیاڈ رکھوں گا۔"

کالیداس کی شکنتلا:

کالیداس کب اور کہاں پیدا ہوا؟ اس کے بارے میں متضاد آرا پیش کی گئی ہیں۔ اس کی جائے پیدائش کے سلسلے میں مالوا میں مندسور، اجین اور کشمیر کے نام زیر تذکرہ ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کہتے ہیں "میں نے بھی کہیں پڑھا ہے کہ وہ کشمیر میں پیدا ہوا" دلی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر پنڈت لچھمی دھر شاستری نے انگریزی میں "کالیداس کی جائے پیدائش" کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی جو 1926 میں شائع ہوئی۔ اس میں پروفیسر شاستری نے کالیداس کو کشمیری ثابت کرنے کی خاطر یہ دلائل پیش کیے ہیں:

1. وہ کشمیر کے دھان کے کھیتوں اور باغات کا جذباتی انداز میں ذکر کرتا ہے۔
2. اس نے زعفران کے پھولوں کا ہو بہو نقشہ پیش کیا ہے جو صرف کشمیر کی پیداوار ہے اور جس کے بارے میں کسی اور غیر کشمیری نے خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ دور گذشتہ میں کشمیری عورتیں اپنے سینوں پر زعفران کے نشان ثبت کرتی تھیں اس کا ذکر بھی کالیداس نے کیا ہے۔
3. جس خوبصورتی سے اس نے دیودار کے جنگلوں، مرگوں، جھیلوں، شیروں کی گپھاؤں، پہاڑوں اور نافہ غزال کی تصویر کشی کی ہے وہ ایک کشمیری فن کار ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔
4. شکنتلا ڈرامے میں ستی سرنامی ایک بہت بڑی جھیل سے کشمیر کا وجود عمل میں آنے کا کالیداس نے حوالہ بھی دیا ہے اور یہ کہ اس نے کشمیر کے حوالے سے اپنی جانبداری کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے۔
5. میگھ دوت نظم پڑھ کر بھی یہ احساس ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ کشمیری الاصل تھا۔

بدقسمتی سے مزید مطالعے اور تجزیے کے لیے انگریزی میں تحریر کردہ پروفیسر شاستری کی یہ کتاب The Birthplace of Kalidasa بسیار کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکی۔

چند تحقیق کاروں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کالیداس کشمیر ہی میں لار کے دیہات کے قریب منڈ کام میں پیدا ہوا۔ البتہ اپریل 1964 میں اجین سے سات میل دور کالیداس نام کے محلے میں ایک لمبا کتبہ دریافت ہوا جس پر یہ عبارت کندہ تھی کہ کالیداس بکرماجیت کے دور میں اجین میں پیدا ہوا اور وہیں پر اس کی پرورش ہوئی۔ کتبے پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کالیداس اجین ہی میں چھیانوے سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔

کالیداس کے بارے میں کئی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ ابتدائے شباب میں بھی حد درجہ ابلہ اور نافہم شخص تھا لیکن بعد میں کالی دیوی نے اس پر مہربان ہو کر اسے علم اور آگہی کے رموز سے واقف کیا اور اسی تناسب سے اس کا نام کالیداس یعنی کالی ماتا کا غلام پڑ گیا۔ کالیداس کی موت کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ ایک بار لنکا میں کمار داس کا مہمان تھا کہ اس

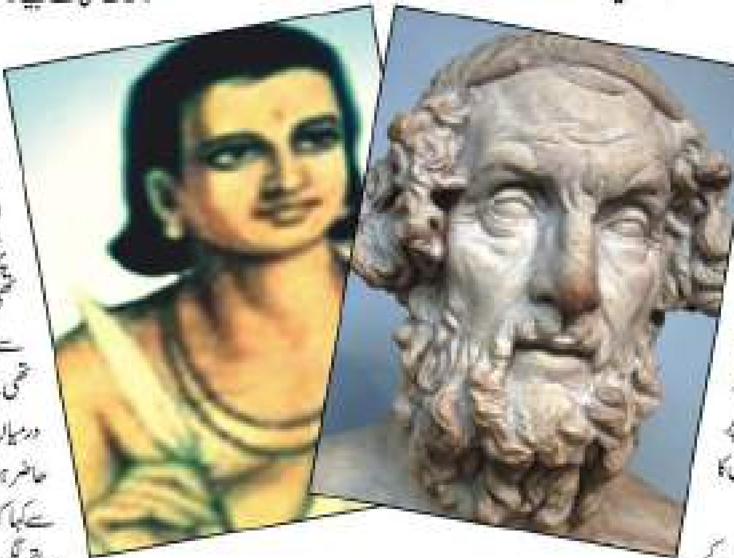

دوران ایک رقاصہ نے اسے قتل کیا۔ مزید تفصیل یوں ہے کہ اس قاتلہ نے کالیداس کے سامنے یہ مصرعہ پڑھا:

کنول کے پھول پر کنول کا ہونا سنا ہے پر دیکھا نہیں

اور پھر حاضرین سے کہا کہ وہ اس پر گرہ لگائیں۔ کئی سخن وروں نے کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ بالآخر کالیداس نے اس حسینہ سے مخاطب ہو کر کہا:

اے نازنین تمھارے پھول جیسے چہرے پر کس طرح دونوں سج رہے ہیں؟

رقاصہ بے حد خوش ہوئی مگر اس اندیشے سے کہ کسی کو پتہ نہ لگے کہ یہ مصرعہ اس کا نہیں ہے۔ اس نے کالیداس کو قتل کر ڈالا لیکن اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔

کالیداس نے جو ڈرامے اور طویل نظمیں لکھیں اور جو ہم تک پہنچ سکیں ان میں شکنتلا، میگھ دوت، کمار سمبھو، رگھو ونش، رتو سنگھار، مالویکا گنی مترا اور وکرم اروشی شامل ہیں۔

شکنتلا کالیداس کی تمام تخلیقات میں ایک ایسا شاہکار ہے جس نے اس کی شہرت کو دور دور تک پہنچایا اور اس کے نام کو بقائے دوام بخشا۔ شکنتلا کی کہانی بھی ہندو دیومالا سے ماخوذ ہے۔ یہ کہانی مختصراً یوں ہے کہ راجہ دشینت نے ایک جنگل میں ایک خوبصورت عورت شکنتلا کو دیکھا جو وہاں ماں باپ کو چھوڑ کر کنو رشی کے پاس دن گزار رہی تھی۔ دشینت نے فوراً شکنتلا کے سامنے شادی کی تجویز رکھی جو فوراً منظور ہوئی کیونکہ شکنتلا خود بھی اس کے عشق میں کھو گئی تھی۔ دونوں نے گاندھرو رسم کے مطابق شادی کی اور دشینت شکنتلا کو دربار میں بلانے کا وعدہ کر کے اور اسے یادگار کے طور پر ایک انگوٹھی دے کر واپس چلا گیا۔ دریں اثنا شکنتلا نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ شکنتلا دشینت کے دربار میں پہنچی تاکہ راجہ اس کے بیٹے یعنی دشینت ہی کے بیٹے کو تخت کا جانشین بنائے۔ دشینت شکنتلا کو سرے سے ہی بھول چکا تھا اور اس نے اسے پہچاننے سے سراسر انکار کیا۔ شکنتلا نے ثبوت کے طور پر دشینت کی ہی دی ہوئی انگوٹھی اسے دکھانی چاہی لیکن یہ دیکھ کر اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ انگوٹھی غائب تھی۔ دراصل یہ انگوٹھی شکنتلا کی انگلی سے نہاتے وقت دریا میں گر گئی تھی۔ شاہی محل میں دشینت اور شکنتلا کے درمیان گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک مچھیرا حاضر ہوا اور انگوٹھی پیش کرتے ہوئے راجہ سے کہا کہ اسے ایک مچھلی کا پیٹ چیرتے وقت یہ ہاتھ لگی ہے۔ راجہ نے انگوٹھی اور شکنتلا دونوں کو پہچان لیا اور محل میں اسے رانی بنا کر اور بیٹے کو تخت کا جانشین قرار دے کر خدا کے حضور سربسجود ہوا۔

کالیداس نے تمام ہم عصر سنسکرت نگاروں اور اس سے پہلے کے تخلیق کاروں پر اس لحاظ سے سبقت حاصل کی ہے کہ وہ اپنے مصور قلم سے باریک ترکتوں اور ایسی چیزوں کی شاندار تصویر کشی کرتا ہے جن پر دوسروں کی نظر نہ پڑی ہو۔ وہ فطرت کے الگ الگ رنگوں کی جادوگری میں محو ہو جاتا ہے اور پھر اس وجدانی کیفیت کو اپنے قلم کی مصوری سے مزین کرتا ہے۔ اس کے مشہور ترجمہ کار آرتھر ڈبلیو رائڈر نے اسی لیے کہا ہے کہ کالیداس کا مقام نہ صرف اناکریون، ہوریس اور شیلے کے ہم پلہ ہے بلکہ وہ سوفوکلیز، ورجل اور ملٹن کا بھی ہم نشین ہے۔ اور جرمن شاعر اور ڈرامانویس گوئٹے نے اپنے یہ اشعار کالیداس کو نذر کیے ہیں:

تم خواہ بہار کے خوبصورت پھولوں کا ذکر کرو\
یا خزاں کے رس بھرے میووں کا\
یا اُن اشیا کا جو روح کو وجد میں لاتی ہیں\
اسے آرام پہنچاتی ہیں اور شادماں کرتی ہیں

یا تم ہر اس شے کو ایک ہی نام دو
جو زمین و آسمان میں موجود ہے
اس کا بس ایک ہی نام ہوگا۔ شکنتلا۔
بس یہی کافی ہے۔

ورجل کی اینیڈ

ورجل (BC 70) لاطینی شاعروں کا ملک الشعرا تھا۔ اس کی اینیڈ (Aeneid) کو اطالوی ادبیات میں ایک الہامی صحیفے کا رتبہ حاصل ہے۔

ورجل 15 اکتوبر 70 قبل مسیح کو اطالیہ کے مانتوا مقام پر پیدا ہوا اور وہ عمر میں آگسٹس سے سات سال بڑا تھا۔ ورجل کی جوانی کے دنوں میں جولیس سیزر روم کا بادشاہ تھا جس نے ورجل کو اپنے دربار میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس کی کوئی مصدقہ وجہ اگرچہ معلوم نہیں لیکن یہ اغلب ہے کہ ورجل سیزر سے عمر میں تیس سال چھوٹا تھا اور بادشاہ وقت نے اسی لیے اسے دربار شاہی میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا۔ اڑتالیس قبل مسیح میں جولیس سیزر کے خلاف بغاوت ہوئی اور مارچ 44 قبل مسیح میں اسے دردناک طریقے سے قتل کیا گیا۔ ورجل کے مداح شہنشاہ آگسٹس نے اس بے انصافی کی تلافی کی جب اس نے ورجل کو درباری شاعر کی جگہ کا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ اینیڈ کو ایک عظیم قومی ورثے کی شکل میں دور دور تک شہرت بخشوانے کا بھی اعلان کیا گیا۔

سیزر یعنی قیصر روم کے دل دہلانے والے قتل کے بعد روم کی حالت بے حد دگرگوں ہوئی اور ملک زوال پذیر ہونے کی دلیز تک جا پہنچا۔ عوام کے دل و دماغ میں بھی فکری خلفشار، ذہنی ہیجان اور مایوسی نے گھر کر لیا تھا اور اس پریشان کن صورت حال نے آگسٹس کو بھی ملول کر دیا۔ اس کے مغموم دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی شاعر کے قلم سے ایک ایسا شاہکار تخلیق کروایا جائے جسے پڑھ کر ہزیمت زدہ رومیوں کے حوصلوں کے بجھتے ہوئے چراغ پھر سے روشن ہوں۔ یہ مقصد پورا کرنے کے لیے اس نے ورجل ہی کو منتخب کیا جو اس کا منظور نظر تھا اور ورجل ہی کے قلم سے تخلیق شدہ یہ عظیم رزم نامہ اسے روم کی ذہنی نجات کا مظہر دکھائی دیا۔ اینیڈ کو مکمل کرنے میں ورجل کو سالہا سال لگے۔ کبھی کبھی وہ ایک دن میں صرف ایک شعر موزوں کر پاتا تھا۔

اینیڈ اصل میں وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں ہومر کی ایلیاڈ کا اختتام ہوتا ہے۔ ورجل کے رزمیہ میں تباہ شدہ ٹرائے کا ایک نڈر سپاہی اینیاس جان بچا کے روم سے اپنی جنگی مہمات پر نکلتا ہے۔ ورجل نے اینیاس کے انہی کارناموں کے تانے بانے سے روم کی عظمت رفتہ کو بحال کر کے اسے حیات جاودانی بخشنے کا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اگر یہاں پر ہومر کی ایلیاڈ اور ورجل کی اینیڈ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ہومر نے اپنے رزمیہ میں ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو پڑھنے سے زیادہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں اس کے برعکس جب ورجل نے اپنا ادبی شاہکار تخلیق کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس کی نظروں میں روم کے اعلیٰ درجے کے لوگ اور پڑھے لکھے قاری تھے۔ اس طرز تحریر نے اگرچہ اینیڈ کو ادبی معیار کے لحاظ سے مقابلتاً بہتر شکل دی ہے لیکن مقبولیت میں ایلیاڈ دوسری ہر تخلیق یا تصنیف پر سبقت لے جاتی ہے۔

اطالوی شاعر دانتے Dantes نے اپنے فکری رہنما ورجل کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

تم وہی ورجل ہو گر بہتا ہوا چشمہ شیریں
جہاں سے کلام کے دھارے ابلتے ہیں
جو لہریں مارتے ہیں
تم تو وہی ورجل ہو
جو دوسرے شاعروں کے لیے روشنی کا مینار ہے
تم میرے استاد اور پیارے سخن گو ہو

فردوسی کا شاہنامہ

شاہنامہ، حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی 940-1020 AD پارس کی وہ قدیم داستان ہے جو فارسی زبان میں دنیا کا طویل ترین رزمیہ کہلاتا ہے۔ 'بادشاہوں کی کتاب' نامی پچاس ہزار ابیات پر مبنی یہ شعری کارنامہ فردوسی نے اپنی عمر کے تیس سے زیادہ سال میں قلم بند کر لیا تھا۔ لیکن اسے کیا علاوہ وجائے خود ایک دردناک واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہنامہ بادشاہ وقت محمود غزنوی 971-1030 کے دور میں تخلیق ہوا جب غزنوی نے فردوسی کو دربار میں بلا کر پارس کی شان رفتہ کو نظم کرنے کی درخواست اس کے سامنے رکھی اور خود ہی یہ پیش کش بھی کی کہ وہ شاعر کو ایک ایک شعر کے عوض ایک ایک اشرفی عطا کرے گا تو فردوسی نے تیس سال تک خون پسینہ ایک کر کے اور آنکھوں کا خون جلا کر بالآخر شاہنامہ مکمل کر ہی لیا۔ یہ عظیم الشان شاہکار فردوسی نے 977 اور 1010 کے درمیان مکمل کر لیا اور اسے کئی ممالک یعنی پارس، افغانستان، تاجکستان اور ساری فارسی داں دنیا میں قومی رزمیہ قرار دیا گیا:

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

(میں نے ان تیس برسوں میں بہت تکلیف اٹھائی۔ لیکن اسی فارسی (شاہنامہ) سے عجم کو دوبارہ زندہ کر دیا)

فردوسی خوشی خوشی اپنے عظیم کارنامے کا مسودہ لے کر دربار شاہی میں چلا گیا جہاں یہ سن کر اس کے دل کو زبردست ٹھیس لگی کہ بادشاہ اپنے وعدے سے مکر گیا تھا اور وہ ایک شعر کے لیے ایک اشرفی دینے سے منکر ہوا۔ فردوسی عالم مجبوری میں خاموشی سے دربار سے نکلا۔ بادشاہ اس کے بعد اس اضطراب میں مبتلا ہوا کہ اس نے فردوسی کے ساتھ سراسر بے انصافی کی ہے۔ اس نے ایک قاصد کے ہاتھوں ساری کی ساری رقم فردوسی کے ہاں روانہ کی۔ قاصد جب شاعر کے گھر کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔

مشرق میں فارسی زبان نے ادبیات کو کئی عدیم المثال شہ پاروں سے مالا مال کیا ہے جن میں مثنوی رومی، دیوان حافظ، گلستان اور بوستان، رباعیات عمر خیام وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ان میں شاہنامہ اس وجہ سے ایک منفرد فن پارہ مانا جاتا ہے کہ اس میں فردوسی نے قدیم ایران کو ادبی، ثقافتی اور تاریخی لحاظ سے ساری دنیا کے کینوس پر نمایاں کیا ہے۔

شاہنامہ میں بہت حد تک ایران کے دیومالائی اور کسی حد تک اس کے قدیم تاریخی ماضی کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس میں دنیا کے آغاز سے لے کر اسم عصر تاریخ کے کئی حکایاتی اور حقیقی واقعات کا بیان ہے جن سے وابستہ کردار رستم، سہراب، شیرزاد، پرویز، اردشیر، بہرام، نوشیرواں، سام، نریمان آج بھی ہمارے معاشرے میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

عام اتفاق ہے کہ ایران میں فردوسی کے درجے کا کوئی شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ انوری ان شعرا میں ہے جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

رزمیہ شاعری کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کی یہ رائے ہے۔ "رزمیہ شاعری کے کمال کی چند شرائط ہیں۔ واقعہ ایسا معظم بالشان ہو جس نے دنیا کی تاریخ میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو لڑائی کے ہنگامے کا بیان اس زور و شور اور پر رعب طریقے سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں۔ معرکہ جنگ کے تمام ساز و سامان اور آلات و اسلحہ جنگ تفصیل سے بیان کیے جائیں۔ سالار فوج اور مشہور بہادر کی لڑائی کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤں پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں۔ شاعری کے انواع میں رزمیہ شاعری بہترین انواع ہے۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے۔ اس کا کارنامہ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے۔ مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں، وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے اور اگر ان دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دی جا سکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہے"۔

دانتے کی 'ڈوائن کامیڈی'

دانتے (1265-1321 AD) عیسوی سنہ کے 1263 سال بیت چکے تھے اور چوتھواں سال اگست کے مہینے تک پہنچا تھا کہ اٹلی کے شہر فلورنس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ لوگ ششدر ہو کر رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے آسمان پر ایک ایسا دم دار ستارہ دیکھا جس نے دم

ذہن میں آکاش سے لے کر زمین تک ایسی روشنی پھیلائی کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تابناک ہوا۔ عوام نے قیاس آرائیاں کیں کہ کچھ بڑا ہونے والا ہے مگر بزرگوں نے یہ بشارت دی کہ اس شہر میں ایک بہت بڑا شخص جنم لے گا۔ چند ماہ بعد یعنی 1265 میں مئی کے آخر میں دانتے پیدا ہوا۔ اس کا نام ڈانٹے الگھیری رکھا گیا مگر بعد میں وہ دانتے ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ ڈانٹے جب نو سال کی عمر کو پہنچا تو وہ ایک محفل میں سات سالہ بیٹرس پر عاشق ہوا جو بعد میں اس کے خوابوں کی ملکہ اور خیالوں کی تحریک بن گئی۔ نو سال بعد اس نے اس ملاقات کا بیان ایک تخلیق لاجواب میں ان الفاظ میں قلم بند کیا۔ "اس دن وہ بہترین رنگ کا پوشاک پہن کر آئی تھی۔ لاجوردی رنگ کا بانکا اور بے حد دل نشین۔ سچ پوچھو تو کہوں کہ اس لمحے میرے روم روم میں اس شدت سے تھرتھراہٹ پیدا ہوئی کہ میرے جسم کے ہلکے نبض بھی جلنے لگے اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں میری زبان سے یہ الفاظ نکلے:

دیکھو اس آقا کو جو میری طرف آ رہا ہے
وہی میرا حاکم بن جائے گا۔

دانتے اور بیٹرس کا یہ عشق چند سال تک قائم رہنے کے بعد اس وقت منطقی نتیجے کو پہنچا جب بیٹرس کی شادی شہر کے ایک رئیس سے ہوئی۔

فلورنس میں جب اقتدار کے پجاریوں نے سفید اور کالے کے نام پر خانہ جنگی اور افراتفری کا بازار گرم کیا تو ڈانٹے شہر سے دور ایک پرسکون جگہ پر رہائش پذیر ہوا لیکن اس کی غیر حاضری میں کالوں نے اس پر مقدمہ چلایا اور یہ سزا تجویز ہوئی کہ اسے پھانسی دی جائے یا اگر وہ واپس آیا تو اسے زندہ جلایا جائے۔ یہ سزا بہر حال عمل میں نہیں لائی جا سکی کیونکہ جب ڈانٹے کو اس کا پتہ چل گیا تو اس نے دوبارہ فلورنس کی سر زمین پر قدم نہیں رکھا۔ جلا وطنی کے دوران ہی ڈانٹے کو ڈوائن کامیڈی Divine Comedy لکھنے کا خیال آیا۔ جس نے بعد میں اسے اٹلی کے ملک الشعرا کا درجہ بخشا۔

ڈوائن کامیڈی تین حصوں یعنی جہنم، اعراف اور جنت پر مشتمل ہے۔ یہ شاہکار دانتے کے تصوراتی سفر پر مبنی ہے جس میں وہ ان تینوں مابعد حیات جگہوں کا سفر اختیار کرتا ہے اور اس سفر کے دوران ایسی بے شمار تاریخی ہستیوں کے ساتھ ملاقات کر کے ان پر اپنی تنقیدی یا توصیفی رائے ظاہر کر کے آگے بڑھتا ہے۔ اس سارے سفر میں ڈانٹے کا رہبر ورجل ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کے نقاد ڈانٹے کی یادداشت پر حیران ہیں کہ اس کے ذہن میں اتنے نام موجود تھے۔ ڈوائن کامیڈی کا مطالعہ کرنے کے بعد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا کہ "نئی دنیا کو صرف دو ہستیوں نے آپس میں بانٹا ہے اور وہ ہیں ڈانٹے اور شیکسپیئر۔ تیسرا کوئی ان کا شریک نہیں۔"

دانتے اپنے ایک مراسلے میں ڈوائن کامیڈی کے تعلق سے لکھتا ہے کہ "اس کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں رہنے والوں کو دکھوں اور مصائب کی حالت سے نکال کر مسرت اور سرور کے عالم میں سرفراز کیا جائے۔" حقیقت بھی یہی ہے کہ ڈانٹے کی وفات کے فوراً بعد یہ تخلیق سارے روم میں گھر گھر

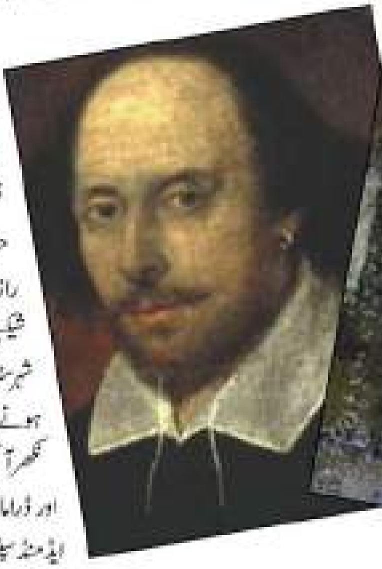

پڑھی جانے لگی اور اسے قومی وراثت کا درجہ نصیب ہوا۔ کٹر عیسائیوں نے تو اسے ایک مذہبی صحیفے کا درجہ دیا کیونکہ اس میں عیسائیت کی زوردار تبلیغ کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے تئیں جنگ آمیز زبان سے کام لیا گیا تھا۔ کارلائل نے بھی ان مداحوں کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا کہ "ڈوائن کامیڈی جیسی مقدس کتاب لکھ کر ڈانٹے نے قوم میں روحانیت اور نیک اعمال کی بہترین صفات پیدا کیں۔"

اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب ڈانٹے واپس وطن لوٹا تو وہاں کی خواتین نے سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہا "دیکھو! یہ وہی ہے جو دوسری دنیا میں چلا گیا تھا اور وہاں سے مُردوں کی خبر لے کر آیا ہے۔"

انیس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد ڈانٹے نے اپنی جائے پیدائش سے دور راوینا کے شہر میں آخری سانس لی۔ ڈانٹے کی وفات کے پانچ سو سال بعد لارڈ بائرن اس کی قبر پر گیا اور وہی بائرن، جو اپنی زندگی میں زندوں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، اس مقبرے کے سامنے جھک کر ایک نومولود بچے کی طرح زار زار رونے لگا۔

شیکسپیئر کا ہیملٹ

ولیم شیکسپیئر AD 1616 -1464 دنیا کا عظیم ترین ڈرامہ نگار مانا جاتا ہے۔ اس کے سینتیس ڈراموں میں ہیملٹ کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی جسے اس برطانوی شاعر کے بے مثال المیہ شاہکار کا رتبہ حاصل ہوا۔

شیکسپیئر کی شخصیت دنیا میں گوناگوں کمالات کے ساتھ متعارف ہوئی۔ وہ ایک شاعر ہی نہیں تھا جس نے ڈراموں میں بھی بہترین سخن گوئی کا مظاہرہ کیا بلکہ اس کے ڈرامے کئی قدیم ممالک کی تاریخی، ثقافتی اور حکایاتی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ کئی نقادوں کا خیال ہے کہ اسی خداداد صلاحیت کی بنا پر اس فن کار پر غالباً سب سے زیادہ تعداد میں کتابیں اور تحقیقی اور تنقیدی مقالات لکھے گئے۔ علامہ اقبال نے اس طرح اس رازدان اسرار فطرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

شیکسپیئر کی پیدائش اگرچہ انگلستان کے شہر سٹرات فورڈ میں ہوئی لیکن لندن منتقل ہونے کے بعد اس کی ادبی اور فنی صلاحیتیں نکھر آئیں جب اس کی ملاقات کئی ادیبوں اور ڈرامہ نویسوں کے ساتھ ہوئی جن میں ایڈمنڈ سپنسر، تھامس گرین، جارج چیپمین، کرسٹوفر مارلو، بین جانسن اور فلیچر شامل تھے۔ یہاں ان فن کاروں کی وساطت سے اور ان کی صحبت میں وہ 1592 تک ایک اچھا ڈرامہ نگار بن چکا تھا۔ اپنی عمر کے تیسویں سال یعنی 1594 میں ملکہ برطانیہ الزبتھ نے اسے دربار میں اداکاری کرنے کی دعوت دی۔ ملکہ اس کے فن اور اس کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئی اور شیکسپیئر کو مناسب انعام سے نوازا۔ ملکہ کا شکریہ شاعر نے اپنے ڈرامے 'وسط گرما کی شب کا خواب' میں کیا ہے۔

لندن میں بیس سال گذارنے کے بعد شیکسپیئر 1607 میں واپس سٹرات فورڈ آیا۔ اس دوران وہ دور و نزدیک مشہور ہو چکا تھا اور مالی لحاظ سے بھی آسودہ حال ہو چکا تھا۔ لندن میں اس کی صحت بگڑ گئی تھی اور پھر دنیائے فن و ادب کا یہ لافانی معمار 23 اپریل 1616 کو خالق حقیقی سے جا ملا۔

شیکسپیئر نے کل سینتیس (37) ڈرامے لکھے جنھیں المیہ، طربیہ، رومانوی اور تاریخی اصناف ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان سبھی میں اسے ہیملٹ کے لیے سب سے زیادہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ پانچ سو سال گزرنے کے باوجود یہ ڈرامہ آج بھی

دنیا بھر کے اسٹیج پر اور تھیٹروں میں کھیلا اور پسند کیا جاتا ہے۔

ہیملٹ مختصراً ایک بے رحم اور خود غرض بھائی کی کہانی ہے جس نے تخت و تاج کا مالک بننے کی خاطر اپنے فرشتہ صفت بھائی کو قتل کیا، اس کی بیوی کو پھسلا کر اس کے ساتھ شادی کر لی اور پھر بادشاہت پر قبضہ جمایا۔ مقتول بادشاہ کی مضطرب روح اپنے بیٹے ہیملٹ کو اس جرم کا بدلہ لینے کی تاکید کرتی ہے۔ ظالم بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ہوتی ہے تو وہ ہیملٹ کی محبوبہ اوفیلیا کے بھائی لائرٹیز کو ہیملٹ کے خلاف ورغلا کر ان دونوں کے مابین لڑائی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لڑائی میں ہیملٹ زہر بھری تلوار کی ضرب سے مر جاتا ہے اور جان دیتے ہوئے اپنے بدبخت چچا کی بھی جان لیتا ہے۔

شیکسپیئر کے ڈراموں کا خام مواد یونانی، لاطینی، برطانوی دیو مالا اور تاریخ اور بائبل سے ماخوذ ہے جسے شیکسپیئر نے اپنے فنی کارانہ کمال سے نئے معنی اور نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

گوئٹے کا فاؤسٹ:

عیسوی سنہ کے 1749ویں سال میں 28 اگست کی دوپہر ڈھل رہی تھی کہ جرمنی کے شہر فرانکفورٹ میں اٹھارہ سالہ ایلزبتھ کے یہاں ایک بے حس سا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مر چکا ہے۔ بقول تھامس مان۔ "یہ ایسی کیفیت تھی کہ جیسے یہ نومولود ماں کی گود سے نکل کر سیدھا زمین کی گود میں چلا جائے گا۔" لیکن اس کے روئی کے گالے جیسے جسم میں رفتہ رفتہ حرکت ہونے لگی۔ بعد میں تھامس مان نے اسی بچے کے بارے میں کہا۔ "کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ادبی شخصیت کی بلندی اور شان کن سرحدوں کو چھو لے گی۔"

یہ تھا یوہان وولف گانگ وان گوئٹے جو وقت گزرنے کے ساتھ نہ صرف سرزمین المانیہ کا بلکہ سارے یورپ کا ایک ممتاز اور عدیم المثال شاعر، ڈرامانگار، فلسفہ دان، انشا پرداز اور ناول نویس بن گیا اور ان فنون لطیفہ میں اس نے اپنے فنی کمال کے موتی بکھیرے۔ یہ ساری خصوصیات اس میں اس وجہ سے سرائیت کر گئی تھیں کہ اس کا تاریخ اور تہذیبوں کا مطالعہ وسیع تھا۔

گوئٹے کے سبھی ادبی کارناموں میں اس کا لافانی شاہکار فاؤسٹ سرفہرست ہے۔ اس تخلیق میں شاعر نے فاؤسٹ کے کردار کو نیکی اور بدی کی دیرینہ لڑائی کے حوالے سے بے حد پُراسرار انداز میں پیش کیا ہے۔

فاؤسٹ اپنی ہوسناک زندگی کے لیے ہر طرح کی سرشاریاں اور شادمانیاں حاصل کرنے کو دیوانگی کی حد تک بے قرار ہے اور اپنی ان دنیوی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ شیطان کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے جس پر وہ اپنے خون سے دستخط کرتا ہے۔ لیکن آخر کار فتح الوہی صداقت اور ابدی انسانیت ہی کی ہوتی ہے۔ علامہ اقبال ان الفاظ میں اس ڈرامے کی تعریف و تحسین کرتے ہیں۔ "اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

مولوی عبدالقیوم خان باقی، جنھوں نے فاؤسٹ کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے، بھی کم و بیش اقبال ہی کی تائید کرتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ "فاؤسٹ میں قدرت کی دو متضاد قوتوں

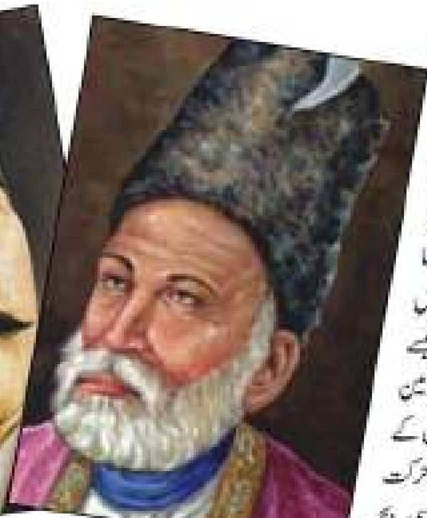

کی کشمکش ہے جس کی ایک حد شیطان اور دوسری حد انسان ہے۔ اس کشمکش میں قدرت دنیا کی سب سے بڑی نیکی یعنی عشق کے ذریعے مداخلت کرتی ہے۔

گوئٹے نے بیاسی سال کی لمبی عمر پائی۔ فاؤسٹ کا کردار اس دوران سالہا سال تک اس کے تحت الشعور میں کروٹیں لیتا رہا۔ جب وہ بیس سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے اس ڈرامے کے پہلے حصے کا آغاز کیا اور اسے اکیاون سال کے بعد مکمل کیا۔

فاؤسٹ کی کہانی دراصل جرمنی کا ایک تخیلاتی قصۂ پارینہ ہے جو سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ اگرچہ سالہا سال تک لوگوں کے پاس سے گزرتی ہوئی یہ کہانی متن اور معنی کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً کئی تبدیلیوں سے گزرتی رہی لیکن اس کے مرکزی کردار فاؤسٹ کے ساتھ عوام کی دلچسپی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سولھویں صدی میں اسے کرسٹوفر مارلو نے انگریزی زبان میں ڈھالا جو مقامی طور پر بہت مشہور ہوا۔

گوئٹے کے نہایت دلچسپ اور تذبذب سے بھرپور ڈرامے کی کہانی کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

گوئٹے ایک مضطرب اور ذہنی طور پر بے قابو افسانوی کردار کا نام ہے جس نے تمام رائج الوقت علوم اور فنون کی مکمل آگاہی حاصل کی ہے۔ اس کے باوجود وہ تشنہ کام اور نامکمل وجود ہی رہا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کی پیاسی روح پر جنسی وحشت کا غلبہ تھا اور وہ اس جسمانی خواہش کو ہر قیمت پر اور ہر طرح سے مسلسل پورا کرنے کے لیے ہمیشہ مضطرب رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی دنیوی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اس نے اپنی روح شیطان کے ہاتھ میں گروی رکھ دی۔ کہانی یوں ہے:

گوئٹے اپنے کمرے میں بیٹھا ہے اور ہزار طرح کے افکار میں گھرا ہوا ہے۔ دریں اثنا ایک روح کمرے میں داخل ہوتی ہے جس کے ساتھ گوئٹے کی تلخ کلامی کے بعد روح وہاں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اگلے روز گوئٹے الجھنوں و پریشانیوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ابھی وہ زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگانا ہی چاہتا ہے کہ باہر سے ایسٹر کا گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ خودکشی کا ارادہ ترک کرتا ہے کہ اس کے بعد ایک کتا اس کا پیچھا کرتا ہے۔ جو اپنی شکل بدل کر شیطان کی صورت میں گوئٹے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس نے گوئٹے کی دکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ وہ اس ہوس پرست شاعر کو ہر طرح کی لذتوں سے محظوظ کرنے کی یقین دہانی کر کے اس کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے۔ معاہدہ کی رو سے گوئٹے جو چاہے وہ اسے ملے گا البتہ اگر وہ کسی بھی موقعے پر وقت کی طرف مخاطب ہو کر اس سے کہے: "اے وقت کے خوبصورت لمحے! ذرا ٹھہر!" تو شیطان اسی وقت آ کر اس کی روح قبض کرے گا اور اسے جہنم کی گہرائیوں میں دھکیل دے گا۔ گوئٹے نے شیطان ہی کے بہکاوے سے آتش کدہ عشق کے دہکتے ہوئے انگاروں کو بجھانے کے لیے اپنی محبوبہ مارگریٹ کو ہوس کا شکار بنایا اور جب وہ حاملہ ہوئی تو سماج میں ملعون ہونے کے ڈر سے اس نے اپنے نوزائیدہ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس جرم کی پاداش میں اسے جیل جانا پڑا جہاں وہ زندگی کی ویرانیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر بیٹھی۔ دنیا کی تمام خوشیوں، لذتوں اور مرادوں کی منزلیں طے کرنے کے بعد

ایک دن گوئٹے ایک بے حد خوبصورت شام کو ایک دلکش نظارہ دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

اے دور بھاگتے ہوئے لمحے ذرا ٹھہر!

شیطان فوراً اس پر جھپٹ کر اس کی جان لینا چاہتا ہے مگر اسی لمحے خدا شیطان سے یہ کہہ کر گوئٹے کو اپنے پاس بلاتا ہے کہ یہ حسین لمحہ تم نے نہیں بلکہ میں نے اسے دیا تھا اور اس طرح اس کی روح پر میرا ہی حق رہا۔ شیطان! تم ہار گئے!!

مجھے لگتا ہے کہ گوئٹے کے تذکرے کو ہائنے کے اس اقتباس پر ختم کیا جائے کہ: ''گوئٹے ایک آتشیں روح ہے جو ایک عقاب کی طرح اپنے پروں کو پھیلاتی ہوئی نامعلوم بلندیوں کی طرف دور، دور تک اڑتی ہی چلی جا رہی ہے، اڑتی ہی چلی جا رہی ہے''۔

'دیوان غالب':

دیوان مرزا اسد اللہ خان غالب (1796-1869 AD) کو اردو شاعری کی آبرو مانا جاتا ہے۔ اس زبان کے اولین شاعر محمد قلی قطب شاہ سے لے کر عہد جدید تک اردو کی دنیائے سخن کی شاندار عمارت اس کے چار ستونوں پر مستحکم ہے جن میں میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اگر چہ کئی اور سیکڑوں شعراء نے سالہا سال تک اردو شاعری کی آبیاری کی مگر روشنی کے ان چار میناروں کے نور سے سبھی کی آنکھیں خیرہ ہوتی رہیں۔ شہرہ آفاق تصنیف 'تاریخ ادب اردو' کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے غالب کو ''آسمان شاعری کا سب سے درخشندہ تارا، استاد کامل اور فلسفی شاعر قرار دیا ہے''۔

غالب نے اس وقت آنکھ کھولی جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی۔ انہی دنوں انگریزوں نے مغلوں کو شکست دے کر 1857 کی بغاوت کے ساتھ ہی ملک پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو بزور بازو اپنی نوآبادی بنانے کے لیے ہزاروں فرزندان وطن کا خون بہایا اور بڑی بے رحمی سے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا۔ غالب بھی اس شہر آشوب سے غافل نہ رہا اور اس نے اس بیرونی جارحیت کے خلاف اس طرح اپنے محسوسات کو زبان دی۔

غالب کو ایک بد اقبال کہلائے جانے پر فخر تھا۔ اسے ایک بار جوا کھیلنے کی پاداش میں جیل جانا پڑا۔ مغلوں کے دربار میں اسے مرزا نوشہ کہا جاتا تھا۔ ایک بار جب اس کے سامنے کسی نے خدا دوست شاعر شیخ صہبائی کے کلام کی تعریف کی تو غالب بولا۔ ''صہبائی کیسے شاعر ہو سکتا ہے؟ اس نے کبھی شراب کا حظ نہیں اٹھایا نہ ہی اس نے جوا کھیلا۔ نہ ہی اسے عاشقوں نے چپلوں سے پیٹا اور نہ ہی اسے کبھی جیل جانا پڑا۔''

غالب کی وفات 15 فروری 1869 کو دلی میں ہوئی۔

1850 میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے غالب کو دبیر الملک اور نجم الدولہ کے اعزازات سے نوازا۔ مغل دربار میں غالب کو شاہی مورخ کی جگہ بھی دی گئی۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اسے اگر چہ اپنی فارسی سخن گوئی پر ناز تھا مگر دنیائے ادب نے اسے فقط ایک عظیم اردو شاعر کی حیثیت میں جانا اور پہچانا۔ وہ خود کہتا ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

غالب نے جس منفرد انداز میں اپنے گھر کی دنیا بھر کی اور قلب و نظر کی باتوں کو خاص طور پر اپنی غزلیات کا موضوع بنایا

غالب نے اس وقت آنکھ کھولی جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی۔ انہی دنوں انگریزوں نے مغلوں کو شکست دے کر 1857 کی بغاوت کے ساتھ ہی ملک پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو بزور بازو اپنی نوآبادی بنانے کے لیے ہزاروں فرزندان وطن کا خون بہایا اور بڑی بے رحمی سے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا۔ غالب بھی اس شہر آشوب سے غافل نہ رہا اور اس نے اس بیرونی جارحیت کے خلاف اس طرح اپنے محسوسات کو زبان دی۔

ہے وہ اسی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ وہ ماحول میں رونما ہونے والے ہر واقعہ کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور اس کے رد عمل میں روائی، تغزل، ترنم اور معنی آفرینی سے بھرپور اشعار تخلیق کرتا ہے جو دم زدن میں ہر ایک کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ اچھی شاعری کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ سننے والے یا قارئین اسے یاد رکھ سکیں۔ غالب کی شاعری کو یہ وصف بھرپور طریقے سے نصیب ہوا ہے کہ اس کے جتنے اشعار لوگوں کو زبانی یاد ہیں اتنی خوش بختی کسی اور اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔

غالب پر قلم اٹھایا جائے تو لاتعداد کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور اس کے اشعار کا انتخاب بھی مشکل ہے۔ میں یہاں اپنی پسند کے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں جو اس تحریر کا اختتام بھی ہوگا۔ ان اشعار کو منتخب کرتے وقت یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ان میں غالب کی خیال آرائیوں کی کسی حد تک عکاسی کی جائے:

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
تھا خواب میں خیال کو دل سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے
چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ٹالسٹائی کا 'وار اینڈ پیس'

'جنگ اور امن' روس کے سب سے بڑے ادیب لیو ٹالسٹائی (1828-1910) کے اس افسانوی شاہکار کا نام ہے جسے دنیا کا طویل ترین ناول کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ٹالسٹائی نے خود اسے نہ تو ناول کہا ہے، نہ ہی نظم اور نہ ہی اسے تاریخ کی صنف بتایا ہے بلکہ وہ اپنے دوسرے ناول 'اینا کرینینا' کو اپنا صحیح ناول قرار دیتا ہے۔ اس دعویٰ کے حق میں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ ''روس کا بہترین ادب بھی معیار کے مطلوبہ تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے''۔

'جنگ اور امن' کی کہانی کا تانا بانا ٹالسٹائی نے روس پر فرانس کے حملے اور زار کی حکومت پر نپولین کے قبضے کے مابعد اثرات سے بنا ہے۔ اس کی پوری کہانی اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ اسے ایک مضمون میں سمیٹنا مشکل ہے۔ 'جنگ اور امن' ناول پہلے مکمل متن کے ساتھ 1869 میں منظر عام پر آیا۔ امریکی جریدے نیوز ویک نے 2009 میں اسے سو بہترین کتابوں کی فہرست میں اولین مقام پر رکھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹالسٹائی کی بیوی صوفیہ ٹالسٹایا نے اس کے سات مسودوں کو نقل کرنے کا صبر آزما کام کیا اور اس کے بعد ہی

اسے قابلِ اشاعت قرار دیا گیا۔

ناول کا محلِ وقوع ٹالسٹائی سے کوئی ساٹھ سال قبل کا ہے جسے مصنف نے 'ہمارے آباؤ اجداد کا زمانہ' کہا ہے۔ ٹالسٹائی نے اس تخلیق کے لیے دستاویزی مواد جمع کرنے کی غرض سے ان لوگوں سے بھی بات کی تھی جو 1812 میں روس پر فرانس کے حملے کے دوران بقیدِ حیات تھے۔ ناول میں اگرچہ کئی فرضی کرداروں کا ذکر ہے البتہ ان میں سے کم از کم 160 ایسے ہیں جو درحقیقت موجود تھے۔

'جنگ اور امن' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی غیر معمولی طوالت کے باوجود قارئین نے اسے ذوق وشوق سے پڑھا اور روس کے علاوہ جرمنی اور فرانس میں بھی اس کی مانگ روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ جنگ اور امن کے کشمیری ترجمہ کار مظفر عازم کے بقول۔ "ٹالسٹائی کے فن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخیل کی پرواز سے زیادہ زندگی کی حقیقت کے مشاہدے کو اپنے مواد کی شکل میں استعمال کرتا ہے۔" وہ زندگی کے نقوش کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اس کی اندرونی کیفیت کے خدوخال کو پرکھنے کا کام بھی بیک وقت کرتا ہے۔ اس سے اسے اپنی تخلیقات کے کرداروں کی نفسیاتی اور فکری سوچ کی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی آگاہی کا مظاہرہ ٹالسٹائی 'جنگ اور امن' میں اس طرح کرتا ہے کہ جنگ کی تباہیوں کے باوجود ایک عام گھرانہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کسی قسم کا خلل داخل ہونے نہیں دیتا اور جہاں باہر سے آتش و آہن کا طوفان بازار گرم تھا یہ گھرانہ اپنی مصروفیات میں مگن تھا اور اس طرح سے فلسفیانہ نظریے سے امن ہی بالآخر جنگ پر فتح حاصل کرتا ہے۔ جان گالزوردی کا کہنا بجا ہے کہ "کسی بھی زمانے میں لکھے گئے ناولوں میں 'جنگ اور امن' سب سے اوپر براجمان ہے۔"

اقبال کا 'پیامِ مشرق':

'پیامِ مشرق' اردو کے سب سے متنوع اور ہمہ جہت شاعر علامہ اقبال 1938 - 1877 کی ساری تصانیف میں اہم ترین اور عظیم ترین مجموعہ کلام ہے۔

جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر گوئٹے جب عمر کے آخری ایام میں مغرب کی مادہ پرستی اور انسانی اقدار کے تنزل سے بیزار ہو چکا تھا اور وہ اپنے درماندہ وجود کو کسی مختلف ماحول میں منتقل کرکے سکون، اطمینان اور آسودگیِ قلب کے دن گذارنے کا خواہاں تھا۔ اسی ذہنی انتشار اور جذباتی ہیجان کے عالم میں اس نے یہ قطعہ لکھا تھا:

North and West and South are breaking,
Thrones are bursting, kingdoms shaking:
Flee then, to the essential East,
Where on Patriarch's air you'll feast.

انھی دنوں یعنی 1812 میں جوزف وان ہیمر پرگستال نے حافظ شیرازی کے فارسی دیوان کا جرمن زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کے مطالعے نے گوئٹے کے ذہن میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اسے اس مشرقی دیوان میں خیال اور فلسفے کی نئی دنیا جلوہ گر دکھائی دی۔ حافظ کا گہرا اثر قبول کرنے کے بعد اس نے کئی ایسی منظوم تخلیقات کو جنم دیا جن کے خالق کے بارے میں گمان ہوتا تھا کہ وہ مشرق ہی میں پیدا ہوا ہے۔ گوئٹے نے اسی اثر کے تحت 'دیوانِ مغربی' لکھا جس میں کئی اسما اور نظموں کے عنوانات بھی عربی یا فارسی زبانوں میں ہی درج ہیں۔ مثال کے طور پر ساقی نامہ، زلیخا، ہجر و پارسی نامہ، مغنی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ اور خلد نامہ شامل ہیں۔

موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے کہا جائے گا کہ یورپی

> **اقبال 'پیامِ مشرق' کے سرورق پر خود اسے 'درجوابِ شاعر المانوی گوئٹے' کہتا ہے۔ جہاں اسرائیل کا مشہور شاعر ہائنے کہتا ہے کہ "یہ مجموعہ عقیدت کا ایک گل دستہ ہے جسے مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے" وہاں گوئٹے کے ایک سوانح نگار بیل سوشکی حافظ اور گوئٹے کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "بلبل شیراز کے نغموں میں گوئٹے کو اپنی تصویر نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کی روح نے حافظ کے پیکر میں رہتے ہوئے مشرقی سرزمین میں زندگی گذاری ہے۔**

ریاست جرمنی سے گوئٹے کے اس مختلف رنگ اور آہنگ کے دیوان کا مشرقی ادبیات کو ایک پیش بہا تحفہ اقبال کے سب سے اہم اور معتبر فارسی مجموعہ کلام پیامِ مشرق کی صورت میں حاصل ہوا جس کی تصنیف کے محرکات کو اقبال نے خود بیان کرتے ہوئے گوئٹے کی مشرق نوازی کے پس منظر کو اس طرح واضح کیا ہے۔ 'پیامِ مشرق کا مدعا جو مغربی دیوان کے سو سال بعد لکھا گیا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں جو ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون ہے جسے قرآن نے **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم** کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِنظر رکھنے کی کوشش کی ہے"۔

اقبال 'پیامِ مشرق' کے سرورق پر خود اسے 'درجوابِ شاعر المانوی گوئٹے' کہتا ہے۔ جہاں اسرائیل کا مشہور شاعر ہائنے کہتا ہے کہ "یہ مجموعہ عقیدت کا ایک گل دستہ ہے جسے مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے" وہاں گوئٹے کے ایک سوانح نگار بیل سوشکی حافظ اور گوئٹے کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "بلبلِ شیراز کے نغموں میں گوئٹے کو اپنی تصویر نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کی روح نے حافظ کے پیکر میں رہتے ہوئے مشرقی سرزمین میں زندگی گذاری ہے۔ وہی رنگین مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی اور بردباری، وہی جوش اور حرارت، وہی مشرب کی عظمت اور شان، وہی کشادہ دلی اور وہی پابندیوں اور رسوم و رواج سے آزادی۔ مختصر یہ کہ اسے کئی لحاظ سے حافظ کا ہم رنگ پایا جاتا ہے۔ حافظ کی طرح گوئٹے بھی لسان الغیب اور ترجمانِ اسرار ہے۔ دونوں نے اپنے دور کے امیر و غریب کو متاثر کیا۔ دونوں نے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو بھی متاثر کیا اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں اپنی پرانی ترنم ریزی کو جاری رکھتے ہوئے طبیعت کے اطمینان اور سکون پر غالب رہے۔"

ایک جگہ اقبال گوئٹے کو اپنے محبوب شاعر غالب کا ہم پلہ دیکھ کر اس سے کہتا ہے:

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

گوئٹے کی تعریف و تحسین میں اقبال کا ایک اور شعر ہے:

صبا بہ گلشنِ ویمر سلامِ ما برسان
کہ چشم نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

اسی طرح اقبال نے گوئٹے کی عظمت کو مولانا روم کی زبان سے بھی تسلیم کیا ہے جب گوئٹے جنت میں مولانا رومی کو حکیم فاوسٹ کا قصہ سناتا ہے تو رومی اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

فکرِ تو در کنجِ دل خلوت گزید
ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیرِ گوہر دیدۂ

Ghulam Nabi Khayal, 15-Rawalpora Housing Colony, Srinagar - 190005 (Kashmir)

نجمہ رحمانی

ظفر کی شاعری میں ہندوستانی رنگ

اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اردو میں غزل کی روایت فارسی سے آئی۔ مگر غزل کی اس روایت پر ہندوستانی رنگ کے سائے اس کی ابتدا سے ہی پڑنے شروع ہو گئے، جس کی مثالیں دکن کے ابتدائی شعرا کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس صنف پر ہندوستانی اثرات کا ذکر عموماً قلی قطب شاہ اور ولی کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے قبل غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی ہندوستانی زبان ہی نہیں بلکہ معاشرے کی جھلکیاں بھی خوب خوب نظر آتی ہیں۔ دکن میں حسن شوقی اور قلی قطب شاہ سے ہوتی ہوئی یہ روایت ولی دکنی تک پہنچتے پہنچتے تین سو سال مکمل کر کے استحکام حاصل کر چکی تھی۔ ولی کے کلام میں ہندوستانی مزاج نے جو رنگ آمیزی کی اس کی خوبصورت مثالیں دیوان ولی میں بکھری ہوئی ہیں۔

اس رین اندھاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے جھانجر کی جھنکار سناتی جا
کاجل نین کا دیکھ کے بولے ہیں یوں جادوگراں
عشاق کی تسخیر کوں یو سحر بنگالہ ہوا
نین دیول میں پتلی یو ہے یا کعبہ میں اسود ہے ہرن کا
یو ہے نافہ یا کنول بھیتر بھنور دستا

ایہام گو شعرا اور اس کے بعد عہد میر بھی فارسی مزاج سے قریب تر ہونے کے باوجود ہندوستانی رنگ روپ سے عاری نہیں۔ خاص طور سے میر کے یہاں تو اس رنگ کا رنگ ہی کچھ اور ہے کہ یہاں ماحول ہی نہیں قدم قدم پہ محاورہ بھی وہ استعمال ہوا ہے کہ سننے والے کا دل نکال لے جائے:

یاد جب آتی ہے وہ زلف سیاہ
سانپ سا چھاتی پہ پھر جاتا ہے
ہائے اس کے شربتی لب سے جدا
کچھ بتاشا سا گھلا جاتا ہے جی
گردش رو سیر کی کیا کیا بلائیں آئیں
جانے ہی کے ہیں گلشن سارے اس آسماں کے
داغوں کی نظم اس کے بٹنے میں جس نے دیکھی

پھر موتیوں کی لڑ پر ان نے کبھو نہ تھوکا

مگر عہد غالب تک آتے آتے یہ روایت کمزور پڑتی نظر آتی ہے۔ 1857 کے آس پاس کی دلی کی ادبی فضا غالب، مومن، ذوق اور آشفتہ اور آزردہ کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ مگر یہ آوازیں میر اور اس سے قبل دکنی غزل کی اس روایت سے مختلف تھیں جنھوں نے مقامی رنگ کو اردو غزل کا محبوب رنگ بنا کر پیش کیا۔

ان تمام آوازوں میں ایک آواز جو سب سے جدا رنگ رکھتی ہے، بہادر شاہ ظفر کی ہے۔ اس الزام کے باوجود کہ انھوں نے ذوق، ناسخ اور نصیر کی تقلید کی، یہ آواز غزل کی ہندی روایت کی پاسداری کرتی نظر آتی ہے۔ اس میں کچھ دخل تو مغلیہ سلطنت کے اس ہندوستانی سلسلے کا ہے جسے اسلم پرویز صاحب نے ہندوستانی مغل مزاج کہا ہے اور کچھ شاہ عالم ثانی کے ورثے کا جس کے بارے میں مولانا امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے کہ

"اکبر کے عہد سے مغل بادشاہوں کے محل میں ہندو رانیاں راج کر رہی تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قلعے سے مذہبی تعصب ختم ہو گیا شاہ عالم ہندو ماں کے بیٹے تھے ہولی، دوالی بسنت سب کچھ مناتے تھے اور ان تہواروں کی تمام رسمیں برتتے تھے۔ نادرات شاہی کی مختلف نظمیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عید بقر عید آخری شنبہ اور عرسوں سے ہولی دوالی وغیرہ کا اہتمام کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔"

ظفر نے اپنی زندگی کے اکتیس سال شاہ عالم کے ساتھ گزارے۔ خود ظفر کے عہد سلطنت میں قلعے میں یہ تمام تہوار پورے اہتمام کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ غالباً یہ شاہ عالم کی صحبت اور قلعے کے ماحول کا اثر تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے کلام کا بڑا حصہ مقامی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ نہ صرف زبان و ماحول بلکہ اصناف سخن میں بھی ظفر نے مروجہ اصناف کے ساتھ ساتھ ٹھمری، دوہے، خیال اور قوالیوں وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ نوائے ظفر میں خلیل الرحمن نے ظفر کی ہولی بھی شامل کی ہے جو ان کے ایام اسیری کی یادگار ہے:

گوئن کے گلال بیچ توہن کی پچکاری
آئے رہی سگری کلمہ پہ ایسی تک تک ماری
شور دنیا میں مچوری
ہند میں کیسو پھاگ مچوری جوا جوری
اور اس کے ساتھ یہ بھجن

ہیم اگن نت موہے جرائے یا کا بھید کہوں کا سے
پی ہو پاس تو جی ہو ٹھنڈا اپنی بپتا کہوں واسے

ظفر اپنے عہد کے واحد اردو شاعر تھے جنھوں نے شوق رنگ کے تخلص اردو کے ساتھ پنجابی اور بھاکا زبان میں شعر کہے:

کوئی نہیں غم خوارا ساڈا اکھاں کس دی نال
شوق رنگ اپنے رب سوں کہیے جو ہے اپنا حال
کیسا بھلا کیسی برچھی، کیا بچھوا تلوار
اس دے نچ نگاہوں کا ہے میڈے دل پہ وار
یہ منوا مورکھ لوبھی سب ہی پر للچاوے ہے
چاتر ہو تو اس مورکھ کو جیسے بنے سمجھاؤ جی
کوئی کسی دا میت نہیں سب اپنی غرض دے میت شو
ق رنگ اچھا کیتا ہم نے کی نہ کسی سے پیت
کس دا اپنا دھیان لگا ہے کائی نہیں ہے پاس
رباں سائی سوچ وچ اپنی ٹوٹی جاندی آس

ظفر جس اردو زبان میں شاعری کر رہے تھے وہ قلعۂ معلی کی زبان تھی جو لفظ قلعے سے نکلتا وہ سند ہو جاتا اس سلسلے میں

مولوی عبدالحق کا یہ اقتباس بہت اہم ہے جسے ظفر کی زبان اور ان پر ہوئے اعتراضات کے تعلق سے تقریباً تمام ناقدین ظفر نے نقل کیا ہے۔

"ایک بار ظفر اور ذوق پر بحث چھڑ گئی اور وہی پرانی بحث پھر سے دہرائی گئی کہ ظفر کے سب دیوان ذوق کے لکھے ہوئے ہیں سید صاحب اس پر بہت چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ وہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعے کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آ گئی۔"

اور یہ زبان اس فارسی آمیز زبان سے خاصی مختلف تھی جس کے زیر اثر مومن و غالب کا سکہ چل رہا تھا غالب کے یہاں تو ڈھونڈنے سے بھی ایسے اشعار کا ملنا مشکل ہے جن پر ہندوی مزاج کا اثر ہو۔ ظاہر ہے جس شخص کو اپنی فارسی پہ ناز اور ہندی گوئی پر ندامت ہو اس سے ہندی رنگ کو اختیار کرنے کی امید کیسے کی جا سکتی ہے؟ مگر ظفر کے یہاں یہ گلکاریاں خوب گل کھلاتی ہیں:

نہیں معلوم کہاں آج مچائی ہولی
آئے ہے رنگ میں وہ رشک گلستاں بھیگا
رخسار سرخ زلف سیہ فام کے تلے
پھولی ہے ایک طرف شفق شام کے تلے
زلف یوں روئے عرق آلودہ پر لہرائے ہے
صبح جو ناگن گلوں پر چاٹنے اوس آئے ہے
ہماری زردی رخسار ہے بہار بسنت
ہمارے رنگ سے ہے رنگ اعتبار بسنت
کیا ہی باندھی ہے تری چشم نے اشکوں کی جھڑی
کبھی ایسا نہ برستے ہوئے بادل دیکھا
اشک کے قطرے لیے جاتے ہیں بھر بھر کر سبو
جوش گریہ نے مری آنکھوں کو پنگھٹ کر دیا
پڑے گلال جو ہولی میں اس کی پلکوں پر
تو جانو ڈوبے ہیں خوں میں کسی شکار کے تیر

اردو غزل میں آرائش محبوب کے سلسلے میں زلف و کاکل و گیسو سو سو رنگ سے باندھے گئے مگر ظفر کے ہندوستانی محبوب کی آرائش زلف کے ضمن میں محبوب کا جوڑا کیسے باندھا گیا ہے یہ بھی دیکھتے چلیں:

جب کہ پیچ پیچ نے سر پر گوندھ کے باندھا جوڑا
دل نے جانا آج مسلّم پیچ کے اوپر پیچ پڑا
کھول مت جوڑا کہ سودائی کا ترے سر بسر
راز سربستہ ترے سر کی قسم کھل جائے گا
شمشیر برہنہ مانگ غضب، آنکھوں کی چمک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا، بالوں کی مہک پھر ویسی ہے

اور ہندوستانی مزاج پر ہی کیا موقوف قلعے کی زبان اور محاورہ دلی کا استعمال ظفر نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ ان کے ہم عصروں کے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ دلی کی ٹکسالی زبان اور محاورے کی مثالیں ان کے یہاں بغیر کسی کوشش کے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ٹکڑوں پر پلنا اور ٹکڑا توڑ جواب دینا دلی کے عام محاورے رہے ہیں۔ پرانی نسل کے لوگ اب بھی گاہے بگاہے انھیں استعمال کر لیتے ہیں۔ اب دیکھیے ظفر نے کیسے ایک ہی شعر میں دونوں محاوروں کا بخوبی استعمال کر لیا ہے:

دیتے ہیں توڑ کے ٹکڑا سا مجھے صاف جواب
اے ظفر کھا کے پلے جو مرے ٹکڑے گھر کے

چاٹ لگنا بھی دلی کی ٹکسالی زبان میں خوب استعمال ہوتا تھا:

دل کو کیا چھوڑنے کا غم ہے، چاٹ اس کو لگ گئی
یہ چٹورا دیکھنا جائے گا سارے گھر کو چاٹ
بوسہ ہائے لب شیریں کی جسے چاٹ لگے
اس کا مائل نہ ہو سوئے شکر و قند مزاج

دہلوی تہذیب کی موت کے ساتھ یہ زبان بھی اب تقریباً متروک ہو گئی ہے۔ شعر و ادب تو کجا اب شاہجہانی دلی کے گلی کوچوں میں سننے کو نہیں ملتی۔ البتہ اس مرحوم ٹکسالی زبان کے آثار کلیات ظفر کے صفحات پر تلاش کیے جا سکتے ہیں:

ہند مغل تہذیب کا پروردہ خاندان تیموریہ کا یہ آخری بے کس سلطان اس گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ تھا جسے آج ہم مسخ شدہ شکل میں صرف اخبارات اور تاریخ کی کتابوں میں پاتے ہیں۔ وقت کے سیل رواں میں ہر شے بہہ جاتی ہے بجز ان چیزو ں کے جنھیں فنون لطیفہ زمانے کی دست برد سے بچا کر رنگوں، پتھروں اور کاغذوں کے دل میں محفوظ کر لیتے ہیں کہ آنے والی نسلیں اپنے اجداد کی میراث ڈھونڈنے نکلیں تو تہی دست نہ لوٹیں۔

کہتے ہیں جس کو وہ لعل لب کہ دیکھو یہ بہار
پنکھڑی گل کی بھی لالوں لال ہم سی ہو گئی
الٰہی خیر ہو بگڑا گیا ہے قاصد واں
قبول دے نہ کہیں مار دھاڑ میں کاغذ
جلے پھنکے مرا مضمون سوز دل پڑھ کر
کہے ہے پھینکو پرے ایسا بھاڑ میں کاغذ
آتی ہے دل میں صاف وہ صورت نظر جو عشق
دکھلاتا اپنی آئینہ سازی ذری سی ہے
تو حسین جتنا ہے کاہے کو پری اتنی ہے
حسن بھی کچھ ہے تو کب عشوہ گری اتنی ہے
جس رات ٹھہری آنے کی اس پری وش کے یاں
گھر کا مرے چراغ سر شام جل پڑا

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ پر پیچ قافیوں اور طویل و مشکل ردیفوں میں غزلیں کہتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے اس کلام پر شاہ نصیر اور ذوق کا رنگ غالب ہے۔ مگر اس رنگ کے ہلکے گہرے سائے ظفر کے اپنے ہیں۔ شاہ نصیر کا یہ شعر:

سدا ہے اس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو تک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

اور اس کے بعد ظفر کا یہ شعر دیکھیے:

ذرا جبین عرق نشاں پر تو اپنی افشاں دکھا دے چن کر
کہ تا نظر آئیں ماہ پیکر، زمیں کو ہر فلک پہ اختر

نیاز فتح پوری نے ظفر کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:

"عام طور پر ظفر کی شاعری کو سوز و گداز کی شاعری سمجھا جاتا ہے۔ میں اس کو یکسر اس صفت سے خالی پاتا ہوں۔ میرے خیال میں ظفر پیدا ہوا تھا جرأت کے رنگ کی مادی شاعری کرنے کے لیے اور اگر زمانہ مخالفت نہ کرتا تو وہ اس رنگ کا بے مثال شاعر ہوتا۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ ان کی مشکل زمینوں اور ردیفوں میں کہی گئی غزلیں خاصی دل چسپ، شگفتہ اور برجستہ ہیں۔ جن میں سنگلاخی کے بجائے ایک قسم کی شوخی اور شرارت صاف نظر آتی ہے:

ہم بھی رکھتے ہیں زباں منہ کو سنبھالو اپنے
گالیاں دے کے پچاک بوسے پہ دس اچھی بس
الٰہی محتسب سنگدل کے ٹوٹیں ہاتھ
کہ توڑتا ہے یہ جام و سبو تڑاق پڑاق
جو ایک بات کہوں تو جواب میں اس کے
سنائے سو مجھے وہ تند خو تڑاق پڑاق
گلی میں اس کی ہے قاصد ہجوم غیروں کا
سنبھالے رکھیو ذرا بھیڑ بھاڑ میں کاغذ

ہند مغل تہذیب کا پروردہ خاندان تیموریہ کا یہ آخری بے کس سلطان اس گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ تھا جسے آج ہم مسخ شدہ شکل میں صرف اخبارات اور تاریخ کی کتابوں میں پاتے ہیں۔ وقت کے سیل رواں میں ہر شے بہہ جاتی ہے بجز ان چیزوں کے جنھیں فنون لطیفہ زمانے کی دست برد سے بچا کر رنگوں، پتھروں اور کاغذوں کے دل میں محفوظ کر لیتے ہیں کہ آنے والی نسلیں اپنے اجداد کی میراث ڈھونڈنے نکلیں تو تہی دست نہ لوٹیں۔ ظفر کے کلام کو ایک مجبور شہنشاہ کی شاعری کے علاوہ دہلوی تہذیب کی تاریخ کی حیثیت سے بھی پڑھے جانے کی ضرورت ہے۔

■

Najma Rahmani, Dept. of Urdu, Delhi University, Delhi - 110007

منظر عباس

اردو کے ہندو مرثیہ گو

اردو کے جن ہندو شعرا نے اردو شاعری کو اعتبار بخشا، ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے۔ یہ طویل فہرست ان کوتاہ بینوں کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں جو اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں اور جنھوں نے ایک زمانے میں اردو کو صرف ایک تہذیب سے جوڑ کر اسے ملک کی تقسیم کی بنیاد بنانے کی کوشش کی تھی۔ اردو کے ان ہندو شعرا کی اعلیٰ ظرفی اور وسیع المشربی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی عقیدوں اور رجحانات کا خود مسلمانوں سے بھی زیادہ خیال رکھا۔ ذرا اردو میں مرثیہ کہنے والے ہندو شاعر بخشی الملک راجہ الفت رائے لکھنوی کا مطالعہ کر کے دیکھیے جن کا تعلق اودھ یعنی لکھنؤ سے تھا۔ آپ فن مرثیہ کو عروج دینے والے مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ مرثیہ پڑھتے بھی تھے اور کہتے بھی تھے۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے پاس ان کے مرثیوں کا مجموعہ موجود ہے۔ پیش ہے ان کے مرثیے سے ایک بند:

اکبر نے ارادہ جو کیا ملک عدم کا
اور قصد کیا گلشن ہستی سے ارم کا
تغییر ہوا حال شہنشاہ امم کا
بے کس یورش ہونے لگا لشکر غم کا
تھی شاق جدائی جو بہت نور نظر کی
بیتاب تھے سیماب سی حالت تھی جگر کی

مہاراجہ کشن پرساد ریاست حیدرآباد دکن کے اس زمانے کے وزیر اعلیٰ تھے۔ آپ شاعر بھی تھے اور ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ متعدد مرثیے آپ نے کہے جن میں بھرپور سوز و گداز پایا جاتا ہے:

پہلے مسلم کو کیا قتل مسلمانوں نے
ہائے کیا ظلم کیا جان کے نادانوں نے
گھر کو برباد کیا گھر کے نگہبانوں نے
قافلہ لوٹ لیا مل کے حدی خوانوں نے
کمر اب ٹوٹ گئی شاہ کی طاقت نہ رہی
جب ہر اول نہ رہا شاہ کی طاقت نہ رہی

ہندو شعرا کی شاعری میں بھی شخصیت اور کردار نمایاں ملتا ہے اور وہ اپنی عقیدت کا اظہار اپنے علم و ہنر سے کسی شاعر سے کم نہیں کرتے ہیں۔ قدیم ہندو مرثیہ گو شعرا میں سیوا سری کشن داس، بالاجی ترمبک زرہ، سوامی پرشاد اصغر، منشی چھنو لال دلگیر لکھنوی شامل ہیں۔ دلگیر اپنے عہد کے مستند مرثیہ گو استاد مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس فن کو آگے بڑھانے کے لیے ہر وقت کوشش کی اور کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اپنے کئی شاگرد بھی چھوڑے ہیں۔ ان کے مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ کریں:

ظہر تک جب مر چکے سب اقربا شبیرؑ کے
اور رہا کوئی نہ میداں میں سوا شبیرؑ کے
اک قلم ڈوبے لہو میں جاں فدا شبیرؑ کے
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے سب اقربا شبیرؑ کے
دل میں اپنے ٹھان کر عزم شہادت کو امام
خیمہ اقدس میں آئے سب سے رخصت کو امام
پھر کیا شہ نے لباس کہنہ اپنے زیب تن
اس کے اوپر آپ نے پہنا مکلف پیرہن
یوں لگا زینبؑ سے کہنے یادگار پنجتن
آخری پوشاک بھی بھائی کو پہنا دو بہن
آج تم کو آخری بھائی کی رخصت ہے ضرور
اے بہن اس امر میں بھائی کی خدمت ہے ضرور

کالی داس گپتا رضا ایک ماہر غالبیات، ادیب اور وقت کے بہترین شاعر تھے۔ امامؑ عالی مقام حضرت امام حسینؑ شہید کربلا سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔ یہ ہمیشہ ہی آقا حضرت امام حسینؑ کا دم بھرتے تھے۔ ان کے مرثیہ کہنے کا انداز ہی نرالا تھا۔ ان کے مرثیہ کا بند ملاحظہ فرمائیں:

ہر طرف فوج عدو کے دل نظر آنے لگے
موت کے بادل سرور زیست پر چھانے لگے
ساز بھائی کے سارے تار تھرانے لگے
وہ حسینؑ ابن علیؑ باطل سے ٹکرانے لگے
اک طرف چھوٹا سا کنبہ ہے مجسم فکر و غور
اک طرف فوجوں کا پرچم انتہائے جبر و جور

ہندو شعرا کی ایک لمبی فہرست قدیم زمانے کی ہے۔ اس میں سادھو رام آرزو سہارنپوری کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے امام عالی مقام کے صبر اور رضا جوئی کے پہلو پر کس عقیدت اور خلوص سے روشنی ڈالی ہے ملاحظہ فرمائیں:

آفریں صد آفریں اے فاتح خیبر کے لال
آج دنیا پیش کر سکتی نہیں تیری مثال
روح کانپ اٹھتی ہے جب بھی تیرا آتا ہے خیال
حشر تک رویا کریں گے اب تجھے ماضی و حال
مٹ نہیں سکتے کبھی معصومیت کے تذکرے
تیری ہستی کے تری مظلومیت کے تذکرے
اللہ رے یہ شان یہ رتبہ حسینؑ کا
خود صانع ازل بھی ہے شیدا حسینؑ کا
اس درجہ کر دیا سر انسانیت بلند
احسان بھلا سکے گی نہ دنیا حسینؑ کا
اے آرزو ازل سے ہوں تقدیر کا دھنی
پروردہ مرتضیٰ کا ہوں بندہ حسینؑ کا

راجہ رگھو بیر سرن دواکر امروہوی کا نام تعارف سے بے نیاز ہے۔ مرثیہ میں ان کے پرخلوص اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آپ کیوں تسلیم کرتے بیعت دست یزید
آپ کی نظروں میں تھی روز سیہ باطل کی عید
گفتگوئے صلح کی پا کر نہ گنجائش مزید
ہو گئے اہل نظر کے تیر و خنجر سے شہید
آپ نے اسلام کے پرچم کو اونچا کر دیا
الغرض انسانیت کا بول بالا کر دیا

دلو رام کوثری کا شمار اچھا مرثیہ کہنے والوں میں ہوتا ہے:

قرآن اور حسینؑ برابر ہیں شان میں
دونوں کا رتبہ ایک ہے دونوں جہان میں
کیا وصف ان کا ہو کہ ہے لکنت زبان میں
پیہم صدا یہ غیب سے آتی ہے کان میں
قرآں کلام پاک ہے شبیرؑ نور ہے
دونوں جہاں میں دونوں کا یکساں ظہور ہے

ہندوستان کے ماضی کے ہندو شعرا کی لمبی فہرست مرتب ہے جس میں مشہور و معروف شخصیت جناب وشوناتھ ماتھر لکھنوی بڑے محب اہل بیت تھے۔ آپ نے مرثیہ، منقبت، قطعات، رباعیات، سلام ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور فن کو معراج کی منزل پر پہنچایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

کہتے تھے خود رسولؐ کہ بیٹھا ہوں قبلہ رو
مجھ سا مرے حسینؑ کو پاؤ گے ہو بہو
عادات میں کہیں نہیں ہے فرق مو بہ مو
دیکھو مرے حسینؑ میں میری ہر ایک خو
میں خود کو دیکھتا ہوں تو ہوں سر بسر حسینؑ
آئینہ درمیاں ہے ادھر میں ادھر حسینؑ

لالہ رام پرشاد بشیر، افتخار الدولہ راجہ میوہ رام کے بھتیجے تھے۔ سلام اور مرثیہ کہتے تھے۔ بڑے شیدائے اہل بیت تھے۔ کربلائے معلی کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ آپ مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ ان کا کلام ملاحظہ ہو:

بے چین تھی صغریٰ جو فراق پدری سے
نت اٹھ یہی کہتی تھی نسیم سحری سے
اے باد صبا مری یہ دردِ جگری سے
کہیو جو ملے تو مرے بابا سفری سے
نرگس کی طرح چشم سوئے در نگراں ہے
جلد آؤ کہ ہستی کا چمن صرف خزاں ہے

اردو کے سکھ شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی کا ذکر کیا جائے تو ان کے یہ شعر بطور خاص یاد آتے ہیں:

زندہ اسلام کو کیا تو نے
حق و باطل دکھا دیا تو نے
جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے
مر کے جینا سکھا دیا تو نے

چھمن پرساد چھمن کہتے ہیں:

کیوں کر کہیں کہ صرف ہمارا حسینؑ ہے
جس دل سے پوچھیے اسے پیارا حسینؑ ہے
جس نے یزیدیت کا سفینہ ڈبو دیا
چھمن وہ انقلاب کا دھارا حسینؑ ہے

کرشن بہاری نور لکھنوی کا نام دنیائے اردو ادب میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ ہندو شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری کی وجہ سے صف اول کے شعرا میں ان کا مقام ہے۔ ان کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

اے مرکزِ ایماں زندہ باد اے صبر کے پرچم زندہ باد
ہر اشک ٹپک کر کہتا ہے شبیر ترا غم زندہ باد
ہر قوم میں ماتم ہوتا ہے، شبیر کا غم یاد آتا ہے
دل کھنچتے ہیں سب کے تیری طرف اے ماہِ محرم زندہ باد
ہندو ہو کہ مسلم یا مومن جلووں سے نظر تک ہی نہیں
اے شمعِ حقیقت زندہ باد، اے نورِ دو عالم زندہ باد

کرشن گوپال وہ شاعر ہیں جن کے کلام دلوں کو چھو لیتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

غیر مسلم ہیں شریکِ غم مسلمانوں کے ساتھ
آج ہمدردی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ

بنارسی لال ورما ایک قادر الکلام شاعر تھے ان کی اردو ادب میں بے پناہ دلچسپی تھی ان کی شاعری غنائی ادب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

آپ تاریخ کا مطالعہ کرتے جائیں دیکھیں گے کہ اردو سے ہی صرف ہندوؤں کو لگاؤ نہیں ہے بلکہ اہلبیت سے محبت بھی ہے اور زمانے کو بتاتے ہیں اس ہندوستان میں ہمیں اردو سے اسلام سے قرآن سے اہلبیت سے بھی بہت ہے۔ ہندو شعرا کے علاوہ گرونانک، زرتشت عیسائی اور دیگر مذاہب، فرقہ کے معتبر شعرا کا کلام اردو میں موجود ہے۔ آخر میں ایک مسیحی اردو شاعر کے کلام پر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ یہ موج زیبانی کے نام سے مشہور تھے اور اردو سے از حد محبت رکھتے تھے۔

اپنا کوئی مرتا ہے تو روتے ہو تڑپ کے
اور سبطِ پیمبر کا کبھی غم نہیں کرتے
ہمت ہے تو محشر میں پیمبر سے بھی کہنا
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

اندرجیت گاندھی نے اردو سے جو محبت دکھائی ہے وہ قابل بیان ہے۔ انھوں نے ہر فن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کے اشعار جن میں انھوں نے اپنی عقیدت شہدائے کربلا سے دکھائی ہے:

روتے ہیں لوگ سن کے شہادت حسینؑ کی
ہے دردناک سب سے حکایت حسینؑ کی
میدانِ کربلا میں رہِ حق میں جان دی
ہے سب سے بے مثال شہادت حسینؑ کی
ہرگز نہ ہوگا اب رہِ باطل پر گامزن
گاندھی کو مل گئی ہے قیادت حسینؑ کی

جناب چندر شیکھر سکینہ مرادآبادی کا شمار ہندوستان کے مشہور و معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کو اردو سے بہت زیادہ محبت ہے۔ انھوں نے وہ طبع آزمائی کی ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کا کلام ہندوستان کے مشہور و معروف ادبی اور مذہبی جریدوں میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے۔ اردو سے اور حضرت امام حسینؑ سے ان کی جو بے پناہ محبت ہے اس کی کوئی مثال نہیں ہے:

نہ دولت لے کے آیا ہوں نہ حشمت لے کے آیا ہوں
عبادت کی نہ سجدوں کی ہی کثرت لے کے آیا ہوں
خدا پوچھے گا بخشش کیوں ہو پھر تیری تو کہہ دوں گا
میں وہ ہندو ہوں جو شہہ کی محبت لے کے آیا ہوں

دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

حسینؑ بس یہ تمنا رہی ہے شیکھر کی
وہ کاش ہوتا ترا ہم رکاب مقتل میں

میں کہاں تک ہندو شعرا کا تذکرہ کروں ان کو اردو سے جو لگاؤ ہے مذہب اسلام سے محبت ہے اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ محبت اردو سے دکھائی ہے۔ اور اس کے ساتھ اسلام سے قرآن سے اہلبیت سے یہ محبت دکھا کر اس بات کو واضح کر دیا کہ ہندوستان میں اردو زبان بہت شیریں زبان ہے اور ہندو ہو کر اسلام سے قرآن اور اہلبیتؑ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔

آپ تاریخ کا مطالعہ کرتے جائیں دیکھیں گے کہ اردو سے ہی صرف ہندوؤں کو لگاؤ نہیں ہے بلکہ اہلبیت سے محبت بھی ہے اور زمانے کو بتاتے ہیں اس ہندوستان میں ہمیں اردو سے اسلام سے قرآن سے اہلبیت سے بھی بہت ہے۔

ہندو شعرا کے علاوہ گرونانک، زرتشت عیسائی اور دیگر مذاہب، فرقہ کے معتبر شعرا کا کلام اردو میں موجود ہے۔ آخر میں ایک مسیحی اردو شاعر کے کلام پر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ یہ موج زیبائی کے نام سے مشہور تھے اور اردو سے از حد محبت رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی اہلبیت سے وہی اُنس ملتا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں ہے:

ہر ایک کی زبان پہ نامِ حسینؑ ہے
یعنی بہت بلند مقامِ حسینؑ ہے
مطلق نہ رائیگاں گیا ابنِ علی کا خون
اسلام آج زندہ بنامِ حسینؑ ہے
یہ آسماں شہادتِ اکبر کا ہے گواہ
سرخی شفق کی سرخیِ شامِ حسینؑ ہے
کیوں کر نہ تیرے دل میں ہو عظمت حسینؑ کی
اے موج تو بھی ایک غلامِ حسینؑ ہے

■

Manzar Abbas C/o Peyare Lal, Mohalla: Daryapur, Post: Bankipur, Distt. Patna - 800004 (Bihar)

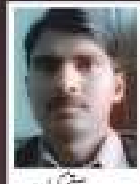

ستیہ کمار

مراثی انیس اور جذبات کے گیارہ رس!

فنون لطیفہ کی تخلیقات میں جذبات کا بہت اہم رول ہے، خصوصاً شاعری جذبات کی کارفرمائی کے بغیر نامکمل ہے۔ اگر شاعری میں جذبات کا عمل دخل نہیں ہے تو یہ تک بندی کے سوا کچھ نہیں۔ شاعر کلام میں جذبات و خیالات کی نقالی اس طرح کرنے کی کوشش کرتا ہے جس طرح کہ یہ انسان کی اصل زندگی میں واقع ہوتے ہیں۔ شاعری میں واقع ہونے والے جذبات یعنی رس کو سنسکرت ادب کے ماہرین نے نو (9) حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(1) سکون (2) غصہ (3) بہادری (4) خوف (5) نفرت و کراہت (گھناؤنا پن) (6) رنج و غم (7) حیرت (8) عشق (9) ہنسی۔

بعض ماہرین علم الجذبات نے جذبۂ طفلانہ اور جذبۂ عبادت کو بھی جذبات شاعری کا حصہ مانا ہے۔ اس طرح کل گیارہ جذبات ہوتے ہیں اور ان جذبات یعنی رس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"شاعری اور ناٹک میں یہی جذبات اپنے اسباب و آثار کی وساطت سے جب ارتقائی مدارج سے گزر کر دائرۂ وجدان میں پہنچتے ہیں تو ایک غیر محدود انبساط اور لذت کا مرکز بن جاتے ہیں جس کا نام رس ہے۔"

(رس یعنی فلسفہ انبساط، مولوی حبیب الرحمن شاستری، ص 2)

اردو مرثیہ کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں مختلف اصناف کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مرثیہ میں مختلف جذبات (مکمل جذبات) کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ یہاں ہم میر انیس کے مراثی میں جذبات اور لہجے کی کارفرمائی پر گفتگو کریں گے۔ جذبات اور لہجے کو جب تک ٹھیک ڈھنگ سے سمجھا نہ جائے یعنی شاعر نے جس جذبے میں ڈوب کر شاعری کی ہے اور جس لہجے میں شعر قلم بند کیے ہیں اگر وہاں تک ہماری رسائی نہیں ہوتی ہے تو شعر فہمی کا حق ادا نہ ہوگا اور نہ ہی ہم اس سے پوری طرح سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ شاعری اور اس میں مستعمل جذبہ یعنی رس سے محظوظ ہونے کے لیے ادراک، فہم اور تاثر بھی لازمی ہے۔

بقول مولوی حبیب الرحمن شاستری:

"کسی کی دردناک آواز سن کر جس کا دل درد سے بھر نہیں آتا اور جس کا قلب جنگل اور پہاڑی سبزہ زاروں اور بہتے دریا کی رواں لہروں کو دیکھ کر سراسر سکون نہیں ہو جاتا، بچوں کی توتلی باتیں اور بھولی بھالی حرکات میں ہمہ تن محو ہو کر جو بچہ نہیں بن جاتا، موسم بہار کی سبزی، کوئل کی کوک، پپیہے کی پکار جسے مست و سرشار نہیں کرتی۔ نیز جس کا دل درد بھرے اور غم آلود مضامین سن کر پارہ پارہ نہیں ہو جاتا وہ رس سے لطف اندوز ہونے کی استعداد نہیں رکھتا۔

ادراک، فہم اور تاثر کی ضرورت صرف رس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ کمال انسانی کے انتہائی مدارج پر پہنچنے کا راز بھی ان ہی دو صفتوں میں مضمر ہے۔ ولیوں کی ولایت، مہاتماؤں اور سوامیوں کے تقدس اور قوم پرستوں کی قوم پرستی کی بنیاد بھی صفات مذکورہ ہی کے سہارے قائم ہے، کیا ایک ولی یا مہاتما کے لیے یہ ممکن ہے کہ جب تک ادراک، فہم کے ذریعے دنیا کی بے ثباتی کا مکمل مفہوم اس کے دل میں نہ پہنچے، اور تاثر کی بدولت مفہوم مذکور سے پورا پورا متاثر نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے ہی دنیا کی بھول بھلیوں سے منہ موڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔" (ایضاً ص 31-30)

مراثی انیس میں مندرجہ بالا جذبات یعنی گیارہ رسوں کا عمل دخل نہایت موثر ہے اور اعلیٰ ذہانت، مہارت، عقیدت مندی اور قابلیت کی دلیل بھی۔

سب سے پہلے ہم مراثی انیس میں شانت رس یعنی جذبۂ سکون پر گفتگو کرتے ہیں۔ سکون کا جذبہ تب پیدا ہوتا ہے جب انسانی دل و دماغ تمام خواہشات دنیاوی سے پاک ہو جاتا ہے، فتنہ و فساد سے بچا جاتا ہے اور حرص و تکبر کے احساسات، دنیا کی بے ثباتی اور بے وقعتی سے آگاہ یعنی جب روح نفس امارہ و لوامہ سے آگے نفس مطمئنہ میں پہنچ جاتی ہے تو وہاں سکون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ سکون کے جذبات جب شاعری میں بیان ہوتے ہیں تو اس شاعری کو پڑھنے کا انداز اور لہجہ بھی خاص ہوتا ہے۔ جب دل و دماغ میں سکون ہوتا ہے تب اس میں سے سکون بھری آواز مناسب لہجے میں نکلتی ہے۔ اور جب غمگینی و مایوسی ہوتی ہے تب اس کا لہجہ اور آواز بہت دھیمی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس خوشی کا لہجہ بہت بلند اور چہکنے والا ہوتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ غمگین آدمی بہت چہک کر بولے اور خوشی سے سرشار بہت دھیمی آواز میں۔ مثلاً جب کوئی لڑکا امتحان میں یا انٹرویو میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دوستوں کے ملنے پر اپنی خوشی کا اظہار بلند آواز میں اونچے لہجے میں کرتا ہے اور جب فیل ہو جاتا ہے تب مایوس کن انداز میں بولتا ہے: "یار میں تو فیل ہو گیا" یہی انداز اور لہجہ شاعری کے پڑھنے میں ہوتا ہے۔ مراثی میں یا شاعری میں موڈ (Mood) کو پہچان کر اسی لہجے اور انداز میں پڑھنے پر شاعری کے بیشتر مطالب خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔

اب جذبۂ سکون کو میر انیس کے مرثیے میں دیکھتے ہیں اور اس کو اسی لہجے میں پڑھتے ہیں۔ مرثیہ لنک نوان تکلم میں جنگ کی شروعات کا موقع ہے۔ دشمن کی فوج جنگ پر آمادہ ہے۔ تیروں کی بوچھار دشمن کی طرف سے حضرت امام حسینؑ کی فوج پر آ رہی ہے۔ حضرت عباسؑ اور ان کے رفقا دشمن کی کارروائی سے جوش میں آ گئے ہیں اور آ کر جناب حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اس وقت آپ فرماتے ہیں:

شہ نے فرمایا مجھے خود ہے شہادت منظور
نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت منظور
جنگ منظور نہ تھی ان سے پر اب ہوں مجبور
تیر لڑ کو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور

ذبح کرنے کے لیے لشکر ناری آئے
کہیں جلدی مرے سر دینے کی باری آئے

ظاہری بات ہے مرثیوں میں اہل بیت بے سہارا اور غربت کی حالت میں تھے۔ تمام بچوں اور خواتین کا تحفظ بھی ایک اہم کام تھا۔ مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب" میں حضرت امام حسین شش ماہی بیٹے حضرت علی اصغر کو گود میں بٹھا کر لطف و کرم فرما رہے تھے کہ اچانک تین پھال کا تیر بچے کی گردن میں آ کر لگ جاتا ہے اور بچہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ اس وقت حضرت امام حسین کا غصہ اور شجاعت قابل دید ہے:

یہ کہہ کے آئے فوج پہ تولے ہوئے حسام
آنکھیں لہو تھیں رونے سے چہرہ تھا سرخ فام
زیب بدن کیے تھے بصد عز و احتشام
پیراہن مطہر پیغمبر انام
حمزہ کی ڈھال تیغ شہ لا فتی کی تھی
بر میں زرہ جناب رسول خدا کی تھی

اب بہادری کے رس کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت امام حسین فرماتے ہیں:

تنگ آئے گا تو رکنے کا نہیں پھر شبیر
ایک حملے میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر
چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ نہ تلوار نہ تیر
کاٹ جائے گی گلے سب کے یہ براں شمشیر
شیر ہوں لخت دل غالب ہر غالب ہوں
میں جگر بند علی ابن ابی طالب ہوں

ایک اور مثال:

گر جم کا نام لوں ابھی تو جام لے کے آئے
کوثر یہیں رسول کے احکام لے کے آئے
روح الامیں زمیں پہ مرا نام لے کے آئے
لشکر ملک کا فتح کا پیغام لے کے آئے
چاہوں جو انقلاب تو دنیا تمام ہو
الٹے زمین یوں کہ نہ کوفہ نہ شام ہو

جذبۂ خوف یعنی بھیانک رس کی تعریف اس طرح ہے:
"وحشت کرنے والی بھیاوتی اور وکٹ گھٹناؤں یا ان کی آشنکاؤں سے من میں ہونے والے آتنک یا بھے سے انبھو ہوتا ہے۔" (ایضاً ص 654)

جری جب میدان جنگ میں جاتا ہے تو اس کے جاہ و جلال، حرکات اور چہرے کی لرزش سے سپاہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

لو پڑھ کے چند شعر رجز شاہ دیں بڑھے
کھینچ کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانند شیر نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے
گویا علی الٹتے ہوئے آستیں بڑھے

جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو
کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو خوب رو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا رگ جاں سے لہو جدا
گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

اب یہاں پانچویں رس یعنی جذبۂ نفرت و اکراہ کو دیکھتے ہیں۔ برے مناظر دیکھنے سے دل میں جو نفرت پیدا ہوتی ہے اسے جذبۂ نفرت کہتے ہیں۔ ہندی لغت کے مطابق:

"ساہتیہ میں نو رسوں میں سے ایک جو رکت، ماس، ہڈی، چربی، مت، شریر آدی (وغیرہ) گندے پدارتھ دیکھ کر یا ان کا ورنن سن کر من میں ہونے والی اروچی (ناپسندیدگی)، گلانی، یا گھن اس کا آشیہ ہوتا ہے۔" (ایضاً ص 830)

قتل و خون، اعضائے بدن کے کٹنے اور مسخ ہونے کے مناظر دیکھنے کی تاب ہر کس و ناکس میں نہیں ہوتی اور اگر کوئی کمزور دل شخص دیکھ لے تو شاید غش کھا جائے۔ مرثیوں میں میدان جنگ کے مناظر قتل و خون ہاتھ، پاؤں، سر کے کٹنے اور بکھرنے کے واقعات کا بیان خوب ہوا ہے۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھاتی چھانی
نیزے پہلو پہ لگائے تھے ستم کے بانی
سر پہ تلواریں چلیں زخمی ہوئی پیشانی
خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخ نورانی
جسم سب چور تھا پرزے تھے زرہ جامے کے
بیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے
ڈھانپ کر ہاتھوں سے منہ بنت علی چلائی

ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی
ضرب اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی
گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی
آنکھ کھولی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
سر اٹھایا تو سر شہ کو سناں پر دیکھا
لکھا ہے تین پھال کا تھا ناوک ستم
منہ کھل گیا الٹ گئی گردن رکا جو دم
کھینچی سری گلے کی طرف سے بہ چشم نم
بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہوئے خم
ابلا جو خون، نکلا ہوا دم ٹھہر گیا
چلو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا

"کرونا رس محبوب شے کے مٹنے اور غیر محبوب کے حاصل ہونے پر پیدا ہوتا ہے۔ اس جذبے کے تحت مرثیے کے بین کے اشعار آتے ہیں۔ بین کے اشعار ہی مرثیہ کے اصل جزو ہیں۔ مرثیہ کے معنی جو میت پہ رونے کے ہیں دراصل وہ یہی حصہ ہے۔ عزیز و اقارب کی دائمی مفارقت انسان کس طرح برداشت کرتا ہے یہ صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس پر گزرتی ہے۔ عزیز کی جدائی زندگی میں انتہائی مایوسی اور ناکامی پیدا کر دیتی ہے۔ اقربا کی جدائی کے غم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسرا غم نہیں ہو سکتا۔ مرثیہ 'عون و محمد' بہ عنوان "جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج" میں حضرت زینب کا بین کسی بھی گداز قلب کو اشک بار کیے بغیر نہیں رہ سکتا:

کیوں کر جلے گا ماں کو تمھارا سراغ ہائے
لوٹا اجل نے حیدرؑ و جعفرؑ کا باغ ہائے
یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے
میرا بڑھاپا اور یہ بچوں کے داغ ہائے
ہے ہے یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے
اماں کی قبر بننے نہ پائی کہ مر گئے

بین کے اشعار میں جذبۂ رنج و غم کے اظہار کے علاوہ میر انیس نے مرثیے کے دیگر اجزا میں بھی دکھ بھرا منظر پیش کیا ہے۔ مثلاً:

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسین پر
ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں والے حسین پر
قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسین پر
یہ دکھ بی بی کی گود کے پالے حسین پر
تیر ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا
لاکھوں میں ایک بے کس و دلگیر ہائے ہائے
فرزند فاطمہ کی یہ توقیر ہائے ہائے
بھالے وہ اور پہلوئے شبیر ہائے ہائے
وہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر ہائے ہائے

خیمے میں تھے جو فوج کے سرکش بھرے ہوئے
خالی کیے حسین پہ ترکش بھرے ہوئے
وہ گرد تھے جو بھاگتے پھرتے تھے وقت جنگ
اک سنگ دل نے پاس سے مارا جبیں پہ سنگ
صدمے سے زرد ہو گیا سبط نبی کا رنگ
ماتھے پہ ہاتھ تھا کہ گلے پر لگا خدنگ
تھا لگا جناب نے ماتھے کو چھوڑ کے
نکلا وہ تیر حلق مبارک کو توڑ کے

جذبۂ حیرت اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی بات خلاف امید واقع ہوتی ہے۔ عام صلاحیت، لیاقت اور کمال سے زیادہ کسی شخص کے باکمال ہونے پر نیز غیر متوقع چیز کے حاصل ہو جانے پر ذہن انسانی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہ مرثیوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ حضرت عون و محمد میدان جنگ میں علم کی خواہش رکھتے ہیں لیکن وہ خواہش کا اظہار نہیں کر پاتے۔ آخرکار ماں سے (جس سے بچوں کو زیادہ قربت ہوتی ہے) اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پردہ ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال
دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ نہیں ملال
ہاں آج ہم کو بھول گئے شاہ خوش خصال
اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال
کیا وارث دلاور جعفر طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

اس غیر متوقع بات پر ماں حیرت زدہ ہو جاتی ہے اور یوں گویا ہوتی ہے:

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا
اب اس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
دیکھو سنیں نہ زوجۂ عباس با وفا
اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا
غصہ نہ اس میں چاہیے جو امر خیر ہو
وارث وہ کون غیر ہے تم کون غیر ہو

جیسا کہ مقالے کے شروع میں لکھ دیا گیا ہے کہ مرثیے میں جملہ اصناف سخن کے اوصاف ملتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری کا بیشتر موضوع حسن و عشق پر محیط ہے۔ بہ قول حالی عشق بہت ارفع و اعلیٰ جذبہ ہے اور یہ کسی کو کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے مرثیوں میں جذبۂ عشق کی کارفرمائی سب سے زیادہ ہے۔ کسی کی شہادت پر غم کے جذبات اور عزیز و اقارب سے جدائی کی تکالیف تب تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس عزیز و اقارب سے شدید محبت نہ ہو۔ اس طور سے جدائی اور عشق و محبت کے جذبات سنگار رس کے تحت آتے ہیں اور او پر ہم کرون رس کے تحت جدائی کے جذبات کا بیان کر چکے ہیں یہاں صرف عشق کے جذبات کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مرثیہ "جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج" میں حضرت عون و محمد کے درمیان کس قدر محبت تھی، یہ دیکھنے کے لیے درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں:

طفلی سے آج تک نہ ہوئے یہ کبھی جدا
کھیلے تو ایک گھر میں پلے یہ تو ایک جا
چرچا ہے سارے کنبے میں دونوں کے پیار کا
ہیں ایک جان دو قالب یہ مدعا
تڑپے ملاپ کو جو خفا ہو کے بھائی سے
وہ کس طرح جیے گا جدا ہو کے بھائی سے

بھگتی اور واتسلیہ کو ماہرین علم الجذبات نو رسوں کے علاوہ دو رس مزید مانتے ہیں تو کیوں نہ ان کی مثالیں بھی مرثیوں

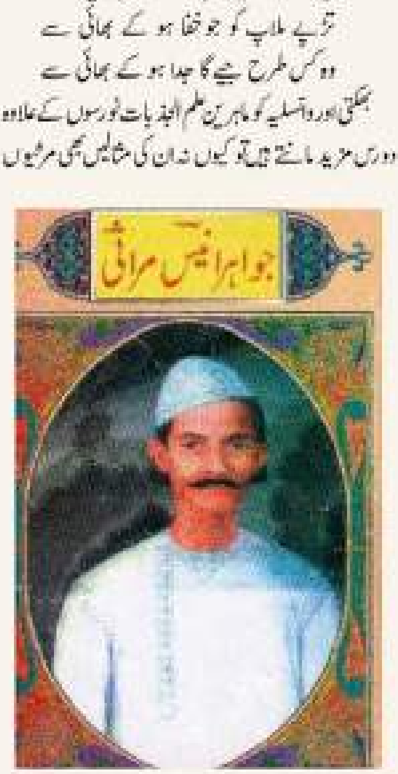

میں دیکھتے چلیں، جبکہ یہ دونوں جذبات مرثیے کے لازمی حصے ہیں۔ واتسلیہ یعنی جذبۂ طفلانہ کے معنی ہندی لغت میں ماں اور باپ سے بچوں کی محبت ہے۔ مرثیے سے اس محبت کی مثالیں پیش خدمت ہیں:

تھم کے چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم
تم سے رخصت کو پھر آیا ہے حسین مظلوم
اب مرے قتل کے درپے ہے یہ سب لشکر شوم
ہاں جگا دو اسے غش ہو جو سکینہ معصوم
نہیں ملتا جو زمانے سے گزر جاتا ہے
کہہ دو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہے
یہ صدا سن کے حرم خیمے سے مضطر دوڑے
شہ کی آواز پہ سب بیکس و بے پر دوڑے
گر پڑیں سر سے ردائیں تو کھلے سر دوڑے
بچے روتے ہوئے پاؤں کے برابر دوڑے

رو کے چلائی سکینہ شہ والا آؤ
میں تمھیں ڈھونڈتی تھی دیر سے بابا آؤ
آؤ اچھے مرے بابا میں تمہارے واری
دیکھو تم بن ہیں گلے تک مرے آنسو جاری
آج یہ کیا ہے کہ بھولے مری خاطر داری
ہاتھ پھیلا کے کہو آ مری بیٹی پیاری
منہ چھپانے کی ہے کیا وجہ نہ شرماؤ تم
اب میں پانی نہ مانگوں گی چلے آؤ تم

آخر میں بھگتی یا جذبۂ عبادت۔ مرثیوں کا آغاز چونکہ اسی جذبے سے ہوتا ہے۔ جنگ و جدل سے پہلے اہل بیت عبادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ سفر ہو یا حضر، خوشی ہو یا رنج و غم، جب خدا بندے کے حال سے بے خبر نہیں رہتا تو بندے کیسے اس کی عبادت سے غافل رہ سکتے ہیں۔ جیسے:

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ گل و غنچہ و ثمر
محو ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبر شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا
باہم مکبروں کی صدائیں وہ دل پسند
کروبیان عرش تھے سب جن سے بہرہ مند
ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دوچند
خوف خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند
خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے مہ نو تھے رکوع میں
اک صف میں سب محمد و حیدر کے رشتہ دار
اٹھارہ نوجواں ہیں اگر کیجیے شمار
پر سب وحید عصر و حق آگاہ و خاکسار
پیرو امام پاک کے، دانائے روزگار
تسبیح ہر طرف یہ افلاک انھیں کی ہے
جس پر درود پڑھتے ہیں یہ خاک انھیں کی ہے

مراثی انیس میں جملہ جذبات اور لیکن جس انداز میں برتے گئے ہیں شاید یہ جذبات اردو کی دیگر اصناف شاعری میں اس شدت اور کامیابی سے نہ برتے گئے ہوں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ میر انیس ان جذبات یا رس سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ مختلف اصناف ہمیں جن جذبات سے محظوظ نہیں کرا سکتے وہ صرف ایک مرثیہ کرا سکتا ہے۔ اسی لیے مرثیے کی اہمیت و افادیت اور جذبات و خیالات کی پاکیزگی مسلم ہے۔

■

Dr. Sanjay Kumar, Dept of Urdu, University of Allahabad, Allahabad - 211002 (UP)

محمد نعمان خاں

گاندھی جی کے تعلیمی افکار

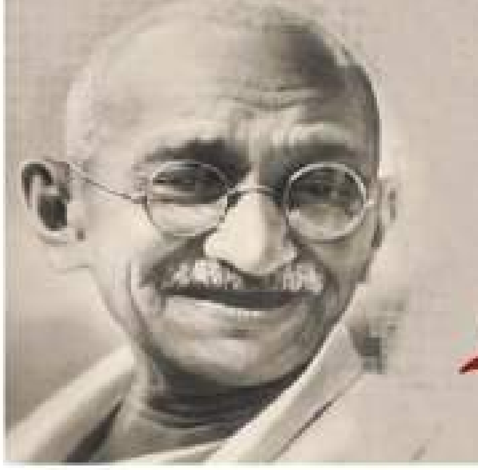

ہندوستان کی آزادی اور قومی اتحاد کے ساتھ ساتھ اس کی سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور تعلیمی اصلاحات اور استحکام میں مہاتما گاندھی نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ گاندھی جی اگرچہ باضابطہ طور پر کوئی ماہر تعلیم نہیں تھے لیکن اپنے وطن کی غلامی، ہم وطنوں کی بدحالی اور انگریزوں کے جبر واستبداد نے ان کے فکر وعمل اور طریقہ کار میں نمایاں تبدیلی پیدا کر کے انھیں ملک وقوم کا رہنما اور ماہر تعلیم، مہاتما اور راشٹر پتا بنا دیا تھا۔

ہندوستان اور اس کے عوام کی بدحالی، غلامی، غربت اور پچھڑے پن کا سبب ان کے نزدیک ناخواندگی تھا۔ ملک کو آزاد کرانا ان کا اہم مشن تھا لیکن آزادی حاصل کرنے اور اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے لیے انھوں نے اپنے مشن یعنی آزادی کے حصول کی خاطر عملی زندگی کے جن مختلف محاذوں پر جم کر کام کیا ان میں ایک اہم محاذ تعلیم بھی تھا۔ تعلیمی امور سے متعلق گاندھی جی کی خدمات بہت اہم ہیں۔ گاندھی جی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کے لیے ہمیشہ فکر مند وکوشاں رہتے تھے۔ ان کی شخصیت، زندگی اور سرگرمیاں ایک چلتے پھرتے اسکول کی مانند تھیں۔ بقول خود: 'میرا جیون ہی میرا سندیش ہے'۔ سچائی، سادگی، بلند خیالی، عدم تشدد، مساوات، قومی اتحاد، امن وشانتی، خودداری، خودکفالتی اور اپنی خدمت آپ جیسے اصولوں پر کاربند اور عمل پیرا ہونے کے سبب وہ اپنے پرائے سبھی کو متاثر ومرعوب کر دیتے تھے۔ ان کی روزمرہ کی عملی زندگی کے معاملات، انسانوں خصوصاً غریبوں اور بے کسوں سے بے لوث محبت اور سچی، سادہ، منظم اور بااصول زندگی ایک ایسا نمونہ تھی جس سے ہر انسان اثر قبول کر کے انسانیت کا بے لوث خدمت گزار بن جاتا تھا۔ گاندھی جی احترام آدمیت کے قائل اور انسانیت کے مسیحا تھے۔ ان کے تعلیمی نظریات اور خدمات ان کے اسی انسانی اور قومی مشن کا ایک اہم ترین حصہ ہیں جن کے ذریعے انھوں نے قوم کو بیدار کرنے، تعلیم یافتہ اور باعمل بنانے، ان میں احساس ذمے داری اور خودداری پیدا کرنے انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے، ان میں باہمی قومی اتحاد پیدا کرنے، انھیں اہنسا وادی اور پرامن بنانے اور ملک وقوم کا سچا خادم بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

گاندھی جی پیشے سے بیرسٹر ضرور تھے لیکن جوان العمری ہی سے مزاجاً وہ ایک ایسے استاد نما انسان تھے جنھیں زندگی کی اہمیت کا احساس، وطن، سماج اور قوم سے لگاؤ، سیکھنے، سکھانے سے خاص دلچسپی تھی۔ سیاست میں داخل ہونے سے قبل بھی ان کی زندگی سادہ، بااصول اور منظم تھی۔ تحریک آزادی ہند میں شامل ہونے کے بعد ان کی طرز زندگی اور فکر وعمل میں قابل تقلید تبدیلیاں پیدا ہو گئیں اور وہ اہل ملک وقوم کے لیے مثالی انسان اور قابل اعتبار رہنما بن گئے لیکن ان کے اندر کا استاد ہمیشہ زندہ رہا۔ ان کی سادہ، بااصول، باعمل زندگی اور طرز معاشرت ایک ایسی کھلی ہوئی کتاب تھی جس سے ان کے رابطے میں آنے والا ہر انسان نہ صرف متاثر ہوتا بلکہ سبق بھی حاصل کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گاندھی جی کی پہلی طالب علم ان کی اہلیہ کستوربا گاندھی تھیں۔ گاندھی جی کی شادی کستوربا گاندھی سے تیرہ سال کی عمر میں اس وقت ہوگئی تھی جب کہ وہ خود اسکول میں زیر تعلیم تھے اور کستوربا گاندھی ناخواندہ تھیں۔ گاندھی جی کو انھیں حرف شناس بنانے کے لیے ان کا استاد بننا پڑا۔ گاندھی جی کو تعلیم سے خاص لگاؤ تھا لیکن اس سلسلے میں انھوں نے کوئی خصوصی کورس یا تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ ان کے تعلیمی اصول اور پڑھانے کے طریقے ان کے اپنے تھے۔

جب وہ جنوبی افریقہ گئے تو وہاں کیونکہ انگریزی جاننا ضروری تھا اس لیے انھوں نے افریقہ میں مقیم بعض ہندوستانیوں کو انگریزی سکھانے کی خدمت مفت انجام دی۔ گاندھی جی اگرچہ اپنے پیشہ ورانہ کاموں میں مصروف رہتے تھے لیکن جب بھی موقع ملتا درس وتدریس کے کاموں کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے بچوں کو بھی پڑھایا اور مختلف پیشوں سے متعلق اور اطراف کے ضرورت مند اشخاص کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

گاندھی جی کو درس وتدریس سے جو خصوصی لگاؤ تھا اس کے سبب انھوں نے 'فینکس' کے آشرم میں رہنے والے بچوں کے لیے درس گاہ قائم کر کے انھیں خود بھی تعلیم دی اور اپنے دوستوں کو بھی اس فریضے کی ادائیگی کے لیے آمادہ کیا۔

گاندھی جی یہ جانتے اور چاہتے تھے کہ ایک اچھے استاد کو اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی مثالی ہونا چاہیے۔ اپنے موضوع پر عبور اور حالات حاضرہ سے واقفیت کو وہ ہر استاد کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ گاندھی جی ایسی تعلیم کے قائل تھے جو آموزگار کو باکردار، خوش اخلاق، فرض شناس، انسان دوست اور خود کفیل بنا سکے۔ وہ کھیل کھیل میں تعلیم کے حصول کے قائل تھے۔ حصول تعلیم میں کتابی علم سے زیادہ اخلاقی اور عملی امور کو وہ ترجیح دیتے تھے اور رٹ کر پڑھنے کے بجائے سمجھ کر پڑھنے کو بہتر اور مؤثر سمجھتے تھے۔ آموزش ان کے لیے بوجھ نہیں دلچسپی کا ذریعہ تھی اور وہ ہمیشہ اسی اصول پر عمل پیرا رہے۔ وہ جانتے تھے کہ محض رٹنا اور کتابی علم حاصل کرنا تعلیم کا اصل مقصد نہیں۔ وہ طلبا کو کتاب کا کیڑا بنانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ذہنی اور جسمانی نشوونما بھی ضروری تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے طلبا کی فطری ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع مل سکے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو، وہ اپنا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیں۔ حصول تعلیم میں دست کاری اور ہنرمندی کو وہ زیادہ بہتر اور مفید سمجھتے تھے۔ ٹالسٹائے فارم ہو یا سابرمتی آشرم ہر جگہ وہ بچوں کو تکلی کاتنے، جوتے گانٹھنے اور روزمرہ زندگی کے نجی اور اجتماعی کاموں کو خود اپنے ہاتھوں انجام دینے کی ترغیب دیتے رہے۔ کیونکہ وہ خود یہ تمام کام اپنے ہاتھ

سے انجام دیتے تھے اس لیے ان کے آشرم میں رہنے والے چھوٹے بڑے سبھی افراد ان کی پیروی کرتے تھے۔

گاندھی جی ہر زبان کا احترام کرتے تھے لیکن حصول تعلیم کے لیے بچے کی مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا مفید خیال کرتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ جملہ مضامین کی تدریس، تحصیل اور آموزش بچے کی مادری زبان میں ہی کی جائے۔ گاندھی جی کھلے ذہن کے انسان تھے۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے حامی تھے۔ اس ضمن میں ان کا خیال تھا:

"میں لڑکیوں کو سات تالوں میں بند کر کے رکھنے پر یقین نہیں رکھتا۔ لڑکے اور لڑکیوں کو ساتھ ساتھ پڑھنے اور ملنے جلنے کا موقع دینا چاہیے"۔

گاندھی جی اپنے عہد کے مروجہ نظام تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اسے یکسر تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہو جس میں صرف اعلیٰ یا متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے طلبا ہی فیض یاب نہ ہوں بلکہ کروڑوں پسماندہ اور غریب بچے بھی تعلیم کی نعمت سے فائدہ اٹھا کر اپنے مستقبل کو روشن اور خوشحال بنا کر خود کفیل ہو کر ایک باعزت زندگی سے ہمکنار ہو سکیں۔

گاندھی جی نے ملک کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد 1937 میں ایک نظام تعلیم 'بنیادی تعلیم' کے نام سے وضع کیا تھا۔ ان کا یہی نظام تعلیم بعد میں نئے تعلیمی نظام یا 'وردھا تعلیمی نظام' کے نام سے مشہور ہوا۔ گاندھی جی کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے جو کہ پسماندہ ہی نہیں ناخواندہ بھی ہے، وہ ہندوستان کے ہر گاؤں میں اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے انھوں نے ہر استاد اور طالب علم کو خود کفیل بنانے کے لیے دست کاری پر خاص توجہ صرف کی۔ گاندھی جی یہ بھی جانتے تھے کہ جب تک تعلیم عام نہ ہوگی متحدہ قومیت، سماجی مساوات، بیروزگاری کے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے اور امن کی صورت حال قائم نہیں ہو سکے گی۔

تعلیم کا مقصد ان کے نزدیک سرکاری نوکر بننا یا ملازمت کرنا نہیں بلکہ ملک و قوم کی خدمت اور ایک باعزت انسان بن کر کامیاب زندگی بسر کرنا تھا۔ گاندھی جی نے گجرات ودیا پیٹھ میں طلبا و طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں اچھی نوکری حاصل کرنے، کرسی توڑنے کے لیے تعلیم نہیں دینا چاہتا ــــ طالب علم تو قومی زندگی کو مضبوط بنائیں اور ملک کے بہادر سپاہی بنیں۔ وہ کسان کے دکھ سکھ کو سمجھیں اور ان کی تکلیفوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔"

گاندھی جی نے بہار، بنگال اور گجرات میں کئی ابتدائی اسکول کھولے اور احمد آباد میں قومی یونیورسٹی قائم کی۔ 'بنیادی تعلیم' یا نئی تعلیم' سے متعلق 1937 میں انھوں نے اپنے تعلیمی نظریات کا باقاعدہ اظہار کیا۔ 1937 سے لے کر آخری دم تک وہ تعلیمی مسائل پر غور وخوض بھی کرتے رہے اور اظہار خیال بھی۔ انھوں نے تعلیمی مسائل و معاملات پر اپنے خیالات و نظریات کو سب سے پہلے 31 جولائی 1937 کے 'ہریجن' کے شمارے میں ظاہر کر کے معاصر مفکرین اور ماہرین تعلیمات سے نہ صرف مکالمہ قائم کیا بلکہ ان کے مشورے بھی طلب کیے۔ گاندھی کے تعلیمی نظریات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مخصوص تعلیمی نظریہ رکھتے تھے جو کہ اس عہد کے مخصوص تعلیمی، سماجی، سیاسی، معاشی حالات کا نتیجہ تھا۔

گاندھی جی، رسکن، ٹالسٹائی اور رابندر ناتھ ٹیگور کے تعلیمی نظریات سے متاثر تھے۔ 1937 میں برطانوی حکومت کے زیر نگیں ہندوستان کے کئی صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے سامنے دیگر مسائل کے ساتھ ایک اہم

مسئلہ تعلیم کا بھی اس لیے تھا کہ تعلیم کے فروغ کے لیے ان کے پاس خاطر خواہ مالی اور انتظامی وسائل موجود نہیں تھے۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں ایک تعلیمی منصوبے کو روبہ عمل لانا ضروری تھا، جس سے بغیر مالی وسائل کے بغیر بھی اسکول قائم کیے جا سکیں اور تعلیم کے مسئلے کو حل کیا جا سکے۔ تعلیم کے فروغ سے متعلق مذکورہ معاملات و مسائل کے حل کی خاطر گاندھی جی نے نہ صرف بعض انقلابی اقدامات کیے بلکہ حسب ذیل مشورے بھی دیے جو بعض لوگوں کے لیے قابل قبول اور بعض کی نظر میں متنازعہ قرار پائے۔

1. ابتدائی تعلیم 'میٹرک' سطح تک ہو، جس میں انگریزی کو علاحدہ کر کے دست کاری کو شامل کر دیا جائے۔ اس میں 7 سے 14 سال تک کے طلبا شامل ہوں۔

2. دست کاری کا انتخاب لوگوں کے متعلقہ پیشوں سے کیا جائے۔

3. تعلیم دست کاری پر ہی منحصر ہو۔

4. ایسی تعلیم جو تعمیری اور خود کفالتی ہو۔

آخر الذکر تجویز میں یہ پہلو مضمر تھا کہ طلبا دست کاری کے ذریعہ جو اشیا تیار کریں ان کے ذریعے اسکول کا خرچ پورا کیا جائے۔

بعض ماہرین تعلیم نے مذکورہ بالا نکات کو اس لیے جوں کا توں قبول نہیں کیا کہ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ طرز تعلیم طلبا کو کہیں طفل مزدوری کا عادی نہ بنا دے۔

اس وقت کیونکہ بنیادی تعلیم سب سے اہم مسئلہ تھی اس لیے بنیادی تعلیم سے متعلق ایک منصوبہ تیار کرنے کے لیے وردھا اجلاس منعقدہ 1937 میں زیر صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین ایک کمیٹی کی تشکیل نئی تعلیم کے نام سے عمل میں آئی۔ جس کے تحت بچوں اور بڑوں دونوں کے ہمہ جہتی فروغ کے ساتھ ساتھ تمام تر سرگرمیوں کے ذریعے سماج کی خدمت کی اہمیت پر خاص توجہ دی گئی۔ کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ میں واضح طور پر ان امور کا اظہار کیا گیا۔ اس منصوبے کا بنیادی مقصد ایسے دست کاروں کو پیدا کرنا نہیں تھا، جو مشینی انداز سے کوئی دست کاری کرتے چلے جائیں بلکہ دست کاری کے کاموں میں جو تعلیمی وسائل محیط ہوتے ہیں، یہ انھیں استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں یہ امر ضروری ہے کہ تخلیقی کام اسکولی نصاب اس سے متعلق دست کاری کا ہی حصہ نہ ہوں بلکہ دیگر تمام مضامین کی تدریس کے مواقع بھی فراہم کر سکے۔ اس میں تدریسی آموزش کے دوران معاون سرگرمیوں، منصوبہ بندی، پیش قدمی اور شخصی ذمے داری پر زور دیا جانا چاہیے۔"

(ماخوذ: رپورٹ آف دی ذاکر حسین کمیٹی اینڈ دی ڈیٹیلڈ سلیبس (وردھا 1938)

اس طرح بنیادی تعلیم کا مطلب تھا اپنے وجود اور سماج سے طلبا کا باہمی مضبوط ربط تا کہ وہ بے گاری اور استحصال سے نجات کا راستہ تلاش کر سکیں۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ تعلیم ہی سچی آزادی مہیا کرتی ہے۔ ظلم اور غلامی کو دور کرنا ان کی بنیادی فکر تھی۔ سوراج، مقامی سطح پر خود کفالتی، مزدوری کے بدلے روٹی اور سرمایہ کاری کے تحت بڑھتی ہوئی صنعت کاری کے زیر اثر عوام اور سماج کے مابین پیدا ہونے والی اجنبیت پر وہ قدغن لگانا چاہتے تھے۔ تعلیم کا سب سے اہم مقصد ان کے نزدیک خدا کا عرفان اور اپنی خودی اور خود شناسی تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ "صحیح تعلیم وہ ہے جس کے ذریعے آدمی میں روحانی طاقت پیدا ہو تا کہ مادی چیزوں پر قابو۔" گاندھی جی کا تعلیمی فلسفہ مذکورہ بالا افکار کا حامل تھا۔ وہ درسی کتابوں پر منحصر تعلیم کو پسند

نہیں کرتے تھے۔ان کے مطابق:

''نصاب کوتعلیم کا وسیلہ سمجھا جائے تو استاد کی فعال ذمے داری برائے نام ہی رہ جاتی ہے.جو استاد درسی کتابوں کی مدد سے پڑھاتا ہے، وہ اپنے طلبا میں اخلاقیات پیدا نہیں کرسکتا۔وہ خود درسی کتابوں کا غلام بن جاتا ہے......اس لیے درسی کتابیں جتنی کم ہوں استاد اور آموزگار کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔''

(ماخوذ:ٹیکسٹ بک، ہریجن،9دسمبر 1939)

ملک کی آزادی کے بعد تعلیمی نظام کی بہتری کے لیے ماہرین تعلیمات اور حکومت ہند کئی عملی تجربے کرچکی ہے۔کئی کمیٹیوں اور کمیشنوں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی 1986 'پروگرام آف ایکشن 1992'، کوٹھاری کمیشن 1964، سہ لسانی فارمولا، سرو سکشا ابھیان۔ مختلف وقتوں میں NCERT کے NCFمیں ہونے والی نظر ثانی وغیرہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بنیادی تعلیم سے متعلق گاندھی.جی کے کئی تعلیمی نظریات کا عکس نہ صرف منعکس ہوتا ہے بلکہ عصر حاضر میں بھی ان کی معنویت ثابت ہوتی نظر آتی ہے۔

'زندگی کے لیے اور زندگی کے ذریعے تعلیم' گاندھی.جی کا یہ تعلیمی نظریہ آج بھی اتنا ہی بامعنی اور اہم ہے جتنا کہ ماضی میں تھا۔بقول ڈاکٹر سید عابد حسین:

''میرا یقین ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں گاندھی.جی کا اخلاقی رویہ آج بھی اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے۔''

گاندھی.جی صحت اور تعلیم کو سوراج کی کلید متصور کرتے تھے۔ وہ قومی یکجہتی کے حامی اور تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے لیکن ان کے تعلیمی نظریات میں مذہبی تعلیم شامل نہیں تھی۔انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار بنیادی قومی تعلیم سے متعلق ذاکر حسین کمیٹی کے کنوینر ای ڈبلو آر یہ نائکم کے نام 21فروری 1947 میں تحریر کردہ ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

''میں نہیں مانتا کہ صوبے کو مذہبی تعلیم سے سروکار رکھنا چاہیے۔ میرا ماننا ہے کہ مذہبی تعلیم، مذہبی تنظیموں کا ہی واحد سروکار ہونا چاہیے۔مذہب اور اخلاقی تعلیم میں آمیزش نہ کریں۔میرا یقین ہے کہ بنیادی اخلاقیات کی تعلیم دینا بلاشبہ صوبے کا فرض ہے۔ مذہب کے لحاظ سے مجھے بنیادی اخلاقیات کا نہیں بلکہ الگ الگ نام والے طبقوں کا خیال آتا ہے''۔

گاندھی.جی کا تعلیمی نظریہ انسانیت نواز اور ہمہ گیر تھا۔ان کے نزدیک حصولِ علم کا سلسلہ ساری زندگی یعنی مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے۔وہ چاہتے تھے کہ تعلیم ایسی ہو جو ہماری روزمرہ زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرے اور ہر مرد اور عورت کی اس طرح تربیت کرے کہ وہ اپنے گاؤں اور ملک ہی نہیں، دنیا کے لیے بہتر شہری بہتر انسان بن سکیں۔

'سب کے لیے سچی تعلیم' ان کا وہ واحد تصور تھا جس کے تحت استحصال و بے انصافی کا صحیح علاج ہو اور عدم تشدد ،جمہوریت پروان چڑھے۔وہ ایسی تعلیم چاہتے تھے جس سے غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے اور ذات پات، امیری غریبی کے امتیازات ختم ہوجائیں۔ بچوں کی جسمانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کو فروغ ملے۔ گاندھی.جی کے درج ذیل افکار سے ان کے تعلیمی نظریات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تعلیم، بچے اور انسان کے جسم، ذہن اور روح کی اعلیٰ ترین صفت کو اُجاگر کرتی ہے۔ تعلیم کو روزمرہ زندگی کے ہر ایک پہلو کو ضرور چھونا چاہیے اور ہر ایک عورت اور مرد کو اپنے گاؤں کا بہتر شہری بنانے میں معاونت کرنا چاہیے جس سے وہ بھارت اور دنیا کا بہتر شہری بن سکے۔

گاندھی.جی کی قومی تعلیمی پالیسی کو 'بنیادی تعلیم' اور 'وردھا اسکیم' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ان کے تعلیمی افکار سے سبھی ماہرین تعلیم نے استفادہ کیا ہے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام اور اس کے استحکام میں انھوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی نظام اور اہل جامعہ نے گاندھی.جی سے جو اثرات قبول کیے تھے ان کے متعلق ڈاکٹر سید عابد حسین نے لکھا ہے:

''جامعہ والوں نے گاندھی.جی کی شخصیت کے اثر سے اپنی زندگی میں سادگی پیدا کی جس سے برائے نام تنخواہوں پر گزارا کرنا آسان ہوگیا اور گاندھی.جی سے انھیں یہ بصیرت حاصل ہوئی کہ قوم کے کروڑوں غریبوں کی تعلیم ان ہی غریبوں کی تعلیم کا نام ہے۔'' (ماخوذ: گاندھی.جی اور ڈاکٹر سید عابد حسین مرتبہ:صغرا مہدی ص:8,9)

گاندھی.جی کے انسان نواز نظریات سے متاثر ہوکر ملک میں نہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا بلکہ میکالے تعلیمی نظام پر کاری ضرب لگانے کی خاطر کئی قومی اسکول کھولے گئے اور احمد آباد میں گجرات ودیا پیٹھ، بنارس میں کاشی ودیا پیٹھ، پٹنہ میں 'بہار ودیا پیٹھ' قائم کیے گئے۔

گاندھی.جی بچوں کی فطری صلاحیتوں کے معترف تھے، ان کا خیال تھا کہ چھوٹے بچوں سے بھی بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ بچوں کی فطرت اور سیکھنے کی صلاحیت سے متعلق اپنے تجربات کا اظہار کرتے ہوئے گاندھی.جی نے 1921 میں لندن میں مادام مانٹیسری کے مدرسے میں منعقدہ اعزازیہ جلسہ میں استقبالیہ تقریر کے جواب میں کہا تھا:

''خاتون محترم! آپ کے الفاظ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ میں عاجزی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی ذات کو سراپا محبت بنانے کی بھی کوشش جو مجھ سے ہوسکتی ہے، کرتا ہوں ......اگر حق کی معرفت حاصل کرنا ہے تو مجھے چاہیے کہ محبت کے قانون پر چلوں، چاہے اس میں میری جان ہی کام آجائے......محبت کا قانون اچھی طرح چھوٹے بچوں سے سیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے......ہم بھی ہندوستان کے غریب سے غریب بچوں کی تعلیم کے تجربے کررہے ہیں، معلوم نہیں ہمیں کہاں تک کامیابی ہوگی، مقصد تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ان بچوں کو جو چوہے کے بلوں میں رہتے ہیں، سچی تعلیم دی جائے مگر اس کے مادی وسائل ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہیں۔

لے دے کے ہمیں معلموں کی رضا کارانہ مدد کا آسرا ہے لیکن جب معلموں کی تلاش کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم ہیں خصوصاً اس قسم کے معلّم جن کی ضرورت ہے کہ ہمدردی سے ہر بچے کی طبیعت کا مطالعہ کرے، اسے اپنے بل پر کھڑا کرکے اسے ذاتی عزت کا احساس دلاکر اس کی بہترین صفات کو ابھاریں۔آپ یقین کیجیے سیکڑوں بلکہ ہزاروں بچوں کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کے دل میں آپ سے، مجھ سے زیادہ عزت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ہم عجز و انکسار سے کام لیں تو ہم زندگی کے بڑے بڑے سبق، سن رسیدہ اور عالم فاضل حضرات سے نہیں، ان بچوں سے جو نادان کہلاتے ہیں سیکھ سکتے ہیں۔'' (ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ماخوذ: از گاندھی.جی اور ڈاکٹر سید عابد حسین مرتبہ صغرا مہدی، ص:44-43)

گاندھی.جی کے نزدیک قوم کا ہر بچہ محض خاندان کی ملکیت اور سہارا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری قوم کا سرمایہ ہوتا ہے۔وہ تعلیم کے معاشرتی مقصد کے قائل تھے۔وہ ہر گھر کو ایک اسکول اور ہر ماں باپ کو استاد سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ: ''تعلیم وہ علم اور فن ہے جس کے ذریعے بچے کی نشوونما اور قوم کی ضروریات کے مابین ایک رابطہ پیدا کیا جاتا ہے اور ملک کے نوجوانوں کو اس کے جسم کا ایک مناسب عضو بنایا جاتا ہے...... تعلیم کی غرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسان کو اس قابل بنادے کہ وہ واضح طور پر دیکھ سکے، صاف طور پر تصور کرسکے، شریفانہ طور پر نیک اور اچھی آرزو کرسکے، تیزی کے ساتھ سوچ سمجھ سکے اور اپنے ملک کی خدمت کے لیے وفاداری کے ساتھ عمل کرسکے''۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی.جی نے نظام تعلیم کا جو انسانیت نواز تصور پیش کیا تھا اس کے تحت معاشرتی نظام میں ناانصافی، تشدد اور عدم مساوات اور خود کفالت، خودداری بچے کے گردوپیش کے ماحول، اس کی مادری زبان اور کام کو سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنانے پر توجہ صرف کی تھی۔انھوں نے ایک ایسے پُرامن اور خوش حال ہندوستان کا خواب دیکھا تھا جس میں ہر بچہ اپنی صلاحیتوں کو نہ صرف پروان چڑھا سکے بلکہ ملک وقوم کی تعمیر نو میں حصہ لے سکے۔

■

Mohammad Nauman Khan, F-3, Goyal Hari Apartt., PNB Colony, Idgah Hills, Bhopal (M.P.) 462001

مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد

آفاق حسین صدیقی

خراجِ عقیدت

ہندوستان کی تاریخ میں انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ اگر سیاسی اور سماجی حالات کے اعتبار سے پرآشوب دور سے عبارت ہے تو اس لحاظ سے مبارک دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں مفکرین، مدبرین، دانشوروں، علما فضلا، مصنفین، مولفین، مصلحین اور صاحب فکر و نظر حضرات کی ایک بڑی جماعت وجود میں آئی جس نے اپنی فہم و فراست، فکر و شعور اور اپنے نظریات و کارناموں سے قومی زندگی کے مختلف میدانوں میں بے حساب چراغ روشن کیے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جنم لینے والے مذکورہ لوگوں میں دو ہستیاں ایسی ہیں جو اپنے افکار و اعمال، بلند اقدار، غیر معمولی عبقریت، بصیرت، منفرد نوعیت کے نظریات اور ہمہ گیری و ہمہ جہتی کے لحاظ سے نہ صرف اس عہد میں جنم لینے والی تمام اہم شخصیات میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں بلکہ ہندوستان کی ذہنی، فکری بیداری اور تحریک آزادی کے سیاق و سباق میں میر کارواں کی حیثیت رکھتی ہیں ایک مہاتما گاندھی اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ یہ دونوں ہستیاں اپنے سفر میں اگر ایک طرف نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز کی نعمتوں سے مالامال تھیں تو دوسری طرف ان کی منزل بھی ایک تھی۔ وطن کی آزادی اور ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر "جس میں کسی کی بھی آنکھ میں آنسو نہ ہو اور غریب سے غریب آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ اس کا ملک ہے اور جس کو بنانے میں اس کی آواز بھی اثر رکھتی ہے" (مہاتما گاندھی)

"آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اسی کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔" (مولانا ابوالکلام آزاد)

مہاتما گاندھی 1869 میں پوربندر میں پیدا ہوئے تھے تو مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش عرب کے مقدس شہر مکہ معظمہ میں ہوئی تھی لیکن دونوں نے شعور کی ابتدائی منزلیں ہندوستان میں طے کیں۔ دونوں کی نشوونما مذہبی ماحول میں ہوئی۔ دونوں نے مذہب سے گہرے اثرات قبول کیے۔ دونوں نے بچپن سے ہی عوامی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کردیا تھا۔ دونوں داعیِ خدمت خلق سے معمور اور جذبۂ احترام آدمیت سے سرشار تھے۔ دونوں کا مسلک انسان دوستی تھا۔ دونوں کو روحانیت، صداقت، حق و انصاف اور ایثار و قربانی کے آدرشوں پر کامل یقین و اعتماد تھا۔ دونوں اتحاد، اتفاق، بھائی چارہ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کے قائل تھے۔ دونوں نے عوام کی بھلائی، بہتری اور فلاح و بہبود کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد بنایا تھا اس کے لیے دونوں نے ہی سماجی، تہذیبی قدروں اور اخلاق کی اصلاح کے ساتھ جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی عدیم المثال فہم و فراست سے کامیابی حاصل کی۔ مہاتما گاندھی کی 1893 سے 1914 تک جنوبی افریقہ میں رنگ و نسل کا امتیاز برتنے والی گوروں کی حکومت کے خلاف عدم تشدد اور ستیہ گرہ پر مبنی احتجاج اور جدوجہد۔ مولانا آزاد کا 5 جنوری 1902 کو رسالہ 'احسن الحق' کی (عثمانی پریس کلکتہ) سے اشاعت جسے انھوں نے احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے تالیف کیا تھا۔[1] 20 نومبر 1903 میں لسان الصدق کا اجرا، 13 جولائی 1912 کو الہلال کے اجرا کے ذریعے دعوت حق اس کا ثبوت ہیں۔

مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد دونوں رہنماؤں نے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد اور سماجی و تہذیبی زندگی کے معاملات میں مذہب کو مقدم رکھا اور میکاولی کے نظریات کے برخلاف مذہب اور سیاست کو ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ مہاتما گاندھی کا یقین تھا کہ مذہب انسانی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ سیاست اپنی تمام تر برائیوں کے باوجود انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے انھوں نے کہا تھا:

"यदि आज मैं राजनीति में हिस्सा लेता हुआ दिखाई पड़ता हूं तो इसका एक मात्र कारण यही है कि राजनीति वर्तमान समय में हमें सांप की तरह चारों ओर से लपेटे हुए है. जिसके चुंगल से हम कितनी ही कोशिश करें नहीं निकल सकते।"[2]

مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ سیاست کو مذہب سے الگ نہیں کیا جاسکتا ان کے نزدیک مذہب سے عاری سیاست موت کا ایک جال ہے کیونکہ مذہب سے بے نیاز سیاست روح کو مجروح کرتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

"मेरे लिए धर्म विहीन राजनीति कोई चीज नहीं है......नीति (اخلاقیات) शून्य राजनीति सर्वथा (مکمل طور پر) त्याज्य (فرسودہ) है......राजनीति धर्म की अनुगामिनी (مقلد-پیرو) है। धर्म से शून्य राजनीति मृत्यु का एक जाल है क्योंकि इससे आत्मा का हनन (زیاں) होता है[3]

مہاتما گاندھی نے جگہ جگہ سیاست میں नैतिकता یعنی اخلاقی اقدار کا ذکر کیا ہے وہ مذہب کو اخلاقیات کا سرچشمہ تصور کرتے تھے ان کے خیال میں नैतिकता کی بنیادی خصوصیات सत्य اور अहिंसा یعنی سچائی اور رحم ہیں انھیں دو قدروں کو انھوں نے گیارہ خوبیوں میں پھیلا کر اپنا آشرم تخلیق کیا تھا جہاں کی صبح و شام کی پرارتھنا میں گایا جاتا تھا گیارہ اقدار درج ذیل ہیں:

अहिंसा (عدم تشدد) सत्य (صداقت) अस्तेय
(تجرد) ब्रह्मचर्य (پاکی) مادی املاک سے असंग्रह
(جمع نہ کرنا) शरीर श्रम (جسمانی ریاضت) अस्वाद
(غیر فطری) सर्वत्र-भय-वर्जन (نڈر) सर्वधर्म
समानता (تمام مذاہب برابر ہیں) स्वदेशी (ملکی)
स्पर्श भावना (احساس)

اسی طرح مہاتما گاندھی مذہب کو حیات انسانی کی جاودانی اور سماج کی ترقی کے لیے لازمی خیال کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:

व्यक्तिगत पूर्ण विकास मोक्ष (نجات) की स्थिति में है और मोक्ष का अर्थ हर प्रकार से स्वस्थ्य होना है। अमरत्व (ہمیشگی) तो आत्मा का गुण है। इसके लिए सब शुद्ध शरीर पैदा करने का प्रयत्न करें[4] ।

درج بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی مذہب کی تخلیقی اور اصلاحی قوت پر پورا یقین رکھتے تھے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط اور اس کی ترقی و بہتری کے لیے مذہب کی رہنمائی کو ناگزیر سمجھتے تھے غالباً اسی لیے جنوبی افریقہ سے واپسی 1915 میں ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرنے کے بعد انھوں نے پہلے احمد آباد میں ستیہ گرہ آشرم قائم کیا تھا جو بعد میں سابرمتی آشرم کے نام سے مقبول ہوا۔

مذہب کے بارے میں مہاتما گاندھی کے نظریات اور خیالات کو ملحوظ رکھ کر جب ہم مولانا آزاد کے مذہب کے بارے میں خیالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ سچائی روزِ روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ مولانا آزاد ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مذہب کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کے زبردست حامی تھے۔ غبارِ خاطر کے ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

"زندگی کی دشواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی (جذب کرنا) تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ ایجابی (قبول کرنا) تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (Moral Values) کا یقین دلاتا ہے اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہیے۔"[5]

مذہب کی تخلیقی قوت کے عرفان اور مذہب کی ہمہ گیری، ہمہ جہتی اور غیر معمولی اثر انگیزی کے ادراک کی بنا پر مولانا آزاد نے اپنی زندگی کے تمام میدانوں اور فکر و عمل کی تمام راہوں میں مذہب سے ہی روشنی حاصل کی۔ اپنی سیاست سے وابستگی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"تہہ میں جو چیز کام کر رہی ہے وہ محض سیاسی ہی نہیں ہے۔ کچھ اور بھی ہے۔ میں نے اوّل دن سے افکار و عقائد کے جو اصول سامنے رکھے ہیں وہ قرآن کی تعلیمی روح پر مبنی ہیں۔ میں محض دلائل سے نہیں بلکہ ایمان و یقین سے اپنی عمارتیں استوار کرتا ہوں۔ میں ایک لمحہ کے لیے یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ مسلمان کسی راہ میں بھی خوف و شک کی تاریکی ساتھ لے کر چل سکتے ہیں۔ ان کے لیے ہر کوچے میں ایمان و یقین کی روشنی موجود ہے۔"[6]

'الہلال' اور مولانا آزاد کے خطبات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ہندوستانی سیاست سے وابستگی مذہبی فریضے کی ادائیگی کے مترادف تھی۔ 18 دسمبر 1912 کے الہلال میں شامل مولانا کی تحریر 'الجہاد فی سبیل الحریت' سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

مولانا آزاد مہاتما گاندھی کی طرح مذہب کا وسیع تصور رکھنے کے ساتھ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی ایک صحت مند اور وسیع نقطۂ نظر کے مالک تھے۔ انھوں نے الہلال کے ایک شمارے میں لکھا تھا:

"دنیا کے تمام مذاہب حق پر ہیں۔ لیکن دنیا کے پیروانِ مذہب حق سے منحرف ہو گئے ہیں جس قدر بھی گمراہی ہے، جس قدر بھی اختلاف ہے، جس قدر دعووں کی لڑائی ہے اور جماعت بندیوں کا تصادم ہے پیروانِ مذہب کے فعل و عمل پر ہے، مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔ اگر پیروانِ مذہب کا یہ انحراف دور ہو جائے جو حق نہیں ہے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز رہ جائے گی جو حق ہے۔"

یہ 'حق' جسے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے 'مذہب کی روح' سے تعبیر کیا ہے۔[7] مولانا آزاد کی تحریک آزادی میں عملی شرکت کا محرک بھی تھی وہیں مہاتما گاندھی سے تعارف اور ان پر یقین و اعتماد اور اعتقاد کا باعث بھی۔ 1923 کے کانگریس کے خصوصی اجلاس کے خطبے میں انھوں نے کہا تھا:

مذہب کے بارے میں مہاتما گاندھی کے نظریات اور خیالات کو ملحوظ رکھ کر جب ہم مولانا آزاد کے مذہب کے بارے میں خیالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ سچائی روزِ روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ مولانا آزاد ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مذہب کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کے زبردست حامی تھے۔

"ہندوستان کے لیے ہندوستان کی آزادی کے لیے صداقت اور حق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ فرائض ادا کرنے کے لیے ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور ان کی یکجہتی ضروری ہے...... اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو انھیں یہ کام بحیثیت ہندوستانی ہونے کے انجام دینا چاہیے۔"

اور پھر اسی خطبے میں انھوں نے کہا تھا:

"مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں (اور وہ کبھی نہ چاہیں گے) جو اسلام کے خلاف ہو اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔"[8]

مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کی دید و ملاقات سے 15 اگست 1947 تک کا زمانہ ہندوستان میں تحریک آزادی کے فروغ کے ساتھ دو قومی نظریے کی نشو و نما، سیاسی نظریات کے اختلافات، تعصب اور فرقہ پرستی کی آندھیوں، تقسیم وطن کے حادثے کا زمانہ تھا تو گاندھی جی کی شہادت 30 جنوری 1948 تک کا زمانہ تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے حشر خیز ہنگاموں کا بھی زمانہ تھا لیکن دونوں رہنماؤں نے باہمی رفاقت اور ایک دوسرے پر یقین و اعتماد کی ایک نادر مثال پیش کی اور نظریات میں ہم آہنگی کا ثبوت دیا۔ تحریک آزادی اور تقسیم ملک کے سلسلے میں دونوں میں اگر اختلاف رائے ہوا تو دونوں نے ملک کی آزادی اور قوم کی بہتری کو ہمیشہ ترجیح دی۔

دراصل مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی دونوں رہنما سیاست میں مذہب اور اخلاقی اقدار کی ہم آہنگی کے زبردست حامی اور ظلم، زیادتی و ناانصافی کی طاقتوں کو نیکی، سچائی، ایثار و قربانی اور اخلاق کے حربوں سے مغلوب کرنے کے داعی تھے۔

مہاتما گاندھی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب نے لکھا ہے:

"گاندھی جی نہ صرف ایک عظیم شخصیت بلکہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے افکار و اعمال میں ہمہ جہتی کے ساتھ ساتھ مذہب و اخلاق اور سیاست کا ایک ایسا امتزاج دکھائی دیتا ہے کہ اگر ان کی ذات کو دورِ حاضر کی شکست خوردہ اصول سازی اور ظالمانہ مصلحت پسندی کی تلافی کے لیے قدرت کا ایک عطیہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"[9]

مہاتما گاندھی کے بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی یہ رائے مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔

حواشی:

1. ملاحظہ ہو حیات ابوالکلام آزاد، عبدالقوی دسنوی، ص 98-99
2. مقتول مہاتما گاندھی رومین رولاں صفحہ 98 منقول از गाँधी जी का दर्शन पृष्ठ 46
3. Mahatma Gandhi His own Story - C.F. Andrews page 353-354
4. गाँधी दर्शन और ......पृ.22 منقول از गाँधी दर्शन पृ. 37
5. غبار خاطر، ص 37-41
6. آئینہ ابوالکلام آزاد، مرتبہ عتیق صدیقی، ص 183-186، منقول از حیات ابوالکلام آزاد، مرتب: عبدالقوی دسنوی، ص 684
7. مولانا آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت: ڈاکٹر ذاکر حسین، آج کل، ابوالکلام آزاد نمبر
8. دہلی میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ستمبر 1923، صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔
9. گاندھی جی اور اردو ادب۔ ادبی تخلیق و تنقید از ڈاکٹر ابو محمد سحر، ص 419

■

Afaque Husain Siddiqui, (Ex. Dept. of Urdu, Madhav College Ujjain), 37 Pani ki Chakki, Purana Qila, Bhopal (MP) Mob.: 9229673388
E-mail: ahsiddiqui786@rediffmail.com

قاضی عبیدالرحمن ہاشمی

جیسے کچھ آسماں نے چھین لیا

(تاشقند میں پروفیسر شاماتف کی وفات پر)

وسط ایشیا کی ریاست ازبکستان کی سرزمین سے وابستہ سابق سوویت یونین میں اردو ہندی کے نامور اسکالر، محقق اور معلم پروفیسر آزاد نصرالدین شاماتف کی مختصر علالت کے بعد پچھلے ماہ وفات سے ایک درخشندہ عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کی عمر 75 برس تھی۔ ان کی وفات کی خبر مجھے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر، میرے کرم فرما اور شاماتف کے یارِ غار پروفیسر ہیم چند پانڈے صاحب سے ملی۔ اگست 2014 میں جب پروفیسر شاماتف ہندوستان میں وزارت فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کی دعوت پر بیرون ہند میں ہندی زبان کی خدمات کے لیے صدر جمہوریہ ہند سے اعلیٰ اعزاز حاصل کرنے دہلی تشریف لائے تھے تو میں ان سے ملا تھا، اس وقت یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔ پروفیسر شاماتف کا تعلق تاشقند کے ایک نہایت ممتاز علمی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد ماجد مرحوم آرتھوپیڈک سرجن کی حیثیت سے پورے وسط ایشیا میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت رکھتے تھے۔ پروفیسر شاماتف کا انتقال میرا ذاتی زیاں ہے۔ وسط ایشیا میں اردو، ہندی مطالعات کی جو شمع کئی دہائیوں سے روشن تھی، اس کا نہایت مخلص اور معتمد نگہبان اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راہی ملک عدم ہوچکا ہے۔ وہ ان اولوالعزم ہندشناسوں میں تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ مذکورہ زبانوں میں لسانیاتی تحقیق و تدریس کے لیے وقف کردیا تھا، انھوں نے روسی، ہندی، اردو اور انگریزی زبانوں میں متعدد تصانیف اور بے شمار مضامین شائع کیے جن کے سبب انھیں علمی دنیا میں بڑا وقار اور اعتبار حاصل ہوا۔ ان کی تازہ ترین تصنیف 'اردو، ہندی لغت' جو انھوں نے ڈاکٹر بیات رحمتوو کی شرکت سے شائع کی۔ اس کا اجرا، گذشتہ ماہ جولائی میں وزیر اعظم ہند جناب نریندر مودی جی نے کیا جو ان دنوں ریاست ازبکستان کے سرکاری دورے پر تاشقند تشریف لے گئے تھے۔ گذشتہ برس ہی ان کی ایک دوسری معرکۃ الآرا تصنیف 'دکنی اردو لغت' شائع ہوئی جو بجائے خود ایک بڑا وقیع تحقیقی کارنامہ ہے۔ 500 صفحات پر مشتمل اس لغت میں قدیم دکنی کے ہزاروں الفاظ کلاسیکل ادوار کے دکنی سرمائے کے

گہرے مطالعے سے حاصل کر کے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ لغت ان کی لگاتار محنت شاقہ کا نتیجہ ہے جس کی علمی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ اس کی تالیف میں پروفیسر شاتوف نے 70 سے زائد قدیم دکنی کتب اور مخطوطات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جن میں موجود عربی، فارسی، ترکی، برج، سنسکرت، مراٹھی اور دیگر زبانوں سے مستعار الفاظ کو نشان زد کر کے علمیات (Epistimology) کی روشنی میں ان پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ان کی اولین تصانیف میں 'کلاسیکی دکنی' سترہویں صدی کے جنوبی ہندوستان میں رائج زبان اور شعر و ادب کا ایک تفصیلی مطالعہ ہے جس کی اشاعت 1974 میں ہوئی۔ اس میں ملا وجہی، نصرتی، غواصی، قلی قطب شاہ، برہان الدین جانم، فیروز بیدری اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز وغیرہ کے کلام کے محاسن و معائب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، اس تصنیف پر ان کو عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد نے ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی تھی۔ ان کی تحقیق کے نگراں معروف محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں تھے۔ مشرقی زبانوں میں وہ اردو ہندی کے ماسوا پنجابی اور بنگالی پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

تاشقند میں جنوب ایشیائی زبانوں کے اہم مرکز سے تقریباً 35 برس تک پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے وابستہ رہ کر چند برس قبل ہی سبکدوش ہونے کے بعد تاشقند میں ہندوستانی سفارت خانہ کے تحت قائم مہاتما گاندھی ہندشناسی مرکز سے بحیثیت ڈائرکٹر وابستہ تھے۔ انھوں نے امریکہ میں فل برائٹ فیلوشپ پر کچھ تحقیقی کام کیے۔ جرمنی اور جاپان میں اسی سلسلے میں مقیم رہے۔ تاہم ان کو ہندوستان، یہاں کی تکثیری ثقافت، یگانگت اور سادگی بہت پسند تھی۔ یہاں وہ اکثر مذاکروں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے تھے، اردو ہندی حلقوں میں بے حد مقبول و محبوب تھے۔ سوویت یونین میں ان کے بے شمار شاگردوں میں جو وہاں ماس میڈیا کے شعبوں، وزارت خارجہ، وزارت سیاحت، ہوائی اڈوں اور سفارت خانوں وغیرہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں، کے علاوہ چند شاگرد ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان کی رہنمائی میں اعلیٰ تعلیمی و تحقیقی ڈگریاں حاصل کر کے اردو ہندی کی خدمت کو اپنا مشن بنا لیا ہے۔ ان میں سے چند تاشقند میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے شعبے سے بحیثیت اساتذہ بھی وابستہ ہیں، مثلاً فی الوقت اردو ہندی شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر سراج الدین نرمتوو، ڈاکٹر میا عبدالرحمان، ڈاکٹر الفت محیبوا وغیرہ محض چند نام ہیں۔

پروفیسر آزاد نصر الدین شاتوف کی لگاتار علمی کوششوں سے دونوں ملکوں کی لسانی، ثقافتی اور تہذیبی بنیادوں کو بہت استحکام حاصل ہوا۔ وہ دونوں ملکوں کے درمیان ایک مضبوط کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ پروفیسر شاتوف کمیونسٹ اسٹیٹ کے نہایت مخلص خادم تھے۔ جس کی وجہ سے پورے سوویت یونین میں ان کا بڑا دبدبہ اور وقار تھا۔ گرچہ وہ سیاسی شخصیت کے مالک قطعاً

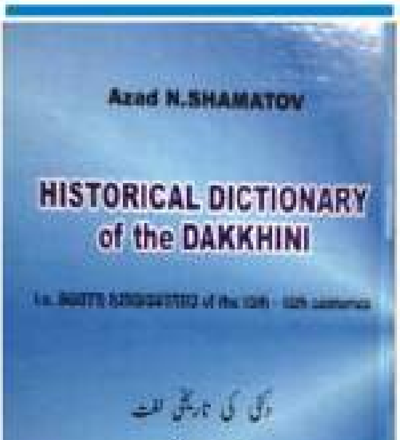

نہ تھے، لیکن سوشلزم پر ان کا ایمان راسخ تھا، جس کے فکر و فلسفے سے زندگی میں کبھی انحراف نہیں کیا۔ تاشقند میں صحیح معنوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ ارباب اقتدار ان کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے لیکن ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی کسی سفارتی یا وزارتی منصب کی خواہش کی، نہ کسی سے مرعوب ہوئے۔ ان کی تمام تر مصروفیت اور رغبت کا دائرہ صرف ان کی علمی پیاس اور تحقیق و تدریس تک محدود ہو گیا تھا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا، بچھونا تھیں، علمی مذاکروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہ آئے دن بیرون ملکوں کے سفر بھی کرتے رہتے تھے۔ خود بھی علم و ہنر کے جویا تھے اور اہل علم کی قدر و منزلت بھی کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ بے حد وجیہ اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے اسی قدر ان کا قلب بھی مصفا اور گداز تھا۔ طلبا و طالبات جو ہمہ وقت ان کے گرد منڈلاتے رہتے تھے ان کے لیے ان کی شفقت اور مروت کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ میں نے کسی بھی طالب علم کو کبھی مغموم اور پریشان حال نہ دیکھا بعینہٖ ان کی ڈسپلن بھی اس قدر سخت تھی کہ طلبا کو کبھی اپنے فرائض سے غافل نہیں دیکھا گیا۔

سوویت یونین کے زمانہ عروج میں ملک کی تمام ریاستوں کی تقدیر کے فیصلے ماسکو میں ہوتے تھے جو سوویت اقتدار اور حاکمیت کا اصل مرکز تھا۔ شاتوف جو بنیادی طور پر انسان دوست، شریف النفس، اور دل دردمند کے حامل ایک بلند حوصلہ شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں ماسکو اور وہاں کے یوروپی حکمرانوں کا مشرقی ریاست کے باشندوں کے ساتھ تحکمانہ رویہ اور مربیانہ سلوک سخت ناگوار تھا، لیکن حالات کی ستم ظریفی کے آگے وہ بے بس تھے اور حکمراں طبقے کی نخوت اور رعونت کو بادل ناخواستہ برداشت کرنے پر مجبور تھے، بالآخر وسط ایشیا کے باشندوں نے تنگ آکر ان متکبر حکمرانوں کے خلاف جو سوشلزم کی قبا اوڑھ کر بدترین آمریت کا مظاہرہ کر رہے تھے، علم بغاوت بلند کر دیا۔ پر امن عوامی انقلاب رنگ لایا، سوشلزم کا بوسیدہ ہوائی قلعہ زمیں دوز ہو گیا، ریاستیں آزاد ہو گئیں۔ شاتوف کا دیرینہ خواب جو ہم وطنوں کی آزادی اور قومی حمیت سے عبارت تھا پورا ہوا۔ وہ پورے 25 برس تک اس نو آزاد ریاست کی تعمیر و تشکیل اور علمی و ادبی نشاۃ ثانیہ میں جان و تن سے سرگرم رہے اور بالآخر ایک طویل مسافت کا سلسلہ سال رواں کے 15 اگست کو تمام ہو گیا۔ ایک باوقار عالم، مشرقی علوم کا شناور اور انسانی سربلندی کے لیے ہمہ وقت مضطرب روح اپنے ہزاروں محبت کرنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں سکون کی نیند سو گئی۔

ان کے اچانک انتقال کی خبر سے ہمارے ملک کے اردو ہندی حلقے میں غم و اندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تاہم موت سے کس کو رستگاری ہے بقول ناصر کاظمی:

ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا

Qazi Obaidur Rahman Hashmi, B-10, 2nd Floor, Okhla Vihar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 25, Mob.:09990893596
E-mail.: quazi_obaid@yahoo.com

انور ظہیر انصاری

مجروح سلطان پوری کا تخلیقی بانکپن

(ولادت یکم اکتوبر 1919 سلطان پور- وفات: 24 مئی 2000 ممبئی)

مجروح کی ولادت یکم اکتوبر 1919 کو قصبہ گنجہری، ضلع سلطان پور، اتر پردیش میں ہوئی۔ ان کا پورا نام اسرار حسن خاں تھا۔ ان کے آبا کی تجرباتی واقعیت یوں تو نسلاً چندر ونشی راجپوت تھے لیکن عہد اورنگ زیب میں مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے۔ ان کے والد ابتدائی انگریزی حکومت میں پولس کی نوکری پر مامور ہوئے لیکن 1921 میں خلافت تحریک میں شامل ہوگئے، لہٰذا مجروح کو انگریزی کے بجائے عربی فارسی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم سلطان پور میں ہی ہوئی لیکن آگے چل کر انھیں لکھنؤ بھیجا گیا تاکہ وہاں سے عالم فاضل کی سند حاصل کرکے قومی خدمت انجام دے سکیں لیکن انھیں تو حدِ پرواز سے بھی بہت آگے جانا تھا۔

مجروح خوش گلو تھے اس لیے شاعری اور موسیقی سے بھی انھیں لگاؤ تھا لہٰذا انھوں نے مدرسے میں داخلہ تو لے لیا لیکن موسیقی سے رغبت کے سبب دل جمعی کے ساتھ اس جانب متوجہ نہ ہوسکے۔ وہ ایک بار مدرس نے ان پر ہاتھ بھی صاف کیا بلکہ ایک دن تو کچھ زیادہ ہی ناراض ہوگئے، چھڑی اٹھائی اور گھمانی شروع کردی۔ اسرار حسن خاں نے مارے بچنے کے لیے چھڑی پکڑلی، مار کون برداشت کرتا، بھاگ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ درس نظامیہ کو محض دو برس ہی باقی تھے کہ مدرسے سے نکال دیے گئے ورنہ مجروح شاید مولانا اسرار حسن خاں بن کر رہ جاتے۔

مدرسے سے نکالے جانے کے بعد انھوں نے لکھنؤ کے میوزک کالج میں داخلہ لے لیا لیکن اس وقت کا مسلم معاشرہ اس پر مستزاد ان کا طبقۂ اشرافیہ سے تعلق، والد کی شدید ناگواری کا موجب بنا۔ انجام کار میوزک کالج کو الوداع کہا اور لکھنؤ کے جھوائی ٹولہ طبیہ کالج میں داخل ہوگئے کہ حکیم بن کر حکمت کریں گے۔ چنانچہ 1938 میں انھوں نے طبابت کی تعلیم مکمل کی، حکیم بن گئے اور ضلع فیض آباد کے قصبے ٹانڈہ آکر پریکٹس شروع کردی۔ شعر و شاعری سے لگاؤ بچپن سے ہی تھا خوش گلو بھی تھے لہٰذا ٹانڈہ کے مشاعروں اور نشستوں میں شہرت بھی ملی۔

مجروح ٹانڈہ میں عشق کر بیٹھے چنانچہ خوفِ رسوائی کے سبب ٹانڈہ چھوڑ سلطان پور آگئے اور سلطان پوری ہوگئے۔

ان باتوں کا ذکر مجروح نے رسالہ چراغ ممبئی کے اپنے انٹرویو میں بھی برملا کیا ہے۔

جوش ملیح آبادی، مجروح صاحب کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں، لیکن جگر مرادآبادی اور اصغر گونڈوی کا اثر خصوصاً سب سے زیادہ رہا۔ اسی لیے گمان گزرتا ہے کہ مجروح، جگر مرادآبادی سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ندیم صدیقی کو دیے گئے انٹرویو میں انھوں نے اس کی وضاحت کردی کہ جگر صاحب نے میری اصلاح کی ہے، میرے مصرعوں کی نہیں۔ (رسالہ چراغ، مجروح سلطان پوری نمبر، ص 407)

سلطان پور کے علاوہ مجروح کا مسکن اعظم گڑھ بھی رہا۔ اس زمانے کا اعظم گڑھ اور اس کے نواحی علاقے خصوصاً متو، جھنجن اور مبارک پور علمی و ادبی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کے حامل رہے ہیں بلکہ ان کا وقار حسبِ روایت آج بھی قائم ہے۔ علامہ شبلی کا دیار جہاں بڑے بڑے جید عالم اور ادیب و شاعر قیام کرتے ہوں، اس کی اہمیت یقیناً غیر معمولی ہی ہوگی۔ نیز جگر صاحب کی آمد و رفت اس کی اہمیت میں اضافہ تھی۔

مجروح کے لیے یہ صحبتیں کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھیں۔ اس دیار سے مجروح نے جو اور جتنا استفادہ کیا، علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی کی قربت و معیت اور ان کی طبیعت نے ان پر جلا کی۔ ایک تو عربی و فارسی ادبیات کا گہرا مطالعہ، دوسرے شعری ذوق کے ساتھ موسیقی سے لگاؤ اور ان سب پر بالا ان تمام بزرگوں کے اثرات، مجروح کو ایک مستند غزل گو بنانے کے لیے کافی تھے۔

مجروح کی شاعری کا آغاز ترقی پسند تحریک کے قیام کے آس پاس ہوا۔ یہی زمانہ غزلیہ شاعری سے انحراف اور موضوعاتی شاعری اور نیچرل ازم کے تحت نظم نگاری کی جانب رجحان کا زمانہ بھی تھا، لہٰذا اکثر شعرا، غزلیہ روایت کے برخلاف نظمیہ شاعری کی طرف مائل ہوئے لیکن ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے غزل کی وسعت و ہمہ گیری کو محسوس کیا اور نئی حریت، نئی حسیت اور جدید آہنگ کے ساتھ اس آواز کو جو محض نظم کا حصہ بنتی جارہی تھی غزل کے سانچے میں ڈھال کر نئی زندگی کا ترجمان بنا دیا۔ مجروح کی غزلیں اسی احساس کو معتبر کرتی ہیں کہ غزل میں اپنے عہد کے کس موضوع کو کب خوبی سے بیان نہیں کیا گیا جو آج نہیں بیان کیا جاسکتا۔ چنانچہ صنفِ غزل سے جو رشتہ دورِ آغاز میں قائم ہوا وہ اخیر دم تک جاری رہا۔ مجروح کے یہی وہ فکری سرچشمے ہیں جنھوں نے ان کے یہاں لفظیات کی شناخت اور علامات و استعارات کی سلیقہ شعاری کا ہنر پیدا کیا۔ لہٰذا ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

چند دوسری مثالیں بھی دیکھیے، جو یقینی طور پر مجروح کی شعری شناخت کی مظہر ہیں:

تقدیر کا شکوہ بے معنی، جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے، ایسا تو کوئی مجبور نہیں

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم نے وضعِ خرام
گری کلاہ تو ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

مجروح کے یہاں شاعری موضوعات کے انتخاب کا نام نہیں بلکہ زندگی کے اظہار کا نام ہے اور غزل ان کے یہاں چونکہ تہذیبی مظہر کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کے فروغ کے لیے انھوں نے خونِ جگر بھی صرف کیا ہے اور ریاضت کی سختیاں جھیل کر اس صنف کو سربلند بھی کیا ہے:

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے الگ اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

ان اشعار کی استعاراتی تنظیم غور طلب ہے اور مراعاۃ النظیر، تکرار اور تجنیس جیسی صنعتوں کی خوبی غزل میں نئے امکانات کے در باز کرتی ہے۔ اس لحاظ سے عظمت انسان اور

انسان دوستی کے مضمون مجروح کی غزلوں کی اساس قرار دیے جاسکتے ہیں، لیکن یہ انسان مجروح نہیں بلکہ حالات کی قید و بند سے نبرد آزما وہ انسان ہے جو زندگی کی برکتوں کے حصول کی خاطر کوشاں تو ہے لیکن تقدیر کا شکوہ نہیں کرتا بلکہ اپنا مقدر خود بناتا ہے۔

مجروح نے غزل کو نہ صرف نیا لب ولہجہ ہی عطا کیا ہے بلکہ ترقی پسند غزل کی روایت بھی مرتب کی ہے اور اسے فروغ دینے میں نمایاں کردار بھی ادا کیا ہے۔ مجروح کے یہاں طرز بیان کی یہ خوبی رومانی لب ولہجے اور اظہار کے بالواسطہ رویے سے عبارت ہے جو نہ صرف ایجاز و اختصار کا متقاضی ہے بلکہ غزل کا بنیادی وصف بھی ہے اور ظاہر ہے یہ صفت استعاروں کے فنکارانہ استعمال سے ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ اشعار دیکھیے:

تشنگی ہی تشنگی ہے، کس کو کہیے مے کدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے، کس کو پیمانہ کہیں
اس طرح سے کچھ رات کو ٹوٹے ہیں ستارے
جیسے وہ تری لغزشِ پا دیکھ رہے ہیں
جس طرف بھی چل پڑے ہم، آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل، اور گل سے گلستاں بنتا گیا

ان اشعار کی تاثیر بھی غور طلب ہے جن میں نہ صرف مجروح کا فکری انضباط ضیابار ہے بلکہ زندگی کا گہرا شعور اور سماجی احساس بھی بیدار ہے۔

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں جیسا کہ عرض کیا گیا غزل پر آشوب وابتلا کا زمانہ بھی گزرا۔ اس عہد کے بیشتر شعرائے عصری مسائل کی پیش کش کے لیے نظم کا پیرایہ بھی اختیار کیا لیکن مجروح چونکہ غزل کے مزاج سے کما حقہ واقف تھے، لہٰذا انھوں نے اس خیال کی نفی کردی کہ عصری صداقتوں کو اپنے اندر سمو لینے کی وسعت غزل میں نہیں ہے:

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروح
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو
یہ کوئے یار، یہ زنداں، یہ فرشِ مے خانہ
انھیں ہم اہلِ تمنا کے نقشِ پا کہیے
جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے
یہ نیازِ غم خواری، یہ شکستِ دل داری
بس نوازشِ جاناں، دل بہت پریشاں ہے

تاریخ انسانی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی تاریخ طبقاتی تضاد اور سماجی کش مکش کی تاریخ رہی ہے اور ہر دور میں طاقت کا توازن بھی غیر متوازن رہا ہے۔ اہلِ اقتدار نے قوت و دولت کی بدولت عام انسانوں کے حقوق کو پامال کیا ہے تاہم محنت کے ستم جھیلنے کے باوجود یہی طبقہ کامیاب و کامران بھی رہا ہے، اسی نے اجتماعی خوش حالی کی خاطر صدیوں جدوجہد بھی کی ہے اور اسی نے سماج کو اپنے خونِ جگر سے رنگینی بھی بخشی ہے۔ مجروح چونکہ تاریخی حقائق سے باخبر بھی ہیں اور ان کا شدید احساس بھی رکھتے ہیں لہٰذا ان کے یہاں مایوسی اور اداسی کا گزر نہیں ہونے پایا ہے۔ شکوہ بھی ضرور ہے لیکن حوصلے متحرک ہیں اس لیے زندگی کے امکانات بھی روشن ہیں:

اب زمین گائے گی، ہل کے ساز پہ نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
مجھے یہ فکر اپنی پیاس سب کی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے، مرا پیمانہ برسوں سے

مجروح کے یہاں یہ سماجی بصیرت اور عصری حسیت و آگہی، اسی تاریخی شعور کی دین ہے۔ ظاہر ہے دوسرے ترقی پسندوں کی طرح مجروح کے یہاں بھی زندگی سے مراد انفرادی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی ہے کیوں کہ یہی اجتماعی گروہ سماجی ترقی کا ضامن اور صالح اور روشن مستقبل کا امین ہے گو استحصال کا شکار بھی ہے لہٰذا توجہ کا زیادہ مستحق اور طلب گار بھی ہے۔ مجروح کی غزلوں میں یہ جانب داری اسی احساس کا اظہار ہے۔

مجروح کی شعریات کا ایک اہم مضمون سیاست کا بھی ہے جس میں انقلاب روس سے لے کر جدوجہد آزادی اور تقسیم وطن کا شعور نمایاں ہے اس پر مستزاد قید خانے تک کا سفر۔ مجروح کی زندگی میں اس نوجوان کی محرومیوں کا شکوہ بن کر ابھرا ہے۔ جس کے زیر اثر زندگی کی خوشگواریاں، نہ صرف شکستگی سے دوچار ہوئی ہیں، تاہم دل شکستگی کے ان مناظر اور مجروح کی شعریات میں در آئیں ان اضطرابی کیفیات کے باوجود ان کا عزم انھیں مایوس اور ناامید ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ ان اشعار کے تیور دیکھیے، اندازہ ہوگا کہ مجروح کے یہاں حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ کس حد تک رقصاں اور جولاں ہے:

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن، جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
دشت و در بنے کو ہیں مجروح، میدانِ بہار
آرہی ہے فصلِ گل، پرچم کو لہراتے ہوئے
یہ ذرا دور پہ منزل، یہ اجالا، یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی، خواب کی تعبیر نہ دیکھ

یہ خواب آزادی کا تھا، جس کی تعبیر کم از کم ترقی پسندوں کے یہاں نہ صرف معاشی و معاشرتی انقلاب کی تلاش سے ہم آغوش رہی بلکہ آزادی کا خواب عظمتِ انسانی کے فروغ، اجتماعی خوش حالی کی آرزومندی، غیر طبقاتی سماج کی تعمیر کے جذبے اور مساوات پر مبنی تھا۔ مجروح کے یہاں بھی آزادی کے اسی مثبت رویے کا استقبال دیکھا جاسکتا ہے:

مجروح اٹھی ہے موجِ صبا، آثار لیے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوئے رواں، کچھ دور نہیں
شبِ ظلم نغمۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں، کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

سانحہ تقسیم، ہجرت، خوں ریزی، تہذیبی وثقافتی قدروں کو شکست و ریخت اور فسادات نے تمام آرزوؤں کو پامال کرکے رکھ دیا۔ ناکامی کا احساس دامن گیر ہوا اور خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا منظر سامنے آیا۔ اس الم انگیز سانحے نے عام انسانوں کے ساتھ دانشوروں اور فن کاروں کو بھی متاثر و مجروح کیا۔ فیض کی داغ داغ اجالا، ساحر کی زمیں نے خون اگلا اور مطاہمت، مجاز کی جشن آزادی اور علی سردار جعفری کی خون کی لکیر وغیرہ شکست خوردگی کی انھی کیفیات کا منظر نامہ ہیں:

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ
آتی ہی رہی ہے گلشن میں، اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے، اعلانِ بہاراں ہوتا تھا
کام آئے بہت لوگ سرِ مقتلِ ظلمات
اے روشنی کوچۂ دل دار کہاں ہے

ملک کی تقسیم کے بعد سیاسی حالات پیچیدہ تر ہوتے، سماجی تخریب کاری عام ہوئی، اتحاد قومی منتشر ہوا اور انسان تو انسان زبان بھی عصبیت کا شکار ہوگئی۔ ساحر نے جشن غالب اور غزلیہ اشعار کے ذریعے، گوک چند محروم نے اپنی رباعی اور اشعار کے حوالے سے، جاں نثار، مخدوم، جذبی، مجاز، فضا ابن فیضی اور دوسرے شعرا نے اپنی شاعری کے توسل سے اس سیاسی فریب کاری کو برہنہ کیا اور مجروح نے تنگ نظر اردو مخالفین اور متعصب سیاست دانوں کی سازشوں کو آئینہ کیا۔

وہ جس پہ تمھیں شمع سرِ رہ کا گماں ہے
وہ شعلۂ آوارہ ہماری ہی زباں ہے
زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

اسی سے متعلق وہ احساسِ خودداری بھی ہے جو انسان کو آلام ومصائب کے پرشکن حالات میں بھی بے باک اور پرحوصلہ بنائے رکھتا ہے۔ مجروح کی شعریات انھی متحرک صفات پر استوار ہیں۔

■

Dr. Anwar Zaheer Ansari, Prof of urdu, Dept of Persian, Arabic & Urdu, Faculty of Arts, The Maharaja Sayajirao University of Baroda, Vadodara - 390002 (Guj)

احمد وصی

ایک گم نام ڈراما نظارۂ عشرت

ڈراما نظارۂ عشرت اردو کا ایک ایسا ڈراما ہے جسے ایک مسیحی ایس اے جان عبرت پسر ابن جان مخلص بدایونی تلمیذ حضرت عارف بدایونی (آرٹسٹ) نے قلمبند کیا۔ 36 صفحے کا مختصر سا یہ ڈراما عالی جناب بی ٹی بیڈلی کی فرمائش پر لکھا گیا جو میتھوڈسٹ مشن ضلع بدایوں کے بشپ تھے اور جن کا حلقہ دہلی تک تھا۔ اس ڈرامے کا سال اشاعت 1942 ہے اور اس کا دیباچہ بھی بشپ بی ٹی بیڈلی کا ہی لکھا ہوا ہے جو ایک پیراگراف میں دس سطروں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ ڈراما بدایوں کے ہونہار ہندوستانی مسیحی نوجوان مسٹر ایس اے جان عبرت کا تیار کردہ ہے۔ مسٹر جان نے یہ ڈراما میری درخواست پر لکھا ہے۔ یہ چھپنے کے لیے اس امید پر بھیجا جا رہا ہے کہ اردو جاننے والا طبقہ اس کی قدر کر کے فائدہ اٹھائے گا۔ میں نے یہ ڈراما اسٹیج پر تو دیکھا نہیں ہے پر چند مشنری صاحبان اور دیگر افراد سے جنھوں نے اس کو دیکھا ہے کافی تعریف سنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ڈرامے کے شائع کرنے سے نوجوان مصنف کی ضرور ہمت افزائی ہوگی۔ میری آرزو ہے کہ ہندوستان میں ہمارے نوجوانوں میں سے بیشتر حصہ ایسے مفید کام کے لیے بیدار ہو جائے تاکہ ایسی تفصیلات سے ہمارے خداوند یسوع مسیح کا جلال اور ملک کی بہتری ہو۔'' برٹش

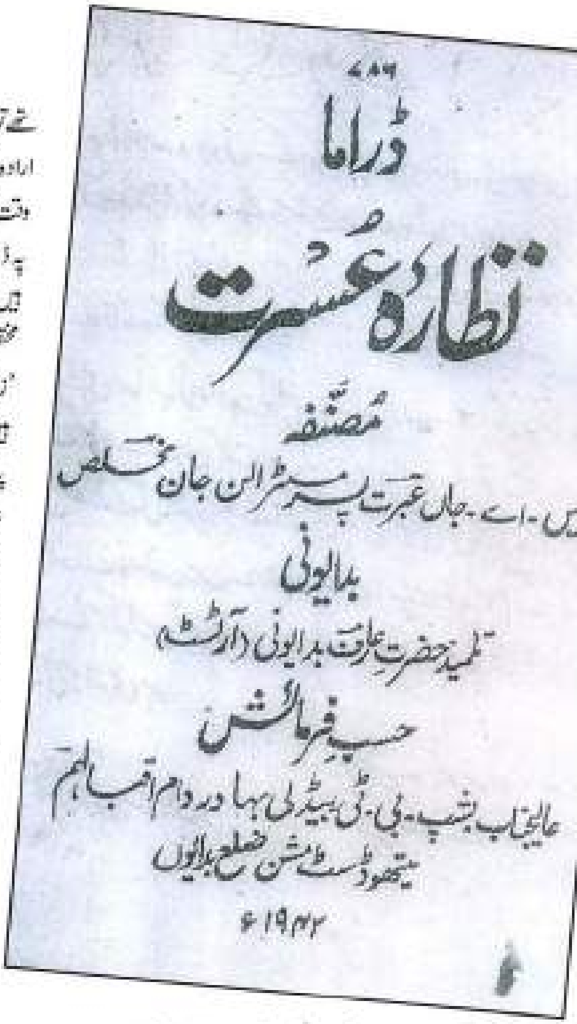
ڈراما
نظارۂ عشرت
مصنفہ
ایس۔ اے۔ جان عشرت پسر مسٹر الن جان مخلص
بدایونی
تلمیذ حضرت عارف بدایونی (آرٹسٹ)
حسب فرمائش
عالیجناب بشپ۔ بی۔ ٹی بیڈلی بہادر دام اقبالہم
میتھوڈسٹ مشن ضلع بدایوں
۱۹۴۲ء

تھوبرن بیڈلی دلی کے بشپ ، 21 جنوری 1942

اب سے 72 برس قبل بدایوں سے اردو میں شائع اس ڈرامے کا نام بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ ڈرامے پر کام کرنے والوں اور تحقیق کرنے والوں سے بھی اس ڈرامے کا تعارف کم ہی ہوا ہے۔ اس اجنبیت کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ڈراما مسیحی مشنری کے لیے لکھا گیا اور کھیلا جاتا رہا اور ایک مخصوص طبقے اور مسلک کے دائرے سے باہر نہیں نکلا۔

اگر ڈرامے کے پلاٹ پر نظر ڈالی جائے تو ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے جس سے اس پر ڈرامے کی چھاپ لگ سکے۔ حالانکہ یہ کوشش ڈرامائی ہی لگتی ہے مگر اس عہد کے اسٹیج کی ضرورت بھی تھی۔

ڈرامے کی ابتدا راہ مشکروں کی گائی حمد سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ڈرامے کے بنیادی کردار مظہر اور شیریں سامنے آتے ہیں اور ان کا بیٹا ظہیر جو بیمار ہے اور پلنگ پر پڑا ہے۔ مظہر اور شیریں کے مکالموں سے ان کی غربت، مفلسی، تنگ دستی اور بیکاری کا اندازہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ظہیر کا علاج ممکن نہیں۔ لہٰذا شیریں اپنی کامدار ساری اور ظہیر کے گلے کی سونے کی زنجیر فروخت کرنے کے لیے مظہر کو دیتی ہے جسے وہ بازار لے جاتا ہے مگر دونوں چیزوں کی قیمت لگاتا تو درکنار، مظہر کو چور سمجھ لیا جاتا ہے اور اسے پولیس تھانے لے جاتی ہے، جہاں اس کا پرانا کلاس فیلو ملتا ہے جو نہ صرف اسے رہائی دیتا بلکہ 5 روپے دے کر اس کی مالی مدد بھی کرتا ہے۔ اس دوران اس کا بیٹا ظہیر اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے اور مظہر کا بیمار باپ بھی الوداع کہہ کے دنیا چھوڑ دیتا ہے۔ مظہر ملازمت کی تلاش میں ایک مسلم دولت مند کے پاس جاتا ہے مگر جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مظہر مسیحی ہے تو وہ وعدے سے مکر جاتا ہے اور ملازمت دینے سے انکار کرتا ہے۔ مظہر کا خون کھولنے لگتا ہے وہ دولت مند کا خون کر دینا چاہتا ہے مگر اس کے مردہ باپ کی روح اسے انسانیت کی تلقین کرتی ہے، مسیحیت کا واسطہ دے کر انتقام کی آگ ٹھنڈی کرتی اور مظہر کو خون کرنے سے روک لیتی ہے۔ یہیں نہیں مظہر دل میں یہ طے کر لیتا ہے کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور شیریں کا پیٹ بھرے گا اور عزت کی زندگی بسر کرے گا۔ مظہر کو اس سے قبل بھی ایک دفتر میں ملازمت کے لیے جانے کا اتفاق اور تلخ تجربہ ہوا تھا وہ بی اے پاس تھا مگر دفتر میں وہاں کے ناظر نے کھلے عام اس سے رشوت طلب کی تھی۔ اب مظہر کا یہ فیصلہ کہ وہ ایک محنت کش کی طرح جیے گا اس کو تجربوں کے لیے اور سب کچھ گنوا کے عقل آنے کی بشارت ہی تھی۔ اس طرح ڈرامے کا اختتام دوطربیہ گانے پر ہوتا ہے۔

ڈرامے کا پلاٹ ذہن میں کئی سوال پیدا کرتا ہے۔ کرداروں کے نام مظہر، شیریں اور ظہیر مسلم کردار لگتے ہیں اور شروع میں ان ناموں سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ مسیحی ہیں۔ مسلم دولت مند اسی بنا پر اسے ملازم نہیں رکھتا کہ اس پر اب یہ راز کھلا کہ مظہر مسلم ہے، اس طرح کے اختلاف کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ مظہر جب ملازمت کے لیے دفتر میں جاتا ہے اور اس سے وہاں کا ناظر رشوت طلب کرتا ہے تب مظہر اپنے کلاس فیلو پولیس والے سے اس کی شکایت کیوں نہیں کرتا یا ملازمت پانے کا کوئی ذریعہ پولیس والے کو کیوں نہیں بتاتا حالانکہ وہ تعلیم یافتہ بی اے پاس ہے۔ مظہر کو اگر ملازمت نہیں ملتی اور گھر کے حالات اتنے بگڑے تھے تو پہلے ہی اس نے محنت مزدوری کرنے کا ارادہ کیوں نہیں کیا۔ یہ سارے سوالات اس وقت کہرے میں چھپ جاتے ہیں جب ذہن پہ ڈرامے میں شامل گانے دستک دینے لگتے ہیں۔ اور ایک شاعرانہ فضا بنتی ہے۔ یہ بہت مختصر ہیں۔ نثری مکالموں میں وہ بات نہیں جسے 'زور' کہا جائے مگر یہ کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور ایک حزنیہ ماحول بناتے جس میں تاثر پیدا ہوا ہے۔ 15 (پندرہ) گانوں سے۔ شاعری اس ڈرامے کا مثبت پہلو ہے۔ حمد، غزلیں، ہندی گیت، بچے کی صحت کا دعائیہ گانا، ہسپتال میں گیت، بچے کو دفناتے وقت گانا، یہ سارے نغمے اس بات کا ثبوت ہیں کہ "ڈراما نگار اس وقت کے اسٹیج کے تقاضوں سے واقف ہے اور ڈرامے میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے لیے شاعری سب سے موثر طریقہ اور ذریعہ ہے۔ ان گانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عشرت کو ڈراما نگاری آئے نہ آئے نغمہ نگاری کا فن آتا ہے اور اس ڈرامے میں گیتوں کے جز کو ضروری مانتے ہوئے اس پر توجہ دی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

'نظارۂ عشرت' بہت طویل ڈراما نہیں ہے، جیسا کہ میں نے شروع میں ہی لکھ دیا ہے۔ 36 صفحات کا یہ ڈراما گر گانوں کو موسیقی کے ساتھ کا کر بھی اسٹیج کیا جائے تو بھی 30 منٹ یعنی آدھے گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہے کیونکہ پرانے کاغذ پر یہ بیاض جیسا ہے۔

اس ڈرامے کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ ایک مسیحی کا قلمبند کیا ڈراما ہے جو ڈراما نگار سے زیادہ شاعر ہے لیکن اسے یہ احساس ہے کہ اپنے نظریے کو فروغ دینے کے لیے اگر مناسب میڈیا ڈراما ہے تو عوام کے دلوں تک پہنچنے والی زبان ہے اردو۔

ضرورت ہے کہ اس طرح کے دوسرے ڈراموں کی بازیافت بھی کی جائے تاکہ وہ بھی گمنامی کے بھنور سے نکل کر کھلے ساحل کی سیر کریں کیونکہ وہ بھی اردو کا سرمایہ ہیں اور انھیں بھی اب کھلی ہوا میں آ جانا چاہیے۔

■

Ahmed Wasi, 304, Hanjer Nagar, Pump House, Andheri (E), Mumbai - 400093
Mob.: 9833094497

شخصیت

تاجیکی ادب کا درخشاں ستارہ ابوالقاسم لاہوتی

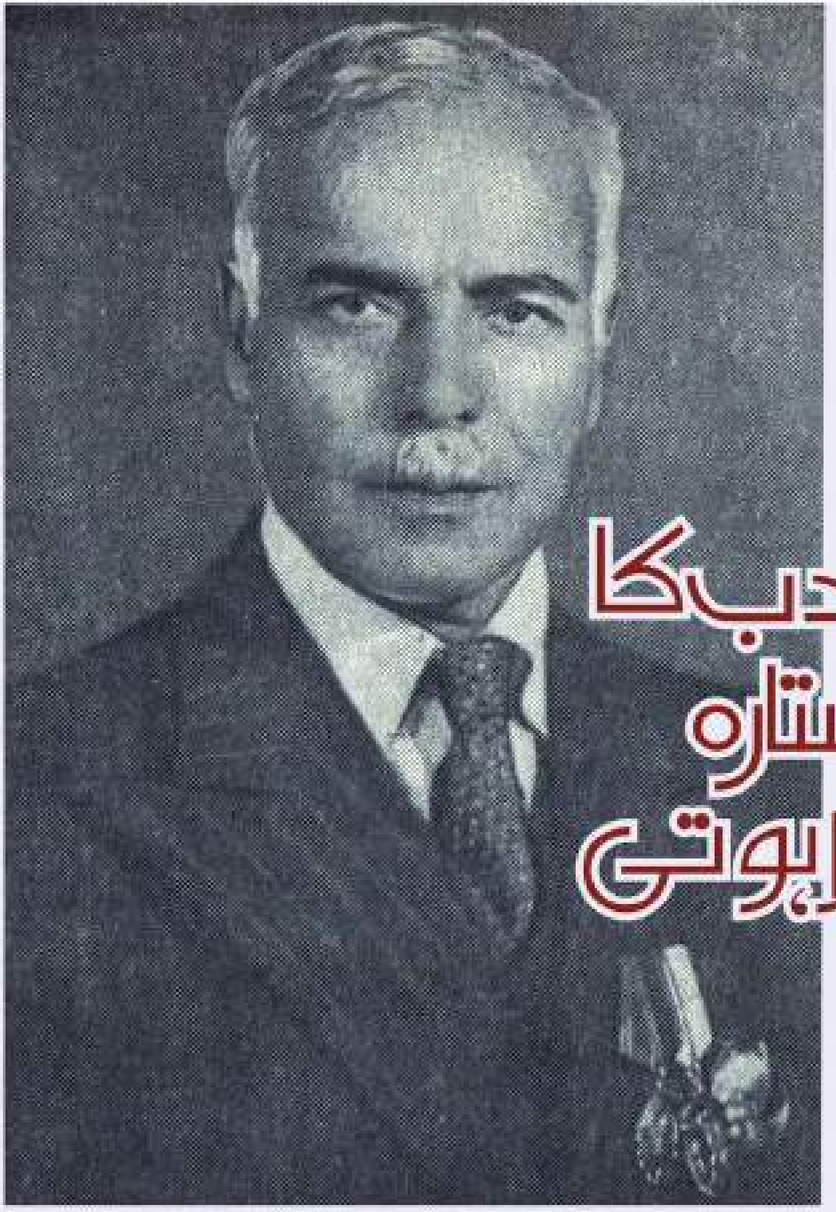

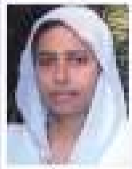

عابدہ خاتون

لاہوتی مغربی ایران میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اپنی جوانی میں ہی ایران سے تاجکستان چلے گئے، جہاں انھوں نے صدرالدین عینی کے ساتھ سوویت تاجیکی ادب کے سمت و سفر کو متعین کرنے میں اپنی زندگی وقف کردی اور اس طرح ان کا شمار سوویت تاجیکی ادب کے بانیوں میں ہونے لگا۔ پھر بھی انھوں نے اپنے وطن ایران اور اس کے عوام کو کبھی فراموش نہیں کیا، اور وہ اپنے رشحات قلم کو ہمیشہ اس جد و جہد کا ایک حصہ سمجھتے رہے جو مشرقی اقوام اپنی آزادی کے لیے کر رہی تھیں۔ وہ تاجکستان کے قومی ترانہ کے خالق اور قومی ترانہ کے تاجیکی مترجم بھی تھے۔

ابوالقاسم لاہوتی 4 دسمبر 1887 کو لاہوتی کرمانشاہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد احمد الہامی کو بھی شاعری سے لگاؤ تھا، لاہوتی بچپن سے ہی اپنے ملک کی حالت کا مشاہدہ کرتے رہے انھوں نے 1909 میں اپنی پہلی تخلیق ترقی پسند اخبار 'حبل المتین' (کلکتہ) کے لیے لکھی اور وہیں شائع کروائی جس کا عنوان 'اے رنجبر' تھا۔ اس نظم میں انھوں نے سماجی نابرابری پر تنقید کی تھی۔ ایران کی ناکام بغاوت کے بعد لاہوتی کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا مگر وہ جان بچا کر بغداد روانہ ہوگئے۔ 1915 میں پھر وہ اپنے وطن واپس آئے۔ تاکہ شہنشاہیت کے خلاف جو عام پسند تحریک چل رہی تھی اس میں وہ بھی حصہ لے سکیں۔ لاہوتی نے 1917 میں 'فرقۂ کارگر' کی بنیاد ڈالی۔ اس جماعت نے اپنے قیام کے روز اول سے ہی روسی انقلاب کی تائید اور نئی سوویت حکومت کے خلاف مداخلت کی مخالفت کی۔ جب 1918 میں ایران پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو اس جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اور لاہوتی کو اس بات کے لیے مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے وطن سے ترکی میں پناہ لیں۔ 1921 میں انھوں نے اپنا رسالہ 'پارس' ترکی سے جاری کیا، جب اس رسالے کی اشاعت معطل کر دی گئی تو وہ اپنے وطن واپس چلے آئے جہاں کی صورت حال میں گیلان کی ناکام بغاوت کی وجہ سے کشیدگی تھی۔ لاہوتی نے ہائی مسلح پولس کی قیادت میں اپنی جگہ ہموار کر لی اور 1922 میں تبریز کی دوسری بغاوت کی سربراہی کی جو شورش لاہوتی خان کے نام سے بھی مشہور تھی۔ جمہوری اصلاحات نافذ ہونے کے دس دن بعد ہی تبریز پر رضا خان کی فوجوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا اور لاہوتی جس کا سر لانے والے کو انعام سے نوازنے کا اعلان کیا گیا تھا دوسرے باغیوں کے ساتھ پھر سوویت یونین چلے گئے۔

لاہوتی کے وہ اشعار بھی جو سوویت یونین آنے سے پہلے لکھے تھے شاعر کے ترقی پسندانہ نقطہ نظر کی عکاسی کرتے ہیں اور اس مخصوص انداز بیان کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جو اس کے بعد کی تخلیقات کی امتیازی خصوصیت ہے، جس کو پرولتاری طرز انشا کہتے ہیں۔ جہاں خاقانی ان اینٹوں کی بات کرتے ہیں جو گذشتہ لوگوں کی خاکستر سے بنائے گئے ہیں وہیں لاہوتی ان محلوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں جو غریبوں کی خاکستر پر بنائے گئے۔ اسی طرح وہ اپنی نظم شمع و پروانہ میں عورتوں یا خدا سے متصوفانہ محبت کی باتیں کرنے کے بجائے 'مادر وطن' کے موضوع پر شعر کہتے ہیں لیکن 1922 تک ان کی شاعری کا زیادہ تر زور کا مزاحمتی پر ہے۔ اس کے پاس کوئی واضح اور دو ٹوک دستور عمل بھی نہیں ہے صرف سوویت یونین پہنچ کر ہی وہ اپنے آپ کو ان تصورات سے آشنا کر سکے جو سوشلسٹی تصورات ہیں۔

لاہوتی کی منظومات کی تعداد بہت ہیں جس میں وہ میں رزمیہ نظمیں بھی شامل ہیں جو صنف 'داستان' میں لکھی گئی ہیں، ان کی نظمیں تاجیکی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں دوشنبہ، ماسکو اور تبریز سے اس کے کئی مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

دیوان اشعار (1940) اور سرودستان (1944) میں سے ڈیڑھ سو نظموں کی دھنیں بھی بنائی گئی ہیں تاکہ ان کو گایا بھی جاسکے۔ اس کے علاوہ اشعار سال ہائے مختلف 'سرودہائے آزادی وصلح' اور آثار منتخب یہ تینوں دیوان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لاہوتی کی اہم ترین تخلیقات میں قصیدہ 'کرمل' بھی شامل ہے جس کی اشاعت 1923 میں ہوئی تھی۔ یہ قصیدہ کلاسیکل قصائد کے انداز میں لکھا گیا ہے اور بارہویں صدی عیسوی میں لکھے گئے۔ خاقانی کے قصیدہ 'خرابہ مدائن' کی دوسری صورت لگتا ہے پوری فارسی شاعری میں اس نظم کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک اس نظم کی صرف یہی اہمیت نہیں ہے کہ 'خرابہ مدائن' کے جواب میں لکھی گئی ہے بلکہ اس کی اصل اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ خاقانی کے افکار وخیال سے گریز وانحراف کرنے کے باوجود خاقانی کے اسلوب کی نہ صرف توسیع کرتی ہے بلکہ صنف قصیدہ کو ایک نئی جہت بھی عطا کرتی ہے۔ کرمل جس کو فرانسیسی زبان کے تتبع میں کرملن بھی کہا جاتا ہے ایک مشہور ومعروف محل کا نام ہے جس میں روس کے زاری حکمراں رہا کرتے تھے۔ یہ محل شہر ماسکو کے وسط میں واقع ہے۔

لاہوتی روس میں جمہوری حکومت کے قائم ہوجانے کے چھ سال بعد جب اس محل کو چشم جویان وگریان سے دیکھتے ہیں تو ان پر بھی کچھ ایسے ہی تاثرات طاری ہوتے ہیں جو مدائن کے کھنڈروں کو دیکھنے سے خاقانی پر ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تا چند کنی گریہ برمسند نوشروان
در قصر کرمل، ای دل، اسرار نہان برخوان
این قصر کی می بینی برروی تو می خندد
برکشتہ ' مظلومان بسیار شدہ گریان
در داخل ہر دیوار بادیدہ سر بنگر
پیکر بسر پیکر، ستخوان بسر ستخوان
از خون دل خلقست ہر نقش دراین گنبد
خاک تن مزدوراست ہر خشت دراین ایوان
از آہ شہید انست ہر دود ان برپا
از اشک یتیمانست ہر درکہ دران غلطان

"اس نظم میں لاہوتی کہتے ہیں کب تک تم نوشیرواں کے مسند (تخت وتاج) پر نالہ وفریاد آہ وزاری کرتے رہوگے کریملن کے محل میں اے دل اپنے چھپے ہوئے راز سارے وہ مظلوم جو قتل کر دیے گئے ہیں ان پر یہ محل بہت روچکا ہے۔ تم ہر دیوار کے اندر حقیقت کی نظر سے دیکھو تو دکھائی دے گا کہ ڈھانچے کے اوپر ڈھانچہ اور ہڈی کے اوپر ہڈی پڑی ہوئی ہے۔ اس گنبد میں جتنے بھی پھول پتی بنے ہوئے ہیں سب کے نیچے

مخلوق کے ارمان اور دل کا خون ہے اس ایوان میں لگی ہوئی ہر اینٹ مزدور کے جسم کی مٹی سے بنی ہوئی ہے وہاں جو بھی دھواں نظر آتا ہے وہ شہیدوں کی آہ سے اٹھا ہوا ہے اور جو یہاں موتی ڈھلک رہے ہیں وہ یتیموں کے اشک کے موتی ہیں۔"

1925 میں لاہوتی دوشنبہ آگئے (1929 سے 1961 تک اس مقام کا نام استالن آباد تھا) جہاں صدر الدین عینی سے ان کی دوستی ہوئی اور وہ تمدنی میدان عمل میں سرگرم کار ہوگئے۔ وہ اپنے اشعار تاجیکی رسائل وجرائد میں شائع کرواتے رہے۔ 1933 کے بعد سے ان کا بیشتر کلام تاجیکی رسالے برائے سوشلسٹی میں شائع ہوتا رہا۔ لاہوتی ان چند اولین شعرا میں سے تھے جنھوں نے تاجیکی شاعری کو سیاسی، سماجی موضوعات سے روشناس کرایا تھا لیکن اسی کے

ساتھ ساتھ وہ کلاسیکی انداز کی عشقیہ غزلیں بھی لکھتے رہے۔ جو تاجیکی عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے پس ماندگی، توہمات، نجات (آزادی)، نجات نسواں اور سوشلسٹی ضوابط کے لیے تڑپتے رہے۔ صدرالدین عینی نے لاہوتی کو بجا طور پر 'ادیب سرخ' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ 1934 سے تاجیکستانی شاعری اور نثر نگاری کی انجمن کی قیادت ان کے سپرد ہوئی۔ لیکن اور کئی دوسرے تحفے ان کو ملے تاجیکستان میں 'ابوالقاسم لاہوتی' کے نام پر ایک تھیٹر کی بنیاد پڑی اور ایک شاہراہ ان کے نام سے منسوب ہے۔ اس کے علاوہ تاجیکستان میں صحافت ایوارڈ جو بہترین تصنیف پر دیا جاتا ہے 'لاہوتی ایوارڈ' نام رکھا گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لاہوتی نے ان موضوعات میں مزید وسعت پیدا کی، جن کو وہ اپنے اشعار میں بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے موضوعات صرف سویت یونین، سوشلسٹی

اصلاحات، مشرق کے مسائل جیسے وقتی مسائل تک ہی محدود نہ تھے بلکہ وہ ان مسائل سے زیادہ اہم سوالوں مثلاً اقوام کی باہمی بھائی چارگی اس کے لیے جدوجہد اور اس فاشزم کی خالفت کو موضوع بحث بناتے رہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی آخر الذکر موضوع کو ان کی اہم ترین نظم 'انتظر خواہیم کرد' (1930) میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری نظم 'باغبان' (1932) کا موضوع سویت یونین میں بسنے والے تمام برادرانہ تعلقات کو مستحکم کرنا ہے۔ یہ نظم وسط ایشیا کے قوم پرستوں کے خلاف لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ 'تاج وبیرق' (1935) مخلوط زندگی سے مستعار ایک رزمیہ نظم ہے جو نہ صرف شاہنامہ سے ماخوذ ہے بلکہ شاہنامہ ہی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں لاہوتی نے جو اہم نظم لکھی اس کا عنوان 'ہم سفران' ہے اس نظم کے موضوعات تاجیکی اور ایرانی عوام میں متداول راسخ عقائد وروایت سے مستعار ہیں، اسی طرح ان کی دوسری نظم 'پہلوان آشتی' بھی اسی قبیل کی نظم ہے۔ لاہوتی کی داستان 'تلہ سعید' (1942) جنگ کے زمانے میں لکھی جانے والی روسی شاعری کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اس نظم میں انھوں نے نوجوان زویا کی شجاعت وبہادری کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ جو ایک بے ضابطہ سواروں کے دستے کا جوانمرد تھا اور جس کو نازیوں نے پھانسی دے دی تھی، لیکن اسی زمانے میں لاہوتی نے کافی تعداد میں غزلیں بھی کہیں مثلاً 'فرزند تاجیک'، 'منظر سدا رکس' اور 'نغمہ لینن گراد' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد اپنے انتقال کے صرف آٹھ سال قبل لاہوتی نے ایک نظم 'پری بخت' (1948) کو اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے لینن کے (1917) کے قیام رزیو کی تصویر کشی کی ہے لیکن یہ نظم اپنی طوالت اور بعض مناظر میں تمثیل نگاری کی وجہ سے ہدف تنقید بھی بنی تھی۔

لاہوتی نے تاجیکی ڈرامے کی زبردست خدمات انجام دیں وہ اولین تاجیکی لبرٹو کا مصنف ہے اس نے مقبول عام اوپیرا 'کاوہ آہنگر' کے لیے لکھے تھے۔ یہ اوپیرا فردوسی کے شاہنامہ کے ایک موضوع سے مستعار ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لاہوتی کے شہکار قلم پورے سویت یونین میں مشہور ہوچکے تھے۔ اور چالیس سے زائد دفعہ ان کی کئی اشاعتیں ہوچکی تھیں۔ ان کے اشعار کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے۔ جن میں مغربی زبانیں بھی شامل ہیں۔ لاہوتی نے تمام کلاسیکی اصناف سخن میں خواہ وہ غزل ہو رباعی مخمس ہو یا لوری طبع آزمائی کی لوری ایک قدیم صنف سخن ہے اتنی ہی قدیم جتنا کہ انسان خود ہے یہ گیت مائیں

اپنے بچوں کو سلاتے وقت سنایا کرتی ہیں۔ لاہوتی کی لوری کالالائے مادر پہلی فارسی لوری ہے جس کو ادب کے زمرے میں جگہ دی گئی ہے اس لوری میں لاہوتی نے ایران کے عمومی حالات پر گہری نظر ڈالتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کو یہ پیغام دیا کہ اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ اب تک جتنی بھی فارسی لوریاں نظم کی گئی ہیں ان میں لاہوتی کی لوری پہلی لوری ہے جس میں کسی راج دلارے کو مخاطب کر کے اس کو پریوں اور جنوں کے قصے نہیں سنائے گئے ہیں بلکہ اس میں اپنی قوم کے عمومی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ماں کی زبان سے بچے کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اپنے ناموس کو بچانے کے لیے وہ جان کی بازی لگادے اس لوری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ سونے کے لیے نہیں بلکہ جگانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تو کودک ایرانی ایران وطن تست
جان راتن بی عیب بکار است، بالام لائی
تو جانی وایران چوتن تست
بر خیز سلحشور، تو در حفظ وطن کوش
ای تازہ گل ایران زچہ خواست، بالام لائی
پس جامۂ عزت بہ بدن پوش
جای تو نہ گہوارہ بود، جای تو زین است
ای شیر پسر وقت شکار است، بالام لائی

"ماں بچے سے کہتی ہے اے میرے راج دلارے تو ایران کا بچہ ہے اور ایران تیرا وطن، اپنے وطن کے لیے اپنی جان کی بازی بھی بغیر کسی جھجک کے لگا دو۔ تو ایران کی جان ہے اور ایران تیرا جسم ہے۔ اے میرے راج دلارے اٹھو، تیار ہو جاؤ اور اپنے وطن کی حفاظت کی کوشش کرو۔ اے سرزمین ایران کے تازہ پھول مجھ سے جو کچھ چاہتا ہے بتا میں لاؤں۔ اے میرے راج دلارے تجھے چاہیے کہ عزت کا لباس اپنے جسم پر ڈال۔ تیری جگہ یہ جھولا نہیں ہے تیری جگہ زین ہے یعنی گھوڑے پر سوار ہو (جان کی بازی لگانے کے لیے ماں بچے سے کہتی ہے) اے شیر دل بیٹے یہ وقت سونے کا نہیں بلکہ شکار کا ہے (یعنی دشمن سے لڑنے کا)۔"

لاہوتی کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ فارسی کی قدیم ہیئتوں میں جدید سے جدید تر مضامین کو اس طرح نظم کرتا ہے کہ وہ بیسویں صدی کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں سوویتی شہری ہونے کے بعد جب لاہوتی کو اطمینان وسکون کی حسب خواہش زندگی بسر کرنے کا موقع ملا تو ان کی شعری سرگرمیوں میں روز افزوں اضافہ ہوتے لگا ان کی بیشتر اہم تخلیقات جو بالعموم طویل ہیئتوں میں لکھی گئیں ہیں اسی دور کی یادگار ہیں جن میں کئی 'داستانیں' بھی شامل ہیں۔ لاہوتی تاجیکستان میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے اپنے وطن ایران اور اس کے عوام کو بھی فراموش نہیں کیا ہم وطنوں کے لیے تڑپ تڑپ کر شعر لکھتے خود کہتے ہیں:

بشنو آواز مرا از دور، ای جانان من
ای گرامی تر زچشمان، خوب تر از جان من
اولین الہام بخش وآخرین پیمان من
کشور پیر من، انا پیر عالیشان من
طبع من، تاریخ من، ایمان من، ایران من
من جو افتادہ از پیش تو فرزند تو ام
لیک روحا پای، بند مہر و پیوند تو ام
دایما گویا کہ در آغوش دلبند تو ام
وانہ بگذشت بی مثل ومانند تو ام
مخلص تو، عاشق تو، آرزو مند تو ام

"لاہوتی جب پچیس سال کے تھے اور ایران سے دور اپنی زندگی گزار رہے تھے اس وقت وہ اپنے ہم وطن یعنی ایران والوں سے مخاطب ہیں۔ کہتے ہیں میری آواز سنو دور سے

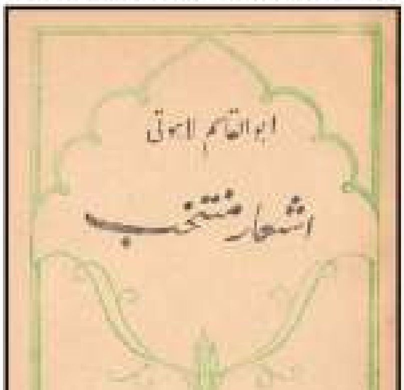

اے میرے محبوب! تو میری آنکھوں سے بھی زیادہ محترم ہے اور میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تو ہی میرا پہلا الہام ہے اور تو ہی آخری عہد بھی۔ اے میرے بزرگ ملک تو میرے عظمت و بزرگی ہے۔ میری طبیعت، میری تاریخ، میرا ایمان میرے ایران سب کچھ تو ہی ہے۔ میں تیرے سامنے تنہا پڑا ہوا ہوں میں تیرا بیٹا ہوں۔ میں روح سے تیری محبت میں لگا ہوں اور تجھ سے جڑا ہوا ہوں (جس طرح ماں کا رشتہ بچے سے جدا نہیں ہوتا اسی طرح اے وطن میرا رشتہ بھی تجھ سے جدا نہیں ہے) جیسے میں ہمیشہ تیری آغوش کا پالا ہوا ہوں۔ یہ سب باتیں چھوڑو! میں ایسا بے مثل ہوں جس کا کوئی نظیر نہیں ہے جیسے تو۔ تیرا مخلص، تیرا عاشق، تیری خواہش سب کچھ میں ہوں۔"

تاجیکستان میں راحت وآسائش کی زندگی گزارنے کے باوجود ایران کی یاد سے کبھی بھی غافل نہیں رہے اپنے بچپن اور جوانی کے مناظر بار بار یاد آتے رہے۔ وہ اپنے عزیز وطن اور ہم وطنوں کی خوشحالی اور آزادی کے لیے ہمیشہ پریشان رہے اور انھیں پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے لیے ابھارتے رہے:

ایرانیان، ایرانیا
یاری کنم، یاری کنم
زخمی شدہ جسم وطن
خیزید وغمخواری کنیم
ای شیران ترک، ای گردان کرد
اے مردان فارس، از بزرگ وخرد
دوستانہ بہ یکدیگر دست دہید
اردوی ستم را شکست دہید

"اے ایران والو، اے ہم وطنو۔ میں تم سے دوستی کرتا ہوں میں اپنا ہاتھ دیتا ہوں، وطن کا جسم زخمی ہو گیا ہے اٹھو اور سب مل کر غمخواری کرو۔ اے ترک کے شیر، اے کرد کے بہادروں، اے فارس کے لوگوں، اے بچوں اور بڑوں ایک دوسرے سے دوستی کے لیے ہاتھ بڑھاؤ ظلم وستم کے لشکر کو شکست دو۔"

لاہوتی کے تراجم بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں، انھوں نے شیکسپیئر کا ترجمہ کر کے تاجیکی ادبیات کو آزاد نظم سے روشناس کرایا۔ لاہوتی کے تراجم کے ذریعے تاجیکی اور فارسی ادبیات کو پوشکن، گورکی، مایا کووسکی، شیکسپیئر اور دوسرے مشہور مغربی مصنفین سے روشناس کرایا۔

تہذیبی تسلسل کو برقرار رکھنے کا جو جذبہ لاہوتی کی شاعری میں زیریں موج بن کر کارفرما ہے اس نے ان بعد کی آنے والی تاجیکی نسلوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ آج بھی اپنی قدیم ہیئتوں کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تر موضوعات پر فن کی تمام پابندیوں کے ساتھ اشعار کو آئینہ ایام بنائے ہوئے ہیں جدید تاجیکی شعرا کا صرف یہی ایک عمل عصر حاضر میں لاہوتی کی شاعری کی اہمیت اور معنویت کا غماز ہے۔

ماخوذ ومصادر

1. سرودھای آزادی وصلح: ابوالقاسم لاہوتی
2. اشعار سالھای مختلف: ابوالقاسم لاہوتی
3. آثار منتخب: ابوالقاسم لاہوتی
4. جو یبار لحظہ ھا: دکتر محمد جعفر یاحقی
5. سخنوران ایران در عصر حاضر: محمد اسحٰق
6. تاریخ تحلیلی شعرنو: شمس لنگرودی (جواہر گیلانی)

Aabida Khatoon, Research Scholar, Dept of Arabic and Persian, Danishgah, Allahabad, UP

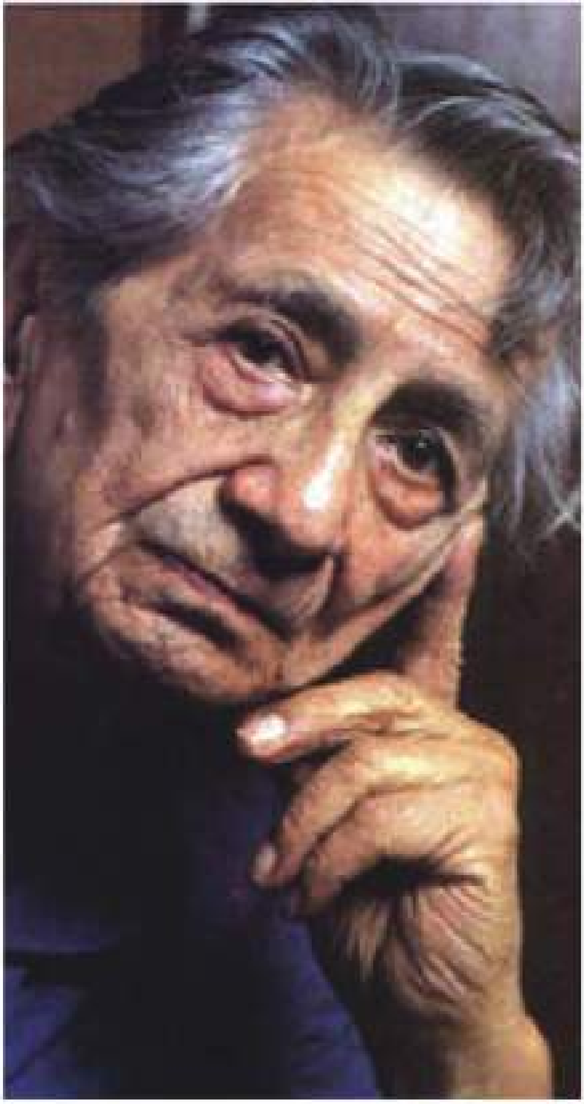

انیس امروہوی

ایک روشن خیال شخصیت
بھیشم ساہنی

ہندوستان کے صوبہ پنجاب نے جہاں زندگی کے بہت سے شعبوں میں بڑے بڑے فنکار، دانشور اور اہلِ قلم پیدا کیے ہیں، وہیں فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے کئی ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار بھی دیے ہیں۔ اقبال، ساحر لدھیانوی، پرتھوی راج کپور، دلیپ کمار، راج کپور، راج کھوسلہ، بی آر چوپڑہ، یش چوپڑہ، راجندر سنگھ بیدی، بلراج ساہنی، دھرمیندر، پران، نور جہاں وغیرہ ادب اور آرٹ کے اہم ستون ہمیں پنجاب سے ہی ملے ہیں۔ ایسے ہی عظیم فنکاروں اور تخلیق کاروں میں ایک اہم شخصیت بھیشم ساہنی کی بھی ہے، جو نہ صرف قلم کے دھنی تھے، بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل، سچے، ہمدرد اور حساس دل و دماغ کے انسان بھی تھے۔

بھیشم ساہنی کا جنم 8 اگست 1915 کو راولپنڈی میں ہوا تھا، جو تقسیمِ وطن کے بعد اب پاکستان میں ہے۔ راولپنڈی دو بڑے شہروں کے بیچ ایک نسبتاً چھوٹا شہر تھا، ایک طرف لاہور اور دوسری طرف پشاور۔ دونوں کے درمیان راولپنڈی آباد تھا۔ پشاور کے لوگ پرانی وضع کے تھے، جبکہ لاہور نئی روشنی کا شہر تھا، لیکن اُن کے بچپن میں ہی راولپنڈی میں بھی نئی روشنی آنے لگی تھی اور شہر کے قدم ماڈرنٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آزادی کی تحریک کی وجہ سے لوگوں میں ایک نیا سیاسی شعور بھی پیدا ہو رہا تھا۔ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلائی جانے لگی تھی اور نمک کا قانون بھی توڑا جانے لگا تھا۔

بھیشم ساہنی کے والد ہربنس لال ساہنی راولپنڈی کے چھاچھی محلے کے ایک دو منزلہ مکان میں اپنی بیوی لکشمی، دو بیٹوں بلراج اور بھیشم، اور دو بیٹیوں، ویراں اور سمترا کے ساتھ رہتے تھے۔ ان سب بچوں میں بھیشم ساہنی سب سے چھوٹے تھے۔ اُن کے والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے، جس میں کمیشن کے طور پر اوسط آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ اُن کے والد کی بازار میں کوئی دُکان نہیں تھی، بلکہ گھر پر ہی مکان کے نچلے حصے میں انھوں نے ایک چھوٹا سا دفتر بنا لیا تھا۔ باقی خاندان گھر کے اوپری حصے میں رہتا تھا۔ بھیشم ساہنی کے والد ہربنس لال ساہنی آریہ سماجی خیالات کے تھے اور راولپنڈی کے آریہ سماج کے منتری بھی تھے۔

بلراج اور بھیشم ساہنی دونوں بھائیوں کو بچپن میں گرکل میں سنسکرت پڑھنے کے لیے بھیجا گیا، مگر وہاں دونوں کا دل نہیں لگا اور ایک دن بلراج نے اپنا فیصلہ اپنے والد کو سنایا کہ وہ اب گرکل میں نہیں بلکہ اسکول میں پڑھیں گے۔ اُن کے والد اس بات پر چونکے تو ضرور...... لیکن حقیقت میں بلراج نے جیسے اُن ہی کے دل کی بات کہی تھی۔ وہ اپنا سارا کاروبار انگریزی یا اُردو میں کرتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ نئی طرز کی تعلیم اب بچوں کے لیے ضروری ہو گئی ہے۔ ان کی والدہ بھی بچوں کو نئی تعلیم دلانے کے حق میں تھیں، اس لیے دونوں بھائیوں کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ بڑے بھائی بلراج ساہنی بھیشم ساہنی سے صرف دو سال ہی بڑے تھے، مگر انھیں چوتھی کلاس میں اور بھیشم ساہنی کو پہلے درجے میں داخلہ ملا۔

بھیشم ساہنی کو بچپن سے ہی اپنے خاندان میں ہی ادبی ماحول مل گیا تھا۔ لہٰذا ادیب بننے کے لیے انھیں کوئی خاص محنت یا جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ اُن کی دو پھوپی زاد بہنیں کشمیر میں رہتی تھیں، جن میں سے ایک پروشارتھ وتی کے شوہر جانے مانے ادیب اور مدیر چندر گپت ودیالنکار تھے۔ جو ادب پر اکثر بحثیں کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا اُن کے ادیب بننے میں زیادہ دخل اُن کے خاندان کے ماحول کا ہی تھا اور اُس میں ان پھوپی زاد بہنوں کی بہت بڑی حصے داری تھی۔

بھیشم ساہنی نے بچپن میں اپنی ماں سے سنا تھا کہ اُن کی دادی بھی کویتا کہتی تھیں اور اُن کے کاروباری والد نے بھی بتایا تھا کہ ایک زمانے میں انھوں نے بھی ایک ناول لکھا تھا، مگر وہ شائع نہیں ہو سکا تھا، اور بڑے بھائی بلراج ساہنی بھی...... لڑکپن سے ہی نظموں کے ذریعے اپنے ادبی جذبات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ صرف 15 برس کی عمر میں ہی وہ اُردو میں شعر کہنے لگے تھے، اور وہ آگے چل کر فلموں کے مقبول ترین اداکار بنے...... اور جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تو بلراج ساہنی نے ایک پوری نظم انگریزی میں بھگت سنگھ کی یاد میں لکھ ڈالی۔

بلراج اور بھیشم ساہنی، دونوں بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بھیشم ساہنی مڈل کلاس تک تعلیم حاصل کرنے کے لیے راولپنڈی میں ہی رہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ لاہور گئے جہاں سے انھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان میں ممبئی، انبالہ، جالندھر وغیرہ کئی جگہ رہنے کے بعد آخرکار وہ دہلی میں بس گئے جہاں اُن کے والد نے نواحی علاقے میں کی نئی بستی پٹیل نگر میں ایک مکان خرید لیا تھا۔ دہلی کے دِلّی کالج میں، جو اب ذاکر حسین کالج کے نام سے جانا جاتا ہے، بھیشم ساہنی انگریزی کے لیکچرار رہے۔ تب تک وہ ہندی کے ادیب بن

بچکے تھے۔ کالج کی ملازمت پکی کرانے کے لیے انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی لیکن اس کے لیے انگریزی میں جو مقالہ لکھا، اس کا موضوع ہندی ادب سے تعلق رکھتا تھا، اور اس کے لیے انھوں نے بنارس جاکر گہرا مطالعہ کیا۔ وہیں انھیں ہندی کے مشہور ادیب ہزاری پرساد دویدی، نامور سنگھ اور وشوناتھ ترپاٹھی سے بھی قربت حاصل رہی۔ بعد میں وہ کئی برس تک اپنے خاندان کے ساتھ ماسکو میں رہے۔ جہاں انھوں نے روسی زبان سیکھی، اور لگ بھگ دو درجن روسی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا۔ اس طرح وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کئی زبانوں کے بھی ماہر ہوگئے تھے۔ اُن کی مادری زبان پنجابی تھی اور انھوں نے ہندی، اُردو، سنسکرت، انگریزی اور روسی زبانوں کا علم خود حاصل کیا تھا۔ بول چال میں وہ پنجابی اور ہندی اُردو کی ملی جلی ہندوستانی اور انگریزی زبان کا استعمال کرتے تھے، لیکن اُن کا سارا تخلیقی ادب ہندی زبان میں ہی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں عام طور پر پریم چند کی طرح سیدھی سادی زبان لکھتے تھے، لیکن درمیان میں کہیں کہیں پنجابی الفاظ اور محاوروں کا آسانی سے استعمال کرلیتے تھے۔

بھیشم ساہنی نے تحریک آزادی کی لڑائی اور تقسیم وطن کے سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ انھوں نے بچپن سے ہی ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ انھوں نے سبھی مذاہب کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو لوگوں کے عمل سے ظاہر ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ملکی اور عالمی سیاست کی انھیں گہری سمجھ تھی۔ بھیشم ساہنی نے پہلے کانگریس میں اور بعد میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوکر ملک اور سماج کی خدمت کرتے ہوئے اپنے تجربات سے آزادی کی تحریک اور سماج واد کے سبق پڑھے تھے۔ آزادی، برابری اور جمہوری اقدار میں اور فرقہ وارانہ اتحاد کے اصولوں میں اُن کا گہرا یقین تھا۔ یہی تجربات، خیالات اور اصول اُن کے تخلیقی ادب میں روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بھیشم ساہنی جب راولپنڈی کے انٹر کالج میں پڑھتے تھے، تب انھوں نے وہاں کی ادبی میگزین کے لیے اپنی پہلی کہانی لکھی تھی جس کا عنوان 'ابلا' تھا اور جو 1934 کے آس پاس شائع ہوئی۔ ملک کے بٹوارے کے لگ بھگ چالیس برس بعد لاہور کے گورنمنٹ کالج کی 100 ویں سالگرہ پر کالج کی میگزین 'راوی' کے مدیر یاسر ہاشمی نے اس کہانی کو دوبارہ شائع کیا۔ بھیشم ساہنی ایک کہانی کار ہی نہیں ڈرامہ نگار بھی تھے، اور انھیں ڈرامہ نگار بنانے میں بھی اس کالج کا اہم حصہ رہا ہے۔ کالج کے اسٹیج پر اس زمانے میں لڑکیوں کا رول بھی لڑکے ہی ادا کرتے تھے، لہٰذا بھیشم ساہنی نے وہاں پر دو ڈراموں میں لڑکیوں کا ہی رول ادا کیا تھا۔

لاہور میں زیر تعلیم بھیشم ساہنی کا تعلق وہاں کے کئی ادبی لوگوں سے قائم ہوگیا تھا۔ ان کے بہنوئی چندرگپت ودیالنکار وہیں رہتے تھے، لہٰذا بھیشم ساہنی کالج کا ہاسٹل چھوڑ کر ان کے گھر پر ہی رہنے لگے۔ چندرگپت جی ہندی کے مقبول ادیب تھے۔ لاہور میں اُن دنوں وہ اپنا پبلشنگ ہاؤس بھی چلا رہے تھے۔ جہاں کالج کا ماحول انگریزیت لیے ہوئے تھا، وہیں چندرگپت جی کے گھر میں ہندی ادب کا ماحول رہتا تھا۔ واتسیاین جی سے وہیں پر پہلی بار بھیشم ساہنی کو ملنے کا موقع ملا، اور دیو چندر ستیارتھی سے بھی۔ اُن ہی دنوں اُپیندر ناتھ اشک کو بھی سائیکل پر سوار سڑکوں پر آتے جاتے اُنھوں نے دیکھا تھا۔ لاہور میں بھیشم ساہنی نے رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی دیکھا اور اُدے شنکر اور اُن کی منڈلی کا یادگار رقص بھی دیکھا تھا۔ برسوں بعد جب المورڑہ میں اُدے شنکر نے اپنا مرکز قائم کیا، تو اُن کی کلپنا نام کی تخلیق بھی انھوں نے دیکھی جس میں سمترانندن پنت بھی ایک شاعر کا رول ادا کر رہے تھے۔

بھیشم ساہنی کے والد ہربنس لال ساہنی نے بڑے بیٹے بلراج ساہنی کی پڑھائی پوری ہونے پر انھیں اپنے کاروبار میں شامل کرلیا تھا۔ ایم اے پاس کرکے راولپنڈی واپس آنے پر بھیشم ساہنی کو بھی انھوں نے کاروبار میں لگانا چاہا۔ بعد میں جب بلراج ساہنی کی شادی ہوگئی تو 1937 میں ایک دن انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی بھیشم ساہنی کو دفتر کا کام کاج سونپا، گھر والوں سے وداع لی اور اپنی بیوی کے ساتھ شانتی نکیتن چلے گئے۔ کچھ دن بعد بھیشم ساہنی نے بھی اپنے والد کے کاروبار سے الگ ہوکر اپنی راہ خود الگ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ تبھی انھیں اپنے پرانے انٹرمیڈیٹ کالج کی یاد آئی جہاں وہ لاہور جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔ اب وہ ڈگری کالج بن چکا تھا اور اس کے پرنسپل اُن کے پرانے استاد جسونت رائے تھے جن کی چھوٹی بہن دمینتی کی شادی بلراج ساہنی کے ساتھ ہوئی تھی۔ انھوں نے بھیشم ساہنی کو کالج کے لڑکوں کو ساتھ لے کر کالج کے اسٹیج پر ڈرامہ پیش کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی کالج میں گیسٹ لیکچرار کے طور پر ایک دو گھنٹے پڑھانے کا کام بھی سونپ دیا۔

اس وقت بھیشم ساہنی کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اُن کی زندگی کا رُخ بدل رہا ہے۔ دو گھنٹہ روز گیسٹ لیکچرار کے طور پر پڑھانا آگے چل کر اُن کا پیشہ ہی بن جائے گا، یہ بات اُن کے ذہن میں نہیں تھی...... یا کالج میں اسٹیج کیا گیا پہلا ڈرامہ اس لمبی زنجیر کی ایک کڑی ثابت ہوگا، جو بھیشم ساہنی کو پورے ملک میں معاشرتی تبدیلی کی تحریک کی طرف لے جائے گا۔

اس ماحول میں بھیشم ساہنی کی توجہ ادب اور ڈرامے کی طرف زیادہ مرکوز انھوں نے ادب کا عمیق مطالعہ کرتے کے ساتھ ساتھ مضامین بھی لکھنے شروع کردیے۔ اُن کے مضامین 'سرسوتی' اور 'وشال بھارت' جیسے رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کے والد کو کاروباری سلسلے میں سال میں ایک یا دو بار بھیشم ساہنی کو کانپور بھیجنا پڑتا تھا، لہٰذا وہ درمیان میں دو چار دن دہلی میں بھی قیام کیا کرتے تھے۔

دہلی میں اُن کی پھوپی زاد بہن ستیہ وتی ملک رہتی تھیں جن کا گھر ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ وہیں پہلی بار وہ جینندر جی سے ملے تھے۔ جینندر، وشنو پربھاکر، بناری داس چترویدی، واتسیاین وغیرہ سے نئی نئی کتابوں پر بحث ومباحثہ ہوتا تھا جس کو بھیشم ساہنی بڑی دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔ اُن دنوں تک صرف ادب و تخلیق کرنا ہی اُن کا واحد مشغلہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک ساتھ کئی جہتوں میں سفر کر رہے تھے۔ کاروبار بھی کرتے تھے اور مطالعہ بھی، ڈرامہ کرنا، کانگریس میں شامل ہوکر خدمت خلق کرنا اور کبھی کبھار لکھنا بھی۔ اسی عرصے میں اُن کی کہانی 'نیلی آنکھیں' منشی پریم چند کے بیٹے امرت رائے کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ 'ہنس' میں شائع ہوئی تھی اور آٹھ روپے معاوضہ بھی بھیشم ساہنی کو ملا، لہٰذا وہ بے حد خوش تھے۔

بڑے بھائی بلراج ساہنی شانتی نکیتن چھوڑ کر مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کرنے کی غرض سے سیوا گرام چلے گئے جہاں وہ 'نئی تعلیم' نام کے رسالے کے معاون مدیر ہوگئے تھے۔ بھیشم ساہنی بھی کچھ وقت کے لیے اُن کے پاس چلے گئے۔ وہاں انھیں گاندھی جی کو قریب سے دیکھنے اور اُن سے بات چیت کرنے کے مواقع بھی ملے۔ کچھ وقت کے بعد بلراج ساہنی وہاں سے لندن چلے گئے جہاں وہ بی بی سی کے ہندوستانی شعبے میں چار سال تک کام کرتے رہے۔ بھیشم ساہنی راولپنڈی میں ہی رہ کر اپنی مختلف قسم کی مصروفیات میں وقت گزارتے رہے۔ بلراج ساہنی 1944 میں لندن سے واپس آئے اور ساتھ ہی سماج واد کی سوچ بھی اپنے ساتھ لائے۔ اِدھر بھیشم ساہنی بھی بائیں بازو کی تحریک سے متاثر ہوچکے تھے۔ دوسری عالم گیر جنگ کے دوران سوویت روس کی مقبولیت اور اس کے مختلف ملکوں میں بڑھتے اثرات سے دنیا واقف ہے۔

ممبئی میں بلراج ساہنی کے کالج کے دنوں کے دوست چیتن آنند اپنے فلمی ادارے سے میکسم گورکی کے ڈرامہ Lower Depth کی بنیاد پر فلم 'نیچا نگر' بنانے کی پلاننگ کررہے تھے۔ وہ بلراج ساہنی کو اس فلم میں شامل کرنا چاہتے تھے، لہٰذا بلراج ساہنی بنا کچھ سوچے سمجھے ممبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔

بھیشم ساہنی نے کبھی کوئی باقاعدہ عشق نہیں کیا، بلکہ اپنی ہونے والی بیوی سے شادی سے قبل وہ نہیں ملتے تھے۔ جبکہ ان کی بیوی عمر میں ان سے آٹھ نو برس چھوٹی تھیں اور کچھ وقت تک کالج میں اُن کی اسٹوڈنٹ بھی رہی تھیں۔ عالمی جنگ ابھی چل ہی رہی تھی کہ 1944 میں شیلا کے ساتھ اُن کی شادی ہوگئی۔ جب بلراج ساہنی ممبئی میں تھے تو اُن کے والد اُن کی طرف سے فکرمند رہا کرتے تھے، لہٰذا وہ بھیشم ساہنی کو ممبئی بھیجتے تھے کہ بلراج کو سمجھا بجھا کر واپس لے آئیں۔ بھیشم ساہنی خوش ہو کر ممبئی جاتے۔ انھوں نے دیکھا کہ بڑے بھائی گئے تو تھے فلموں میں کام کرنے، مگر وہاں وہ اپٹا کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اپٹا کے اداکاروں میں اتنا جوش دیکھ کر بھیشم ساہنی بھی اس سے وابستہ ہو گئے اور خواجہ احمد عباس کے ڈرامہ 'زبیدہ' سے بہت متاثر ہوئے اور پھر ممبئی سے واپسی پر 'زبیدہ' کی ایک کاپی اپنے ساتھ لے آئے اور کچھ عرصے بعد انھوں نے راولپنڈی میں 'زبیدہ' کو اسٹیج کیا۔

تحریکِ آزادی کا نتیجہ ایک طرح سے ملک کی آزادی کے ساتھ بٹوارے کا بھی زخم دے گیا۔ بھیشم ساہنی نے وہ خوفناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، حالانکہ اُن کا خاندان اس خونی ڈرامے سے محفوظ رہا اور ممبئی میں بلراج ساہنی کے گھر اکٹھا ہو گیا۔ اُس وقت تک بلراج ساہنی کی بیوی دمینتی کا انتقال ہو چکا تھا اور بھیشم ساہنی کی بیٹی کلپنا کی پیدائش ہو چکی تھی۔

بھیشم ساہنی چونکہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے، لہٰذا انھوں نے کانگریس پارٹی چھوڑ دی اور باقاعدہ اپٹا سے وابستہ ہو گئے۔ اب وہ ممبئی میں تھے مگر کوئی باقاعدہ کام اُن کے پاس نہیں تھا۔ پھر بھی اپٹا کے نکڑ ناٹکوں میں وہ دن رات لگے رہے۔ وہ اپٹا کے پروگراموں میں گاتے وغیرہ گاتے پھرتے تھے، جہاں جو کچھ ملا، کھا لیا، جہاں رات کو شو ختم ہوا وہیں سو رہے۔ بس ایک جنون سا تھا۔ اُن دنوں اردو کے کئی بڑے ادیب اور شاعر فلموں سے وابستہ ہو چکے تھے اور ان لوگوں سے بھیشم ساہنی کی اچھی واقفیت بھی تھی، لیکن ادیب بننے یا فلموں میں کام کرنے سے زیادہ اپٹا میں کام کرنا اُن کو ضروری لگتا تھا۔ علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی جیسے ادیب اُن دنوں خوب لکھ رہے تھے، مگر بھیشم ساہنی اپٹا میں زیادہ حصہ لے رہے تھے۔ اُن کو اپٹا کے ڈراموں میں کام کرتے ہوئے زیادہ اچھا محسوس ہوتا تھا۔

کچھ عرصے بعد ہی بھیشم ساہنی ممبئی سے انبالہ چلے گئے جہاں اُن کے راولپنڈی والے کالج کے پرنسپل اور ماضی میں اُن کے استاد رہے جسونت جی نے ایک نیا کالج شروع کر لیا تھا۔ جسونت جی بلراج ساہنی کی بیوی دمینتی کے بڑے بھائی بھی تھے۔ انھوں نے بھیشم ساہنی کو تار دے کر اس لیے انبالہ بلایا تھا کہ وہ اُن کے کالج میں انگریزی پڑھا سکیں۔ جب بھیشم ساہنی انبالہ گئے تو اُن کی شریکِ حیات شیلا جی اپنی بیٹی کلپنا کو لے کر دھرم شالہ (ہماچل پردیش) چلی گئیں، جہاں اُن کے والد پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ دونوں میں یہ بات طے پائی تھی کہ جب تک انبالہ میں رہائش کا ٹھیک سے بندوبست نہیں ہوتا ہے، شیلا جی وہیں رہیں گی۔ انبالہ میں کالج کی ملازمت کے ساتھ ساتھ بھیشم ساہنی نے اپٹا کا گروپ بنا کر عوام کے سامنے ناٹک اور گیت پیش کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ وہیں انھوں نے کالج کے لیکچرس کی ایک یونین بھی قائم کی اور دوسرے کالجوں میں بھی اسی طرح کی یونینیں بنوائیں اور یہ سلسلہ پورے پنجاب میں پھیلنے لگا اور بھیشم ساہنی پوری طرح اس میں مصروف ہو گئے۔ اسی سلسلے میں اُن کو ملازمت سے نکال دیا گیا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اُن دنوں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ لوگوں کے پیچھے پولیس بھی لگی ہوئی تھی اور بہت سی جگہ گرفتاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ کافی عرصہ بے روزگار رہنے کے بعد امرتسر کے خالصہ کالج میں اُن کو ملازمت مل گئی، مگر رہائش کے لیے مکان ملنا اُن کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک مکان کرائے پر ملا اور شیلا جی اپنی بیٹی کلپنا کے ساتھ آ کر اُس میں رہنے لگیں۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یونین کے چکر میں بھیشم جی کو خالصہ کالج کی ملازمت بھی چھوڑنی پڑی اور وہ جالندھر جا کر وہاں کی یونین کے لیے کام کرنے لگے۔

اچانک ایک دن شیلا جی بھی وہاں پہنچ گئیں اور اپنے بل بوتے پر انھوں نے جالندھر ریڈیو اسٹیشن پر اناؤنسر کی ملازمت حاصل کر لی۔ اس طرح ان لوگوں کی زندگی میں تھوڑی بہت خوشحالی آ گئی۔ بھیشم ساہنی نے جالندھر کے ماڈل ٹاؤن میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور اُس میں رہنے لگے۔ اس درمیان دہلی سے بھیشم ساہنی کے والد نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ انھوں نے مہاجرین کے لیے حکومتِ ہند کی طرف سے بنائے گئے گھروں میں سے مشرقی پٹیل نگر میں ایک گھر خرید لیا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ وہاں رہنے آ جائیں۔ شیلا جی کلپنا کو لے کر دہلی چلی گئیں، لیکن بھیشم ساہنی پنجاب میں ہی ملازمت تلاش کرتے ہوئے یونین کے کاموں میں لگے رہے۔ شیلا جی نے اپنی جدوجہد سے دہلی کے آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر کی ملازمت حاصل کر لی، تب بھیشم جی نے بھی پنجاب اور یونین کے کام کو الوداع کہا اور دہلی آ گئے۔

دہلی آنے کے کچھ ہی دن بعد اُن کی ملاقات آرٹسٹ اور کہانی کار رام کمار سے ہوئی، جو پٹیل نگر کے قریب ہی قرول باغ میں رہتے تھے۔ انھوں نے بھیشم ساہنی کو بتایا کہ وہاں ایک پرائیویٹ کالج میں ہر اتوار کو کلچرل فورم کی 'اتواری بیٹھک' ہوتی ہے، جس میں حصہ لینے والے ہندی، اُردو اور پنجابی، تینوں زبانوں کے ادیب اپنی اپنی تخلیقات سناتے ہیں۔ رام کمار نے بھیشم ساہنی کو بھی اُس میں شرکت کی دعوت دی، تب وہ اگلے ہی اتوار کو وہاں پہنچ گئے اور آئندہ چار برس تک ہر اتوار کو وہاں جاتے رہے۔ وہاں اُن کی ملاقاتیں ہنس راج رہبر، رام کمار، نرمل ورما، وشنو پربھاکر، کرشن بلدیو وید، منوہر شیام جوشی، یوگیش کمار، مہندر بھلا، نریش کمار شاد اور دیویندر اسر وغیرہ کئی ادیبوں سے لگاتار ہوتی رہیں۔

کچھ عرصے بعد بھیشم ساہنی کو دہلی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور شروعات میں عارضی ملازمت کے طور پر شری رام کالج آف کامرس میں، اس کے بعد ہندو کالج میں، اور پھر تیسری بار پکی ملازمت مرزا محمود بیگ کے دہلی کالج میں حاصل ہوئی۔ دہلی کالج کا نام اب ذاکر حسین کالج ہو گیا ہے۔ دہلی آنے کے بعد بھیشم ساہنی پوری طرح ادبی ماحول میں رچ بس گئے۔ اُن کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'بھاگیہ ریکھا' 1953 میں اور دوسرا مجموعہ 'پہلا پاٹھ' 1956 میں شائع ہوئے۔ اُن ہی دنوں دوستوں کے ساتھ "ساہتیہ کار" عنوان کا ایک ماہانہ رسالہ بھی انھوں نے نکالا، جس کی مجلسِ ادارت میں اُن کے علاوہ رام کمار، منوہر شیام جوشی اور کرشن بلدیو وید شامل تھے۔ بعد میں نریش مہتہ بھی اُس رسالے سے وابستہ ہو گئے۔

اُن ہی دنوں دہلی میں ساہتیہ اکادمی قائم ہوئی اور مختلف ادیب اور شاعر اُس سے وابستہ ہونے لگے۔ ساہتیہ اکادمی کا پہلا دفتر کناٹ پلیس میں ریگل سینما والی بلڈنگ کی پہلی منزل پر تھا۔ پربھاکر ماچوے، نیمی چند جین اور بھارت بھوشن اگروال سے پہلی پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ دہلی میں رچ بس کر باقی زندگی یہیں کے ادبی ماحول میں بہتر طور پر گزار سکنے کی تمام اُمیدوں کے ہوتے ہوئے بھی جب بھیشم ساہنی کو رُوس کے ایک اشاعتی ادارے نے ترجمہ نگاری کا کام دیا تو وہ ماسکو جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ اُس وقت ترقی پسند ادیبوں کے لیے رُوس ایک رومانی اور آئیڈیل ملک نظر آتا تھا، اور اس کے بارے میں جو کچھ سنا یا پڑھا تھا، اس سے بھیشم ساہنی بھی کافی متاثر تھے۔ بلراج ساہنی دو برس پہلے ہی کسی فلمی وفد کے ساتھ رُوس کا سفر کر چکے تھے اور واپسی پر کافی دنوں تک وہاں کے تذکرے کرتے رہے تھے۔ بھیشم ساہنی پہلی بار ملک سے باہر سفر پر جا رہے تھے، اس کا بھی ایک تجسس اُن کے دل میں تھا، اور ایک سوشلسٹ ملک کو دیکھ

صد سالہ یومِ پیدائش

پانے کی آرزو بھی تھی۔ جہاں مساوات کی بنیاد پر ایک نیا نظام حکومت قائم تھا، اور جس کی جاں باز افواج اور عوام نے ہٹلر کی فوجوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ اس طرح کے خیالات نے بھی بھیشم ساہنی وہاں جانے کے لیے کافی اُکسا دیے تھے۔

جس زمانے میں بھیشم ساہنی سوویت روس میں رہے، وہاں کا نظام حکومت بدل رہا تھا۔ حالانکہ ہندوستان کے ساتھ سوویت روس کے بڑے نزدیکی تعلق پنپ رہے تھے اور بھیشم ساہنی کو لگتا تھا جیسے وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ 1957 کی بات ہے۔ انقلاب کے بعد ثقافتی میدان میں سوویت روس نے جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا، اس کے مطابق وہاں بڑے پیمانے پر ترجمہ نگاری کا کام کیا جا رہا تھا۔ جہاں روسی اور دیگر سوویت زبانوں سے ترجمے کیے جا رہے تھے، وہیں دوسرے ممالک کے ادب کے بھی روسی زبان میں ترجمے ہو رہے تھے۔ تقریباً پورے سوویت روس کے دورِ حکومت میں لگ بھگ ایک ہزار کتابوں کے ہندوستانی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہوں گے، جن میں ادب، فلسفہ اور معاشرتی مضامین کی کتابیں شامل تھیں۔ بھیشم ساہنی ماسکو میں مع اہل وعیال سات برس تک رہے اور 1963 میں واپس ہندوستان آ گئے۔ یہاں آنے پر ان کو ایک بار پھر دہلی کالج میں ملازمت پر بحال کر دیا گیا مگر شیلا جی کو دوبارہ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت حاصل کرنے کے لیے کافی بھاگ دوڑ اور جد و جہد کرنی پڑی۔ اس درمیان دہلی کا ادبی ماحول کافی کچھ بدل چکا تھا۔ کلچرل فورم کی نشستیں ختم ہو چکی تھیں، اور بھیشم ساہنی کو کافی اجنبیت محسوس ہو رہی تھی۔

بھیشم ساہنی بنیادی طور پر کہانی کار تھے، اسی لیے ہندی کہانی کے میدان میں ان دنوں کیا ہو رہا تھا اس پر ان کی کافی گہری نظر تھی۔ کہانی کاروں کے نئے نئے گروپ بن رہے تھے اور نئی نئی بحثیں سامنے آ رہی تھیں، لیکن بھیشم ساہنی ان بحثوں میں شامل نہ ہو کر اپنے طور پر ہی کہانی لکھتے رہے۔ اسی دوران ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'پہلا پاٹھ' اور دو ناول 'جھروکے' اور 'کڑیاں' شائع ہوئے۔ ان کے تمام تخلیقی ادب پر منشی پریم چند اور یشپال جی کا گہرا اثر ہے۔

اسی زمانے میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ بھیشم ساہنی کو 'نئی کہانیاں' نام کے رسالے میں مدیر بنا دیا گیا۔ یہ رسالہ دہلی کے راج کمل پرکاشن سے شائع ہوتا تھا اور اس زمانے میں اس ادارے کا کچھ تعلق ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھا، جس کے نمائندے پی۔ سی۔ جوشی ادب اور ثقافت کے معاملوں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ نئی کہانیاں کے مدیر پہلے بھیرو پرساد گپت تھے جو بہت سلجھے ہوئے اور ادب کے نباض تھے۔ بعد میں اس کے مدیر موہن راکیش، اور پھر کملیشور بنا دیے گئے۔ بھیشم ساہنی نے ادارتی کام سنبھال لینے کے بعد یہ طے کیا کہ وہ کسی خاص گروپ کے ساتھ اپنی وابستگی نہیں رکھیں گے اور صرف کہانی کو ہی کہانی کا درجہ دیں گے۔

بھیشم ساہنی نے لگ بھگ ڈھائی برس تک 'نئی کہانیاں' کی ادارت کی۔ ان کے زمانے میں کرشنا سوبتی کی کہانی 'یاروں کے یار' اور یشپال کی کہانی 'پیشاب' شائع ہوئی تو ان کہانیوں پر فحاشی کے الزامات لگے اور مقدمے بھی قائم ہوئے۔ لیکن بھیشم ساہنی اپنے موقف پر اڑے رہے جس کی وجہ سے بعد میں مقدمے بھی واپس لے لیے گئے۔ بھیشم جی کٹر کمیونسٹ بھی نہیں رہے، لیکن ان کا تعلق بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی سے ہمیشہ بنا رہا۔ ملکی سطح پر ترقی پسند مصنفین میں عملی طور پر حصہ لینے کے

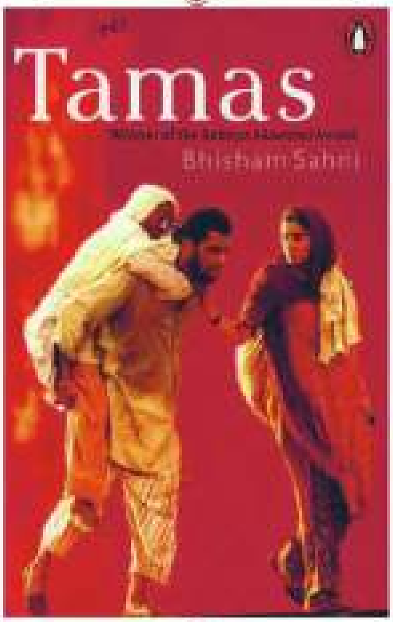

ساتھ ساتھ بھیشم ساہنی عالمی سطح پر بھی ایفرو ایشیائی رائٹرس ایسوسی ایشن میں کام کرتے رہے اور 1970 کے آس پاس ایفرو ایشیائی رائٹرس ایسوسی ایشن کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے۔ جس کی چوتھی کانفرنس ہندوستان میں ہونے جا رہی تھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سجاد ظہیر کی خواہش تھی کہ بھیشم ساہنی اس کانفرنس کی تیاری میں قدم بہ قدم ان کے ساتھ رہیں۔ ہری ونش رائے بچن استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے اور ملک راج آنند جنرل سکریٹری کی حیثیت سے سارا بندوبست سنبھالے ہوئے تھے۔ بھیشم ساہنی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کانفرنس کے انتظامات میں لگے رہے۔

بھیشم ساہنی کی ہمہ جہت شخصیت کا سب سے بڑا پہلو ان کا سو دو بانہ رویہ تھا۔ وہ انگریزی ادب کے ایک اچھے قاری اور استاد بھی تھے۔ ہندی کے ادیب اور ادبی کتابوں اور رسالوں کے مدیر بھی تھے، وہ خود اچھے ترجمہ نگار تھے اور کئی ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ان کی اپنی تخلیقات کے ترجمے بھی ہو چکے تھے۔ وہ خود ڈرامہ نگار تھے اور اپٹا کی تحریک سے بھی جڑے رہے تھے۔ ان کے ناول 'تمس' پر جنوری 1988 میں ایک ٹیلی ویژن سیریل بن کر مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ ناول 'تمس' میں انھوں نے ان تمام مناظر کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے جو انھوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے تھے اور جو بعد میں بند آنکھوں کے خوابیدہ جھروکوں سے ان کو زندگی بھر ہراساں کرتے رہے۔ انھوں نے 'تمس' کے علاوہ کئی فیچر فلموں میں اداکاری بھی کی تھی۔ 1984 میں سعید مرزا کی فلم 'موہن جوشی حاضر ہو'، 1993 میں برنارڈو برٹولوچی کی فلم 'لٹل بدھا' اور 2002 میں اپرنا سین کی فلم 'مسٹر اینڈ مسز ایّر' میں انھوں نے اداکاری کی تھی۔ 1998 میں بھیشم ساہنی کو حکومت ہند کی طرف سے پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی اعزازات اور انعامات حاصل کیے پھر بھی غرور ان کے قریب سے نہیں گزرا۔

بھیشم ساہنی کی زندگی کا بیشتر حصہ گھر کے باہر کی مصروفیات میں گزرا تھا مگر وہ اپنے اہل خانہ کے لیے ایک نہایت ذمے دار شخص تھے۔ بے حد دوستانہ مزاج رکھنے والے بھیشم ساہنی کو دوستوں سے بھی بہت محبت ملتی تھی۔ اپنے والدین کا بے حد احترام کرتے تھے اور اپنے بچوں سے بہت محبت کرنے والے بھیشم ساہنی اپنے رشتے داروں اور دوستوں میں بھی ایک پسندیدہ شخصیت کے حامل، انسان دوست انسان تھے۔ ادب کی دنیا بھی ان کے لیے ایک خاندان کی حیثیت رکھتی تھی اور اس میں نرم گفتار بھیشم جی کو سب کا پیار ملتا تھا۔

بھیشم ساہنی کے سب سے مقبول ناول 'تمس' پر ان کو 1975 میں ساہتیہ اکادمی اعزاز سے نوازا گیا اور بعد میں وہ ساہتیہ اکادمی کے ممبر بھی رہے۔ بنیادی طور پر سادہ لوح بھیشم ساہنی کبھی بھی آگے بڑھ کر زبردستی قیادت کرنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے آپ کو ایک عام آدمی کی طرح محسوس کرتے تھے۔ دوسروں کا احترام کرنا یا ان کے احساسات کا خیال رکھنا ان کو بے حد عزیز تھا۔ 11 جولائی 2003 کو دہلی میں بھیشم ساہنی جی کی آتما نے جسم خاکی سے نجات حاصل کی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ اب صرف ان کی خوشگوار یادیں ہی باقی ہیں۔

■

Anees Amrohvi, 54-C, 1st Floor, Gali No.-5, J - Extension, Laxmi Nagar Delhi-92
Mob.: 9811612373

تبصرہ وتعارف

تحقیق و تعارف

مصنف: حنیف نقوی

صفحات: 288، قیمت: 99، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تحقیق نہایت ہی صبر وضبط اور پتہ ماری کا کام ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، گیان چند جین، رشید حسن خاں، ابومحمد سحر اور حنیف نقوی صاحب کے نام اس حوالے سے بہت اہم ہیں۔ یہاں ان کے دوسرے موقر کاموں کے ذکر کا موقع نہیں کیونکہ زیر تبصرہ کتاب 'تحقیق وتعارف' پر ایک تعارفی تبصرہ پیش کرتا ہے۔

اس کتاب میں شامل بیس (20) مضامین سے عام قاری کا تعلق کم ہی ہو سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت اس لیے باقی رہتی ہے کہ ان میں جو گوشے اور نکات ملتے ہیں، ان سے بہت سے جالے صاف اور الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں۔ محققوں نے ہمارے ادب کے ایسے ہی تاریک گوشوں کو روشن کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا پہلا مضمون بیاض آبرو پر ہے لیکن قدیم ترین مضمون 'منظومات باقر آگاہ کے نثری دیباچے' ہے جو 1968 میں لکھا گیا، لیکن جنوری 1979 کے ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'بیاض آبرو' میں مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب اور مختصر تعارف ہے اس بیاض کے ناقل کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''بعض تحریروں کی روشنی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناقل واضح اور صاف لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی عجلت پسندی اسے اس کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ کم سواد اور موزونی طبع سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی غیر محتاط اور حد درجہ غلط نویس بھی ہے۔'' (ص 12)

چند غلطیوں کا حوالہ یہاں بھی ضروری ہے۔ میں بغیر کسی وضاحت کے، صرف غلط طور پر لکھے گئے الفاظ اور پھر قوسین میں صحیح املا اور تلفظ درج کرتا ہوں:

ہسار (حصار)، سباحت (صباحت)، سفائی (صفائی)، عسا (عصا)، صالم (سالم)، دیکہ تا (دیکھتا)، برداس تی (برداشت ہے)، سیاہی (سیاہ ہے)، پردیس نکل کر (پردے سے نکل کر)، رنجپڑی (رخ پہ ترے) وغیرہ۔

حنیف نقوی صاحب نے کس جبر کے ساتھ اس بیاض کا مطالعہ ومحاکمہ کیا ہوگا، اندازہ کیجیے، اس لیے کہ املا جس قدر غلط اور پھر لفظوں کو توڑ پھوڑ کے جس طرح لکھا گیا ہے، اس کا پڑھا جانا یا پڑھنا کیسا دشوار مرحلہ ہوگا، اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ لیکن حنیف نقوی صاحب نے اس مضمون کے آخر میں بیشتر شعرا کے کلام کا منتخب نمونہ بھی پیش کیا ہے جس میں انھوں نے غلطیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔

حنیف نقوی صاحب نے میر کے دیوان چہارم کے حوالے سے بھی دوسرے محققوں کے تسامحات کا ذکر کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون 'مثنوی ہدایت در تعریف بنارس' میں میر تقی میر اور مرزا (رفیع سودا) کے عہد کے ایک شاعر ہدایت اللہ خاں ہدایت شاگرد خواجہ میر درد کی ایک مثنوی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ایک مضمون 'شبستان سرور کا ماخذ' ہے۔ یہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ جو کہ 1886 میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ سرور نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ براہ راست عربی سے کیا ہے۔ حنیف نقوی صاحب نے الف لیلہ از عبدالکریم کو سامنے رکھ کر یہ واضح اور ثابت کیا ہے کہ سرور نے اسی کا چربہ پیش کیا ہے۔ عبدالکریم نے یہ ترجمہ 1842 میں مکمل کیا تھا جو کہ 1847 میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ یہ بھی چار حصوں پر مشتمل ہے۔ عبدالکریم نے اسے Edward Forstey کے انگریزی نسخے سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ حنیف نقوی لکھتے ہیں:

''مجملاً واقعہ یہ ہے کہ 'شبستان سرور' مولوی عبدالکریم کے ترجمہ 'الف لیلہ' سے ماخوذ ہے اور سرور نے اس کے متعلق یہ دعویٰ کر کے کہ انھوں نے براہ راست عربی سے ترجمہ کیا ہے، صریحاً سخن سازی بلکہ دروغ گوئی یا غلط بیانی سے کام لیا ہے۔'' (ص 113)

حنیف نقوی صاحب کا ایک مضمون 'غالب اور عیوب قوافی' (ص 115) عنوان سے ہے ڈاکٹر منصور عمر مرحوم، استاد شعبۂ اردو، سی ایم کالج دربھنگہ کا مضمون ہفت روزہ ہماری زبان کے شمارہ بابت 15 نومبر 1988 شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون منصور عمر کے مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ غالب کی مشہور غزل ہے: دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا۔ اس میں قوافی کے طور پر غالب نے تقویٰ، عیسیٰ بھی باندھا ہے۔ حنیف نقوی صاحب نے صاحب غیاث اللغات کا یہ جملہ نقل کیا ہے: بہ فتح اول و فتح واؤ۔ در استعمال فارسیاں۔ گاہے بہ کسر واؤ نیز مستعمل'' اسے فارسی والوں کے حوالے سے نقوی صاحب نے بتایا ہے الف کی یہ بائیسویں قسم ہے جس کا ذکر صاحب غیاث اللغات نے کیا ہے۔ فارسی والے اسے کتابت کی رو سے پڑھتے بھی ہیں یعنی 'ی' کے طور پر موسی اور عیسی بھی پڑھتے ہیں۔ حنیف نقوی صاحب نے بہت سے فارسی کے اشعار بھی بطور سند پیش کیے ہیں۔

کلیم کاشانی، مرزا صائب اصفہانی، شوکت بخاری، فیضی کے فارسی اشعار اور مصحفی، یقین، انشا وغیرہ کے اردو اشعار پیش کیے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ یہ قوافی بہت زیادہ رائج رہے ہیں۔ سند کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ اردو کے عام قارئین کے لیے ان قوافی کی قرأت بہر حال وقت طلب ہوگی۔ اساتذہ کی بات الگ ہے۔ لیکن آپ غور کیجیے کہ حنیف نقوی صاحب نے ایک موضوع کے لیے کتنے اشعار فارسی اور اردو کے بطور مثال کے پیش کر دیے ہیں۔

یہ کتاب 'تحقیق وتعارف' اہم اس لیے بھی ہے کہ اس میں حالی کے مکاتیب، اودھ اخبار کی قدر و قیمت اور اقبال سے منسوب ایک غزل جیسے اہم مضامین ہیں اور حنیف نقوی نے تحقیقی نقطۂ نظر سے کئی گوشوں کو روشن کیا ہے۔ اس میں کئی پرانے مضامین ہیں جو 70 کی دہائی میں لکھے گئے ہیں۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے اور قیمت 99 روپے جو کہ مناسب ہے۔

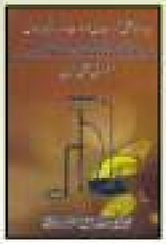

پود حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال آموزشی اور عملی کتابچہ

مترجم: سید ظفر الاسلام

صفحات: 77، قیمت: 64 روپے، اشاعت ثانی: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'پود حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال آموزشی اور عملی کتابچہ' کے عنوان سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی فکر و فلسفہ یا ادب کی کتاب نہیں ہے۔ یہ دراصل ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر طلبہ کو ان کی مادری زبان میں تعلیم کی فراہمی کے منصوبے کے تحت حکومت ہند کی وزارت ترقی انسانی وسائل، ہندوستانی زبانوں میں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمے و اشاعت کی اسکیم چلاتی ہے یہ کتاب اسی اسکیم کے تحت طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اردو کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے قومی کونسل ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات کے لیے پیشہ ورانہ، آئی ٹی آئی اور ڈپلوما انجینئرنگ سے متعلق کتابوں کے تراجم کرا کے اردو تعلیم کو روزگار اور معاشی ترقی سے منسلک کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ یہ کتاب بھی اسی کوشش کا نتیجہ ہے اور کونسل کا یہ ایک مستحسن اور لائق ستائش قدم ہے امید ہے کہ آئندہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی دونوں سطح پر اچھی اور کارآمد کتابوں کے تراجم کا یہ سلسلہ دیگر موضوعات پر بھی جاری رہے گا۔

یہ کتابچہ ایسا ہے جس میں پودوں کی حفاظت، ان کی مرمت اور دیکھ ریکھ سے متعلق معلومات کو مختلف اکائیوں میں تقسیم کر کے آسان سے آسان لب ولہجہ اور اسلوب میں پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبہ با آسانی اسے ذہن نشین کر سکیں۔ اس کتابچہ میں کل اُنیس عملی اکائیاں شامل ہیں جو طلبہ کو تجرباتی کام اور تجربات بہم پہنچائیں گے تاکہ طلبہ اپنے اندر حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ ریکھ میں ماہرانہ صلاحیت پیدا کر سکیں۔ اس کتابچے میں شامل پہلی عملی اکائی 'پود حفاظتی طریقے' پر مبنی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ پودوں کے تحفظ کی اہمیت، پودوں کے حفاظتی طریقۂ کار اور فصلوں کی حفاظت میں ان کے طریقوں کے انتخاب اور نفاذ سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔ دوسری عملی اکائی 'پود حفاظتی ساز و سامان کی درجہ بندی اور عملی اصول' پر مبنی ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ میں مختلف طرح کے پود حفاظتی آلات کی شناخت کا مادہ پیدا ہوگا۔ وہ پود حفاظتی ساز و سامان کی درجہ بندی کر سکیں گے اور مختلف پود حفاظتی آلات کے کام کرنے کے اصولوں کے بارے میں مزید مطالعہ کر سکیں گے۔ تیسری عملی اکائی 'پود حفاظتی کیمیکل کو برتنے میں احتیاط اور ذخیرہ اندوزی' ہے اس سبق سے طلبہ کیمیکل کے ذخیرہ کرنے اور ان کو برتنے میں جو احتیاطی تدابیر اپنائی جاتی ہیں ان کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔ چوتھی عملی اکائی 'پود حفاظتی کیمیکل اور تشکیل سے واقفیت حاصل کرنا' ہے اس میں پودوں کی حفاظت کے سلسلے میں جو کیمیکل استعمال کیے جاتے ہیں جیسے کرم کش، پھپھوند کش، جراثیم کش، گھر چوہا مار، خیطیہ کش (Nematocide) وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے Formulation اور اس کے اقسام کے بارے میں اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ طلبہ آسانی سے پود حفاظتی کیمیکلس اور اس کی مختلف قسم کی تشکیل اور تشکیلی عوامل کو سمجھ سکیں۔ پانچویں عملی اکائی 'پود حفاظتی آلات کے لیے ابتدائی طبی امداد، علاج اور حفاظتی ساز و سامان' ہے جب کہ چھٹی اکائی 'عام پود حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے عام دستی اوزاروں سے واقفیت حاصل کرنا' ہے۔ اس کے علاوہ ساتویں اکائی 'پاش کار (Sprayer) کے بنیادی اجزا کی واقفیت حاصل کرنا' آٹھویں اکائی 'ڈسٹر کے بنیادی اجزا کی واقفیت حاصل کرنا' نویں اکائی 'نوزل قسم کے پرزوں اور ان کے تطابق کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا' دسویں اکائی 'ہائیڈرولک دستی داب چھڑکاؤ کا عمل اور ان کی دیکھ بھال' وغیرہ یہ ایسی اکائیاں ہیں جو زراعتی پیداوار اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں بہت اہم ہیں ان سب کے مطالعے سے طلبہ کے اندر زراعتی پیداوار، ان کی حفاظت اور مرمت کے سلسلے میں دلچسپی پیدا ہوگی اور مزید معلومات میں اضافہ ہوگا اور زراعتی پیداوار مزید بڑھا دے سکیں گے۔ مذکورہ بالا عملی اکائیوں کے علاوہ اور بھی بہت ساری اکائیاں اس کتابچے میں شامل ہیں جو زراعت، پودوں کی حفاظت، اس کی مرمت اور دیکھ ریکھ سے متعلق ہیں۔ بقیہ اکائیاں بھی بہت معلوماتی اور دلچسپ ہیں ان کے مطالعے سے مختلف طرح کی جدید زراعتی ٹکنالوجی، پود حفاظتی آلات اور جدید طریقۂ کار سے واقفیت حاصل ہوگی۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی طلبہ کے لیے بالخصوص ان طلبہ کے لیے جو زراعت میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے انتہائی مفید، کارآمد اور معلوماتی کتابچہ ہے۔ اسے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر اسکولوں کے نصاب کا حصہ بنانا چاہیے تاکہ طلبہ کے اندر بیداری آئے۔ اردو میڈیم اسکولوں کے لیے یہ ایک بہترین تحفہ ہے امید ہے کہ اس تحفے کی پذیرائی ہوگی۔

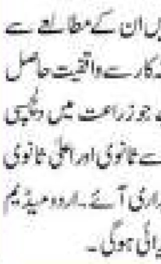

اردو خوش نویسی (برائے سال دوم)

مصنف: خورشید عالم

صفحات: 160، قیمت: 114 روپے، اشاعت ثانی: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: مناظر ارشد، پی 112، مطلع ہاؤس، نئی دہلی

کسی سنگ تراش نے کہا تھا کہ صنم تو ہر پتھر میں ہوتا ہے میرا کام تو بس اسے تراش کر فضولیات کو باہر نکالنا ہوتا ہے اس جذبۂ حسن کی ترجمانی اس شعر سے ہو سکتی ہے:

نگاہِ سنگ تراشاں نکھار دے جس کو
وگرنہ حسن کی دیوی تو ہر چٹان میں ہے

کچھ ایسے ہی تراشنے کا کام خورشید عالم صاحب نے کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'اردو خوش نویسی' موصوف کی کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن سے بھرپور دو سالہ ڈپلوما کورس کے لیے ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کو کل چھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے:

پہلے باب میں خوش نویسی کے فن، اساتذۂ فن اور اس کے عروج و ارتقا پر معروضی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ دوسرا اور تیسرا باب قدرے مشترک ہے اس میں فن خوش نویسی کے متعدد اقسام مثلاً خط رقعہ، خط ثلث اور خط دیوانی وغیرہ کو بتاتے ہوئے اس کی تعریف مع امثلہ پیش کی گئی ہے۔ مذکورہ خطوط میں خط ثلث ایک مشکل ترین خط مانا گیا ہے اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جو اس خط پر عبور حاصل کر لے وہ کسی بھی خط کو آسانی سے لکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ باب چہارم میں خط شکست، خط طغریٰ کے ساتھ مختلف اور متنوع خطوط کے نمونہ جات درج کیے گئے ہیں۔ باب پنجم میں رقعہ جات یعنی مختلف تقریبات کے دعوت نامے جیسے شادی بیاہ، افتتاحی تقریبات، رسم اجرا، عیدین کی مبارک باد، سہرا اور سپاس نامہ وغیرہ میں جس خط کا استعمال ہوتا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب ششم جو کہ آخری باب ہے اس میں موجودہ دور کے وہ خطوط جسے ہم رابطے کے لیے استعمال کرتے ہیں جیسے اخبارات، اشتہارات، رسالہ، پوسٹر، میل وغیرہ پر بہت ہی معلوماتی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ یوں تو فن خوش نویسی نہایت قدیم فن ہے اور یہ اسلام جیسے عظیم ترین مذہب سے زیادہ قریب رہا ہے۔ کیلی گرافی کا جوہر ہر کسی کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے صرف اسے نکھارنے اور صیقل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

خورشید صاحب نے ایک ایسے وقت میں اس کتاب کو لکھا ہے جب کہ یہ فن معدوم

ساہوتا جارہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے نگاہوں کو خیرہ کررکھا ہے قلم اور روشنائی کی جگہ Key Board نے لے لی ہے ایسے میں اس کے وجود پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں ایسے پرفتن دور میں خورشید صاحب نے اس کتاب کے ذریعے خوش نویسی کی بازیافت کی کوشش کی ہے ان کی یہ کوشش نہایت ہی مستحسن ہے۔ کونسل مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ایسے معدوم ہوتے فن کی بازیافت کے لیے مسلسل کوشاں ہے، امید ہے کہ یہ کتاب خوش نویسوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

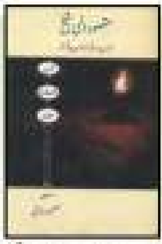

مقصود الٰہی شیخ: ادب ساز و ادب نواز

مصنف: میمونہ روحی (پاکستان)

صفحات: 244، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ

مبصر: اسرائیل رضا، سابق صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

زیر تبصرہ کتاب میمونہ روحی کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے جسے انھوں نے مقصود الٰہی شیخ کی ادبی و صحافتی خدمات کے موضوع پر پروفیسر طاہرہ تسوی کی نگرانی میں قلمبند کیا تھا۔

موصوفہ کو تحقیق و تنقید سے دلچسپی ہے۔ پیش نظر کتاب سے قبل ان کی ایک اور تحقیقی و تنقیدی تصنیف 'پروفیسر حمید احمد خاں- احوال و آثار' کے عنوان سے منظر عام پر آچکی ہے۔

برصغیر ہند و پاک کی سرحدوں سے باہر دیار غیر میں اردو کی نئی بستیاں آباد کرنے میں جن عاشقان اردو نے جنون کی حد تک نمایاں خدمت انجام دی ہیں ان میں ایک اہم نام مقصود الٰہی شیخ کا ہے۔

میمونہ روحی صاحبہ نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے مقصود الٰہی شیخ کی ادبی و صحافتی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب مقصود الٰہی شیخ کی سوانح حیات پر محیط ہے جس میں موصوفہ نے شیخ صاحب کی حیات کے اوراق پریشاں کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ مقصود الٰہی شیخ برطانیہ میں سکونت پذیر ہیں ایسی صورت میں ان کی سوانح حیات کو مرتب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا لیکن میمونہ روحی صاحبہ نے فیصل آباد (پاکستان) میں رہ کر ہی اس مشکل کام کو بھی مختلف کتابوں اور مطبوعہ انٹرویو کے حوالے سے ممکن کر دکھایا ہے اور اس طرح موصوف کی پیدائش، خاندان، تعلیم، ادبی زندگی کا آغاز، افسانوی زندگی کا باقاعدہ آغاز، افسانوی مجموعے، ناولٹ، تصنیفات کا مختصر جائزہ، سیرت و شخصیت، قومی و بین الاقوامی ایوارڈز و اعزازات، ان کی پسند وغیرہ کے ضمنی عنوانات کے تحت ان کی سوانح حیات میں رنگ بھرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے مطالعے سے مقصود الٰہی شیخ کی سیرت و شخصیت کے متعلق واضح تصویر ابھر کر منظر عام پر آجاتی ہے۔ افسانوی مجموعوں پتھر کا جگر، برف کے آنسو، جھوٹ بولتی آنکھیں، من درپن، پلوں کے نیچے بہتا پانی، چاند چہرے سمندر آنکھیں میں شامل 94 افسانوں کا فرداً فرداً جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ یقیناً بڑی جگرکاوی کی بات ہے۔ علاوہ ازیں مقصود الٰہی شیخ کی ایک نئی ایجاد 'پوپ کہانی' پر بھی کتاب میں بھرپور بحث کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو افسانے میں ایک وہ بھی دور آیا جبکہ بغیر پلاٹ کے افسانے لکھے جاتے تھے، پھر جدیدیت میں تمثیلیت اور تجریدیت نے جگہ بنائی۔ مظہر امام نے آزاد غزل کی بنیاد ڈالی، حفیظ جالندھری نے 'نثرانے' اور محسن بھوپالی نے 'نظمانے' لکھ کر ایک نیا تجربہ کیا۔ اسی طرح مقصود الٰہی شیخ نے بھی اردو افسانے میں 'پوپ کہانی' کے نام سے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ چنانچہ 2011 میں ان کی 21 پوپ کہانیوں پر مشتمل ایک مجموعہ بھی شائع ہوا۔ میمونہ روحی نے ان 21 پوپ کہانیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی نئی ایجاد کو مین اسٹریم میں آنے کے لیے وقت لگتا ہے۔ پوپ کہانی کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی بات ہے۔

تیسرے باب میں مقصود الٰہی شیخ کے دو ناولٹ 'دل اک بند کلی' اور 'شیشہ ٹوٹ جائے گا' کا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں ابواب کے مطالعے سے مقصود الٰہی شیخ کے فن اور ان کے مطمح نظر کے متعلق مکمل طور پر شناسائی ہوجاتی ہے۔ کتاب کا چوتھا باب مقصود الٰہی شیخ کی ادبی صحافت کے جائزے پر مشتمل ہے جس میں 'صحافت کے معنی' تحریک پاکستان کے بعد ادب و صحافت کا مقام' جنگ آزادی سے قبل مسلمان اہل قلم کے اخبارات ہفت روزہ 'راوی'، مجلاتی صحافت، قیام پاکستان کے بعد اہم جرائد، مخزن شمارہ 1 تا 10 کا موضوعاتی جائزہ، مخزن کی اہمیت، مشاہیر کی نظر میں وغیرہ ضمنی عنوانات کے تحت صحافت اور موصوف کی ادبی صحافت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں 'اردو ادب میں مقصود الٰہی شیخ کا مقام و مرتبہ' کے عنوان کے تحت موصوف کی مجموعی ادبی خدمات کا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ چھٹا اور آخری باب مصادر و مراجع پر مشتمل ہے جس میں بنیادی ماخذ، ثانوی ماخذ، رسائل و جرائد، اخبارات، ذاتی مخزونات، انٹرنیٹ وغیرہ کی پوری تفصیل پیش کردی گئی ہے۔ کتاب کا ہر باب مکمل حوالہ جات سے مزین ہے۔

موصوفہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ سادہ، سلیس اور دلکش انداز میں ترسیل کے ہنر سے وہ خوب واقف ہیں۔ ان کی محنت شاقہ اور عرق ریزی حد درجہ قابل تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی اس کتاب کی علمی و ادبی حلقوں میں خوب خوب پذیرائی ہوگی۔

تحریریں (نثر پارے)

مصنف: احمد وصی

صفحات: 96، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت 2015

ناشر: نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی

مبصر: رئیس صدیقی 3021/1 شاہجہاں آباد اپارٹمنٹس، سیکٹر 8 دوارکا، نئی دہلی 75

'تحریریں' میں 15 تحریریں شامل ہیں۔ مصنف نے اپنی تحریروں کو مضامین کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے اپنی تحریروں کو نثر پارے کہا ہے۔ ان تمام تحریروں کا انداز بیان اس قدر خوبصورت ہے کہ میں مصنف کے خیال سے متفق ہوں۔

ذکر ان کا اسی بہانے سے، کئی سر والا آدمی، رام چندت اور نادم سیتاپوری— دراصل احمد وصی کی زندگی میں یہ اہم شخصیات ہیں جنھیں وہ بھول نہیں پاتے۔ ان کا ذکر بالکل بیانیہ افسانے کے انداز میں کیا گیا ہے جنھیں صرف اس لیے پڑھا جاسکتا ہے کہ اس میں زبان و بیان کی رنگینی پائی جاتی ہے۔ 'ماس میڈیا اور اردو' اس میں بہت تفصیل سے ماس میں اردو کا چلن اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نغمہ نگاری سے میری یاری: احمد وصی فلم نغمہ نگار بھی ہیں۔ وصی نے، پران جائے پر وچن نہ جائے، ہیرا موتی، بازار حسن کے لیے فلمی نغمے لکھے۔ موجودہ نغمہ نگاری پر اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا ہے۔

پریم چند اور کربلا: یہ تحریر اس لیے بہت اہم ہے کہ احمد وصی نے پریم چند کے اس ڈرامہ میں شامل چند ہندو کرداروں پر بحث کی ہے یا یوں کہیے کہ اس پر تحقیق بھی ہے اور تبصرہ بھی۔

پابند نظم اور بڑھتی دوریاں: احمد وصی کا تجزیہ ہے کہ پابند نظموں کا دور ختم ہوچلا ہے۔ اس کی وجوہات تلاش کی گئی ہیں۔ غزل کو سب سے بڑا حریف قرار دیا گیا ہے۔

تیسرے سر میرے گیت کا دیباچہ: فلمی دنیا میں گیتوں کو اہمیت حاصل ہے لیکن ادب میں اس کی حیثیت صفر ہے لیکن مصنف کو اس بات پر اصرار ہے کہ بہت سے گیت ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ لہٰذا گیت نگاری کو اس قدر فن تسلیم کرنا چاہیے۔

تہذیب- ایک رسالہ ایک تہذیب: اردو پردیش کے سیتاپور سے 1898 میں نکلنے والا ماہنامہ ہے جس کو منشی حسن رضا نے بحیثیت ایڈیٹر مرتب کیا تھا۔ دراصل یہ تحقیقی کام

ہے جسے وصی نے ذاتی لگاؤ کے باعث بہتر طریقے سے کیا ہے۔

بچوں کے لیے لکھنا: احمد وصی شاعر کی حیثیت سے بہ خوبی جانے جاتے ہیں لیکن انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہا اور لکھا ہے۔ اطفال ادب پر اپنی وابستگی اور اس کے خدو خال کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کے تئیں بے اعتنائی پر افسوس ظاہر کیا ہے۔

چھپلیر یا: یہ ایک مزاحیہ خاکہ کہا جاسکتا ہے اور اس کا اہم کردار ہے وہ شخص جسے صرف چھپوانے کا جنون ہوتا ہے خواہ وہ اس لائق ہو یا نہ ہو۔

ہم بھی وہ دن خواب سا دیکھ آئے ہیں: ایران کے شہر مشہد (Mashhad) میں مارچ 2007 کو بین الاقوامی شعر نبوی (نعتیہ مشاعرہ) کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں وصی بھی بہ حیثیت شاعر مدعو تھے۔ دراصل یہ روداد ہے اس میں شرکت کرنے کی۔ اس سفرنامہ کو بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔

بیری اور پتھر: یہ وصی کا لکھا ریڈیو ڈرامہ ہے جس میں توہم پرستی اور درخت کاٹنے کے خلاف موثر طریقے سے پیغام دیا گیا ہے۔ 'نظارۂ عسرت' یہ اردو کا ایک ایسا ڈرامہ ہے جسے ایک مسیحی ایس اے جان پادریت نے لکھا تھا۔ اسے 1942 میں لکھا گیا تھا۔ یہ ایک تحقیقی تحریر ہے۔

مجموعی طور پر زبان و بیان، روزمرہ، محاورہ، شاعرانہ انداز اور افسانوی اسلوب کے لحاظ سے احمد وصی کی شامل کتاب تمام تحریریں دلچسپ ہیں۔

کولاژ

مصنف: اسلم جمشید پوری

صفحات: 117 قیمت: 150 روپے سنہ اشاعت: 2014

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: خورشید حیات، روم نمبر 16/3، نیو این ای کالونی، بلاسپور

پچ رنگ چدریا/ اوڑھ ری نکھی/ میں تو ــــــ/ زندگی رنگ/ رس رنگ/ چھوئی موئی/ تصویروں/ قندیلوں/ پانچ حروف/ ''کولاژ'' /قفسوں کے ہمراہ/ زوال کے موسم سے نکل کر/ افسانچہ/ نظم افسانچہ کھِلنے جاتی۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے افسانچوں کا مجموعہ 'کولاژ' میں کل 38 افسانچے شامل ہیں۔ 117 صفحات کی اس کتاب میں زندگی رنگ، واقعات، حادثات اور کرداروں کے پانچ رنگ، پانچ ستون کی طرح ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے پانچ رنگ، پانچ ستون کی طرح ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے پانچ رنگوں میں تقسیم یہ افسانچے افسانہ پسند قارئین کی شراکت دار ہیں۔ ان کے افسانچوں کے ہر کردار بہت خوبصورتی سے آج کے حالات اور واقعات کا احاطہ کرتے ہوئے، تیز رفتار زندگی کا اصلی چہرہ افسانچہ قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ افسانچہ نگاری بعض چہروں کے یہاں خوش وقتی کا سبب ہو تو ہو اسلم جمشید پوری کے یہاں کل وقتی انداز زیست کا نام ہے۔ جہاں مختصر سے کینوس پر کتاب کائنات کا ہر کردار ورق ورق اُلٹتا دکھائی دیتا ہے۔

افسانچہ کہانی کائنات کے منہدم ہونے سے پہلے کا عمل ہے۔ یہ صدی سامان سے لے کر سوانگ تک دیہیوں کے رفتار کی صدی ہے۔ حیات کو نیا چہرہ دینے والا معاشرہ شکست و ریخت کی منزل سے گذر رہا ہے اور معاشرہ کے معاشروں سے جنگ جاری ہے۔ آج زندگی میں نہ اعتدال ہے اور نہ ہی توازن۔ افسانہ کہانی پسند قارئین کی مضطرب روح، داستان رنگ کہانی زندگی کو ایک چھوٹے سے اسکرین پر دیکھنے پڑھنے کی متلاشی ہے۔ آفاقی معاشرہ کا ہر چہرہ بے جہت منزلوں کی طرف سفر میں ہے اور ثقافتی بحران کی نگیلی اسے سنہری روایت سے انحراف کا مرتکب بناتی جارہی ہے۔

ابھی میں اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب 'اپنی کتیا' کے ساتھ 'نیا سال' منانے جارہے تھے۔

''جب میں نے ایک کتے کو کتیا پر ظلم ڈھاتے دیکھا تو بے چاری کتیا کوں کاں کر کے ہی رہ گئی تھی ــــ'' (اپنی کتیا، ص 51)

''نیا سال! تمھارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا ہے رامو آج پانچ ستمبر ہے۔ چار ماہ پہلے ہی نئے سال کی مبارک باد دے رہے ہو ــــ ہوش میں تو ہو نا۔

بالکل ہوش میں ہوں مالک! آج محرم کی پہلی تاریخ ہے نا۔ بستی میں ڈھول تاشے بج رہے ہیں۔'' (نیا سال، ص 46)

اپنے افسانچوں میں چار حرف کے اسلم نے تیز دھار والے حروف ہتھیار سے رستے ہوئے زخموں کو کریدتے ہوئے سماج کے تضاد اور ان کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اردو افسانچے کے 'گھر گندھیا' اسلم جمشید پوری:

اسلم کے افسانچے ہوں یا افسانے میں انھیں گھر گندھیا کے نام سے پکارتا ہوں، کہانی، کہانی کھیلنے والے اس کھیل میں زمین کی دھول مٹی کے اوپر، نرم انگلیوں سے پھول، پتے گھاس، کھلیان، کیمپس، بھینس، آدمی کی تصویر بنا کر سجاتے ہیں۔ اسلم کے اس کھیل میں تصویروں کے رنگ منقر نہیں ہوتے۔ نوشاد ہوں یا رافع، ذوالفقار ہوں یا اور بھی کئی کردار اپنی صورت لیے ابھرتے رہتے ہیں۔ مکالمہ چلتا رہتا ہے اس کھیل میں تب تک، جب تک سورج غروب نہ ہو جائے ایک نئے چھور میں اُگ آنے کی خاطر۔

مختصر سے کینوس پر گھر گندھیا کے کردار کو اسلم جمشید پوری اندھیرا ہونے سے پہلے ہی قوت گویائی عطا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ میں نے بیشتر افسانچوں میں اسلم کو محبت کے نورا جالتے دیکھا ہے۔ اسلم اپنے افسانچوں میں دبے کچلے کردار کو رات کی چاندنی میں بھگو کر دن کے اجالے کی روشنی میں نہلانا چاہتے ہیں:

''ارے بھئی یہ پاگل معلوم ہوتا ہے۔ اسے بھگاؤ یہاں سے مارو ــــ بھگاؤ ــــ

اور پھر پولس کا ایک جوان اس پھٹے حال شخص کی گردن دبوچ کر مارتا ہوا باہر نکال لے گیا۔'' (غریب، ص 86)

''ہاں ــــ ہاں ــــ آؤ بیٹھ جاؤ۔ ابھی دیں گے آٹوگراف لڑکی دروازے سے جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ دروازہ بغیر آواز کے بند ہو گیا۔'' (آٹوگراف، ص 89)

اسلم رنگ افسانچہ جہاں پر ختم ہوتا ہے وہاں سے ایک نیا افسانہ قاری کے ذہن میں سفر کرتا ہے اور اس سفر میں افسانچے کی انفرادیت، اجتماعیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہر لفظ حیات کو انجیٹ کر کے جہان معنی پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ برق رفتار زندگی میں ستو کی روٹی کی جگہ جب سے فاسٹ فوڈ نے لے لی ہے کہانی چہروں کی کمر بھی چوڑی ہوتی جارہی ہے۔ کہانی بدن کے اس پھیلاؤ میں کوئی طاقت نہیں۔ جب سے افسانہ بدن بیماریوں کا نعمت خانہ بن گیا، افسانچے کی موہوم کمر میں موجود زندگی کے Vibration نے قاری کو اپنے قریب کیا ہے۔ احساس میں اترنے والی ایک نئی سطح کو قریب سے دیکھئے کہ میں کوئی کشش ریکھا کھینچنا نہیں چاہتا۔ لکیریں، دائرے انجماد کی طرف لے جاتے ہیں اور آپ سب آزاد ہیں۔ اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ وہ عناصر خمسہ کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تحریروں میں دکھائی دے جاتے ہیں۔ رومان اور حقیقت کے ساتھ سفر کرنے والے اسلم جمشید پوری کے بیشتر افسانچے یاد رکھے جائیں گے اس کا مجھے یقین ہے۔ بقول حقانی القاسمی:

''فنی اور فکری سطح پر اسلم جمشید پوری کامیاب ہیں۔ کہیں بھی ابلاغ ترسیل کے المیہ کا شکار نہیں ہوا اور نہ ہی وہ اپنی فکر کے صراط مستقیم سے ہٹے ہیں۔ افسانچے جیسی صنف میں داخلی توازن کو برقرار رکھنا بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ آج کے انتشاری عہد میں بات بھٹکتے دیر نہیں لگتی۔''

برق رفتار زندگی ابھی سفر میں ہے اور سفر میں قصر کی اجازت ہے۔ اسلم جمشید پوری کا افسانچہ داستان رنگ زندگی کی 'قصر' صورت ہے جہاں کولاژ چہروں کو گنا نہیں جاتا کائنات کی دھڑکنوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نیلم کی آواز

شاعر: امام اعظم

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: شکیل احمد سلفی، مدیر 'الہدیٰ' مدرسہ احمدیہ سلفیہ، لہریا سرائے، دربھنگہ

'نیلم کی آواز' 2014 کے اواخر میں ڈاکٹر امام اعظم کی تازہ کتاب آئی ہے جو ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ وہ اس سے قبل اپنے پہلے شعری مجموعے 'قربتوں کی دھوپ' کے ذریعے اردو شاعری میں اپنی جگہ مستحکم کرا چکے ہیں۔ زیر نظر شعری مجموعے میں مختلف اصناف میں ان کا کلام موجود ہے جن میں نعت، منقبت، غزلوں اور پابند و آزاد نظموں سمیت 84 شعری تخلیقات ہیں۔ جبکہ 40 قطعات ان پر مستزاد ہیں۔

کتاب کی ابتدا ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، احسان ثاقب، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر عبد الحق امام کی تحریروں سے ہوتی ہے جن میں بہت اختصار کے ساتھ ڈاکٹر امام اعظم کے فکر و فن کی تعبیر و تفہیم کی گئی ہے۔ جبکہ شاعر ڈاکٹر امام اعظم نے تحریریں عرض ہیں کہ خط و خال بہار' کے عنوان سے اپنا نظریہ فکر و فن بھی واضح کیا ہے۔ احسان ثاقب نے ڈاکٹر امام اعظم کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر مقدمات قائم کرکے ان کی شاعری سے اس کے ثبوت فراہم کیے ہیں جبکہ حقانی القاسمی نے امام اعظم کی شاعری میں ایک Positivity resonance کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے انسان کو مضطرب کر دینے والے آہنگ کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے کتاب میں شامل نظم 'برکھا کی تلاش' کے یہ اشعار درج کیے ہیں:

تمھارے بن کہاں بستی میں وہ گلاب کی بو کہاں گئے وہ دمکتے ہوئے حسین چہرے
جو تم نہیں تو گلستاں میں اک خموشی ہے تمھارے بن مری کھیتی بھی سونی سونی ہے
تمھارے بن مرا جیون اداس لگتا ہے

شعری حصہ کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نعت ہے اور منقبت۔ کتاب کا سب سے اہم پہلو اصناف کا تنوع ہے جس میں فکری وسعت اور فن کی پختگی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ مجموعے میں موجود غزلیہ حصہ قاری پر عصری حسیت کے حوالے سے اپنی گرفت بناتا چلا جاتا ہے۔ ہر غزل میں عہد کا کرب اور اقدار شکنی کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہوں کچھ اشعار:

پیار بھرے پھولوں کا تحفہ ہم نے بھیجا تھا اس کو
لیکن اس نے کانٹوں کی صورت میں ہمیں انعام دیا

یہ سب ہیں اہل سیاست انھی کی سازش ہے
یہی ہے سچ جسے سارا جہاں نہ سمجھے گا

لیکن ایسا نہیں ہے کہ عصری حسیت اور عہد کے کرب نے فن کے تقاضے کو مجروح کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر خیال کو انھوں نے اپنے اندروں میں بسایا ہے تب کہیں جاکر اس کے اظہار کو راہ دی ہے:

پیاسوں کو فقط قطروں پر کرنا ہے قناعت جو پی کے ہوئے مست انھیں جام ملے گا

پابند غزلوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے آزاد غزلوں اور نظموں میں بھی ایک ماہر فنکار کی طرح فن کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ نظمیں تو بہت سی ہیں اور ہر نظم ایک نئی جہت لیے ہوئے ہے جس میں حالات کی عکاسی بھی ہے اور احساس جمال کا اظہار بھی۔ کچھ نظمیں تعارفی ہیں جو مشہور شخصیات کے لیے لکھی گئی ہیں۔ وہیں 'میری اردو زباں' اور 'یہی کولکاتا ہے' جیسی نظمیں لکھ کر انھوں نے طویل نظموں کے لکھنے پر اپنے قادر الکلام ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔

شعری مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے غزلوں کے ساتھ ان کی نظمیں نیلم کی آواز، آستھا، دوسری شادی، نیا سال، جزیرہ، برکھا رت، دوہا رنگ، میری اردو زباں، یہی کولکاتا ہے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ نیلم کی آواز دراصل اس محبت کی علامت ہے جس پر پابندی سلاسل کی روایت کبھی نہیں ٹوٹی مگر انسان نے اس جبر کے آگے سپر نہیں رکھا۔ آستھا بھی ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسی علامت بن گئی ہے جو انصاف کا گلا گھونٹنے کے لیے استعمال کی گئی ہے اور کئی سو سالوں کی تاریخ کو اس آستھا کے نام پر مسخ کر دیا گیا۔ 'میری اردو زباں' اردو زبان و ادب کی ایک اپ ڈیٹ تاریخ بن گئی ہے۔ اسی طرح کولکاتا شہر نشاط کا ایک مکمل تذکرہ ہے جس میں علاقائیت سے اوپر اٹھ کر حقیقت کا اعتراف موجود ہے۔

مشمولات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر امام اعظم کا مشاہدہ انتہائی گہرا اور طبیعت بڑی اخاذ ہے۔ ہر واقعہ کے اندرون میں پنہاں مسئلے کو ان کی نظر بہ آسانی بھانپ جاتی ہے۔ یقین ہے کہ نیلم کی آواز اردو شاعری کے سرمایے میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگی اور اپنے نئے لب و لہجہ اور منفرد موضوعات کے اظہار کے لیے پہچانی جائے گی۔

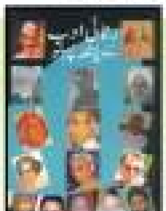

رثائی ادب کے چند پہلو

مصنف/ ناشر: وسیم حیدر ہاشمی

صفحات: 314، قیمت: 163 روپے

مبصر: ڈاکٹر شریف الدین، صدر، شعبۂ اردو رتن سین ڈگری کالج بانسی، سدھارتھ نگر، یوپی

زیر تبصرہ کتاب 'رثائی ادب کے چند پہلو' وسیم حیدر ہاشمی کے مختلف النوع مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو رسائل و جرائد میں شائع ہوئے یا سیمیناروں میں پڑھے گئے۔ حالانکہ اس موضوع پر اور بھی نایاب کتابیں دستیاب ہیں۔ لیکن ان میں کہیں نہ کہیں مواد، اسلوب یا موضوعات سے متعلق تشنگی پائی جاتی ہے۔ جبکہ مذکورہ کتاب مواد، موضوع، ہیئت، اسلوب اور حجم کے اعتبار سے مکمل ہے۔

کتاب کے بیشتر مضامین کا تعلق تحقیقی اور تاثراتی ہے جو مختلف پہلوؤں سے رثائی ادب کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کرتا ہے اور میر انیس و دبیر اور تعشق کے رثائی کلام کے تعلق سے رثائی ادب کے چند اہم پہلو کا ناقدانہ جائزہ ہے۔

ہاشمی صاحب نے 'رثائی ادب کے چند پہلو' میں تغزل، اخلاقی اقدار، باطل کردار، کربلا اور اخلاقی اقدار کی عکاسی، تعشق کے رثائی کلام میں 1857 کی جھلک، شبلی، مسعود حسن رضوی ادیب، اکبر حیدری کشمیری اور شارب ردولوی وغیرہ کی انیس شناسی اور شاعر جمالی کی غزلوں میں ذکر و فکر کربلا کی حسین عکاسی جیسے انتہائی معلومات افزا مضامین و موضوعات پر قلم اٹھا کر رثائی ادب کے مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون کربلا اور اخلاقی اقدار کے عنوان سے ہے جس میں مصنف نے میر انیس کی اخلاقی شاعری کو مختلف جہات اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے اور انیس کا کلام بلاشبہ درس اخلاقیات سے لبریز نظر آتا ہے۔ اور انیس کی شاعری میں ہی اخلاقیات کے گوناگوں پہلو اور نکات بھرپور نظر آتے ہیں۔ انیس بڑے قادر الکلام ہیں۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، مترادفات، اختصار اور طول پر بھی ان کو قدرت حاصل ہے۔

مضمون بعنوان 'مرزا دبیر کی شاعری کی چند اہم خصوصیات' میں مصنف نے دبیر کی شاعری کے اہم خواص، لیاقت، علمیت، بلاغت، فصاحت اور قرآن و حدیث پر مکمل عمل و گرفت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ عروض و بلاغت صنعت تضاد، ایہام، مراعات النظیر، لف و نشر، تشبیہات، تمثیلات، محاکات، تلمیحات اور استعارات کا جوہر بوطالکلام دبیر کے یہاں ہے

وہ کئی سطحوں پر متحرک نظر آتا ہے۔ تلمیح اور استعارے ترا شنے کا خصوصی تذکرہ کیا ہے مثلاً

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

دبیر کا مشہور زمانہ مرثیہ 'کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے' میں دبیر کا ماہر قلم اور بھی تیز رفتار ہو جاتا ہے۔ بطور مثال یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

یوسف ہے یہ کنعاں میں، سلیماں ہے سبا میں
عیسیٰ ہے مسیحائی میں، موسیٰ ہے دعا میں
ایوب ہے یہ صبر میں تیغ ہے بکا میں
شبیر ہے مظلومی میں، حیدر ہے وغا میں

مضمون 'شاعر جمالی کی غزلوں میں ذکر و فکر کربلا' میں شاعر جمالی کی غزلوں میں کربلا کے ذکر کی نشاندہی کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ پیش نظر کتاب کے تمام مضامین اپنے موضوعات و عنوانات کے لحاظ جامع و معلومات افزا ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع اور پیش کش دونوں ہی اعتبار سے ایک نئی جہت کا اضافہ ہے۔ انیس شاہی کے تحریر کردہ مضامین سے ہاشمی صاحب کی رثائی ادب سے متعلق، دلچسپی، فکر و نظر کی پختگی، بلندی، گہرائی اور گیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی، سنجیدگی، برجستگی، شگفتگی اور جامعیت بھی ہے اور منفرد و ممتاز محقق کی ذمے داری بھی۔

کتاب کے مصنف لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو قارئین کے روبرو ایسی کتاب پیش کی جو ان کے علم و ادراک میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے مگر صاحب کتاب کے اسلوب پر احساس برتری اور تعلی کا رنگ غالب ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ علم و دانش کے حلقوں میں اس کتاب کو وہ پذیرائی حاصل ہوگی جس کی یہ بجا طور پر مستحق ہے۔

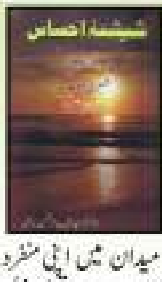

شیشۂ احساس

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر سید مجیب الرحمن بزمی

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے

مبصر: اسما، ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

20 ویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد اردو شاعری کے میدان میں اپنی منفرد شناخت قائم کرنے والوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر مجیب الرحمن بزمی کا ہے جن کا تعلق ضلع بھوجپور، آرہ بہار سے ہے۔ مجیب الرحمن بزمی نے شاعری کی ابتدا 1962 میں کی۔ انھوں نے سنجیدہ شاعری بھی کی اور طنزیہ اور مزاحیہ بھی۔ بچوں کے لیے نظمیں بھی کہیں۔ 'سچے موتی' کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعہ نظم منظر عام پر آچکا ہے جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوئی۔

زیر تبصرہ کتاب 'شیشۂ احساس' 160 صفحات پر مشتمل ڈاکٹر مجیب الرحمن بزمی کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں نظمیں و مناجات و قطعات شامل ہیں۔ بزمی نے سلسلہ حسب و نسب کے بعد 'کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان سے ڈیڑھ صفحے کا پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کے بعد ماہر اقبالیات ڈاکٹر مظفر حسین ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، ابو نصرت فاروق صارم اور ڈاکٹر وکیل احمد رضوی، صدر شعبۂ اردو، رام گڑھ کا مقدمہ شامل ہے۔

ان کے مجموعے کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے موضوع اور ڈکشن دونوں ہی اعتبار سے اپنی شناخت قائم کی۔ کلاسیکی شاعری کے ساتھ ساتھ رومانی شاعری بھی کی اور کہیں کہیں تغزل کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ ان کے یہاں زمانے کے تجربات و مشاہدات اور معاشرتی کرب کی آئینہ داری بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ آج کا انسان جن حالات سے دوچار ہے اور جس کرب میں مبتلا ہے اس کا مشاہدہ بزمی نے بہت قریب سے کیا اور اسے اپنے جذبات کی شدت، تخیل کی رنگ آمیزی اور مشاہدے کی چاشنی میں پرو کر نہایت سادہ اور موثر انداز میں قارئین کے ساتھ پیش کیا۔

بزمی کی شاعری تقریباً نصف صدی پر محیط ہے اس طویل مدت میں انھوں نے انسانی تہذیب و ثقافت کے کئی عروج و زوال دیکھے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شیشۂ احساس اپنا ہر گھڑی زد پر رہا	دوستوں کے ہاتھ میں ہر دور میں پتھر رہا
جرم ہے، جبر ہے، قانون ہے، تعزیریں ہیں	عہد حاضر کی یہ بخشی ہوئی تقدیریں ہیں
شعور و فکر کے خوگر تو ہر طرف پائے	ملا نہ کوئی بھی انسان آشنا پایا

غزلوں سے قطع نظر مجموعے میں 12 نظمیں اور چند قطعات بھی شامل ہیں۔ ان کی نظم 'جذبات کا شعلہ' پر اختر شیرانی کی نظموں کی جھلک کو محسوس کیا جا سکتا ہے جس کا اظہار ڈاکٹر مظفر حسین نے کتاب میں شامل اپنے مضمون میں کیا ہے۔ زیادہ تر نظمیں رومانی جذبے و کیفیت سے سرشار نظر آتی ہیں۔ چند نظمیں قومی یک جہتی پر بھی مبنی ہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بزمی کی شاعری کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ ان کے یہاں ہر طرح کے موضوعات و احساسات کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے اور جگہ جگہ قدیم و جدید کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ امید ہے کہ ان کا یہ مجموعہ 'شیشۂ احساس' قارئین کے احساسات کو ضرور متاثر کرے گا۔

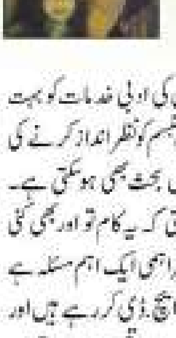

واجدہ تبسم: اذکار وافکار

مرتبہ: مسرور صغریٰ

صفحات: 300، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014

کتاب ملنے کا پتہ: عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

غوث منزل، تالاب ملا رام، رام پور (یوپی)

اردو فکشن کی وہ خواتین قلم کار جن کو نظر انداز کیا گیا یا جن کی ادبی خدمات کو بہت جلد بھلا دیا گیا ان میں سے ایک اہم نام ہے واجدہ تبسم۔ واجدہ تبسم کو نظر انداز کرنے کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں اور اس موضوع پر ایک مدلل اور مفصل بحث بھی ہو سکتی ہے۔ واجدہ تبسم پر عدم توجہی کی وجہ محض ان کی فحش نگاری نہیں ہو سکتی کہ یہ کام تو اور بھی کئی خواتین و مرد قلم کاروں نے کیا ہے۔ واجدہ تبسم پر تحقیقی مواد کی فراہمی ایک اہم مسئلہ ہے کیونکہ وہ اسکالرز جو ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم فل یا پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور ان کا موضوع خواتین افسانہ نگار یا ناول نگار یا پھر براہ راست واجدہ تبسم ہی ہیں تو ان اسکالرز اور محققین کو خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

'واجدہ تبسم: اذکار وافکار' کو چار عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ عنوانات اس طرح ہیں۔ عکس صفات، عکس ذات، عکس شاعری اور عکس خطوط۔ پہلے موضوع 'عکس صفات' میں جن قلم کاروں اور محققین کے مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کے نام ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی، زبیر رضوی، علی احمد فاطمی، محمد حامد سراج، ابوذر ہاشمی، حقانی القاسمی، سراج نقوی، مرغوب عابدی، جہانگیر رضا کاظمی، عاصم شہنواز شبلی، شیخ اختر کاظمی، شہناز کنول غازی اور خود مسرور صغریٰ۔ مذکورہ سارے قلم کاروں کے مضامین انتہائی مختصر ہیں اور عجیب سی بات ہے کہ بھی مضامین کے عنوانات بھلے ہی الگ الگ ہوں لیکن ان کے مواد اور موضوع میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور سوائے مرغوب عابدی کے کسی قلم کار نے واجدہ تبسم کے کسی افسانے

سے اسلوب یا ان کے موضوعات کے تعلق سے بطور نمونہ کوئی حوالہ اور اقتباس بھی پیش نہیں کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی مضامین اس لیے اہم اور قابل قدر ہیں کہ ان قلم کاروں نے اندھیرے میں چراغ جلانے کی بہترین کوشش کی ہے اور اس تاریکی کو دور کیا ہے، جو واجدہ تبسم کے گرد چھائی ہوئی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ مسرور صغریٰ نے اپنا مضمون بہت محنت اور تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ مضمون کتاب کے 28 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے واجدہ تبسم کے سوانحی حالات، ان کا مزاج، عادات واطوار، ان کا خاندانی پس منظر، تعلیم کے حصول میں حائل دشواریاں، ان کے افسانوں کے نام، اسلوب، افسانوں کا ماحول اور پس منظر، افسانوں کے موضوعات، ان کے تئیں سماج کے ردے وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور سیر حاصل بحث بھی کی ہے لیکن خود ان کے مضمون میں معاشرہ اور مرد حاوی سماج سے متعلق ایسے سوالات اٹھائے گئے ہیں جن پر طویل و بسیط اور مفصل بحث کی جاسکتی ہے۔

کتاب میں 'عکسِ ذات' کے تحت واجدہ تبسم کے دو انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا انٹرویو نریش کمار شاد نے کیا ہے اور دوسرا انٹرویو شاہد پرویز اور عتیق الرحمٰن نے مشترکہ طور پر لیا ہے۔ مذکورہ دوسرا انٹرویو خاصا طویل ہے اور کتاب کے 33 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں انٹرویوز سے واجدہ تبسم کی شخصیت، سماجی پس منظر، خاندانی حالات، عادات و اطوار، مزاج کی نرمی اور تلخی، افسانہ نگاری کی ابتداء اور ماحول و موضوعات وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے لیکن بہتر ہوتا کہ اس کے ساتھ یہ بھی درج کیا جاتا کہ یہ انٹرویو کب لیے گئے تھے اور ان کی اشاعت سب سے پہلے کن رسائل میں ہوئی تھی۔ اسی حصہ میں واجدہ تبسم کی اپنی تحریر 'میری کہانی' کے عنوان سے شامل کتاب کی گئی ہے۔ یہ تحریر 29 صفحات پر مشتمل ہے اور بڑی پر تاثیر ہے۔ اس میں واجدہ تبسم نے اپنے ابتدائی دور کے اور بعد کے حالات بڑے کرب آمیز اسلوب میں تحریر کیے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ کرب آمیزی کوئی نئی یا اچھوتی چیز نہیں ہے کیونکہ بیشتر قلم کاروں کو اسی طرح کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں نے اپنی زندگی اسی طرح حسرت اور عسرت وغربت میں بسر کی ہے۔ حالات کی چکی میں پس کر یا دکھ درد سے صیقل ہو کر ہی کوئی قلم کار بڑا اور اہم قلم کار بنتا ہے۔

اس کتاب کا تیسرا باب واجدہ تبسم کی شاعری سے 'عکس شاعری' عنوان کے تحت سجایا گیا ہے۔ اس میں ان کی تین نظمیں — سہاگن کی انوکھی دعا، ہرے بھرے خواب، آئینے سے اور دو غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ ان کی پہلی غزل کا ایک شعر اس طرح ہے:

کھلی کتاب تھے، ہم کو پڑھا نہیں تم نے
ہر اک ورق پہ تمھارا ہی نام لکھا تھا

کتاب 'واجدہ تبسم: اذکار و افکار' کا آخری باب 'عکس خطوط' عنوان کے تحت مزین کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف قلم کاروں کے، واجدہ تبسم کے نام لکھے تقریباً 35 خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ جن لوگوں نے خطوط لکھے ان کے نام اس طرح ہیں۔ فراق گورکھ پوری، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، رام لعل، پریم وار برٹنی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، خدیجہ (دوسری بیگم جاں نثار اختر) اور یونس دہلوی۔ ان خطوط میں تین چار خطوط واجدہ تبسم کے اپنے شوہر اشفاق کے نام بھی ہیں اور اشفاق کے خطوط واجدہ تبسم کے نام بھی موجود ہیں۔

مسرور صغریٰ نے نہ صرف اندھیروں میں بلکہ آندھیوں میں ایک چراغ جلایا ہے اور محققین و اسکالرز کے لیے ایک بہترین کتاب مرتب کی ہے۔ امید ہے افسانوی ادب و نسائی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر واجدہ تبسم کی تحریروں کے پرستاروں کو یہ کتاب ضرور پسند آئے گی۔

رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق

مصنف: ڈاکٹر عبدالحمید
صفحات: 336 قیمت: 156 روپے
ناشر: کتابی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ابرار احمد اعظمی، 155 سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 67

زیر تبصرہ کتاب رشید حسن خاں کی حیات اور ادبی خدمات پر محیط ڈاکٹر عبدالحمید کا پہلا مبسوط علمی کام ہے جس میں موصوف نے ان کے تمام علمی و ادبی پہلوؤں پر مفصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب قاری کو معلومات فراہم کراتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے رشید حسن خاں کی ہمہ جہت ادبی شخصیت اور میدان تحقیق و تدوین میں ان کی عبقریت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

باب اول 'رشید حسن خاں: حالات زندگی اور شخصیت' ہے اس باب میں مصنف نے رشید حسن خاں کی شخصیت اور ذہنی تشکیل پر گفتگو کرتے ہوئے خاندان، پرورش و پرداخت، عہد طفولیت، تعلیم و تربیت، ازدواجی و معاشی حالات، ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی تغیرات نیز ان تغیرات نے ان کی شخصیت پر جو اثرات مرتسم کیے ان تمام امور کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے اور حقائق کو بڑے ہی مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کو ان کی شخصیت کے مد و جزر کو سمجھنے میں کسی طرح کی کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

باب دوم 'رشید حسن خاں بحیثیت محقق' ہے۔ اس باب میں مصنف نے تحقیق کے معنی و مطالب کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اچھے محقق کے اوصاف پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رشید حسن خاں ان تمام اوصاف سے متصف تھے جو ایک اچھے محقق کے اندر ہونے چاہیے اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق کے جو اصول وضع کیے اس پر خود عمل کیا اور عملی تحقیق کے ایسے بیش بہا اور مثالی نمونے پیش کیے جو محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ رشید حسن خاں کے تحقیقی و تدوینی اصول و نظریات اور نامور ادیبوں پر ان کے تبصرے پر بھی بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی تحقیق پر ان کی کتاب 'ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'، 'تدوین، تحقیق، روایت' میں پیش کردہ مسائل و موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تحقیق کے گرتے معیار کو روکنے اور اس کو بہتر بنانے کے لیے رشید حسن خاں نے جو اصول وضوابط بنائے تھے اور تحقیق کے نگراں اور تحقیق کرنے والے طلبا کو جن اصول وضوابط کو اپنانے کی بات کی تھی اگر اس پر عمل کیا گیا ہوتا تو اردو تحقیق آج عالمی تحقیق کے شانہ بشانہ چلتی نظر آتی لیکن افسوس کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا۔

باب سوم 'رشید حسن خاں بحیثیت مدوّن' ہے۔ یہ باب دراصل دوسرے باب کی توسیع ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر عبدالحمید نے تدوین سے متعلق ان کے نقطۂ نظر، تدوین کا مقصد اور ان کے ذریعہ مدوّن کی گئی کتابوں پر مفصل اور مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہ کہ انھوں نے دوسرے لوگوں کی طرح صرف تھیوری ہی نہیں دی بلکہ وہ تحقیق و تدوین میں جس اعلیٰ معیار کی توقع دوسروں سے کرتے تھے اس سے بہتر عملی نمونہ خود پیش کیا، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے تدوین کے کئی ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے مثنوی سحرالبیان، مثنوی گلزار نسیم، مثنویات شوق، مصطلحات ٹھگی اور زٹل نامہ (کلیات جعفر زٹلی) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

رشید حسن خاں کی تدوینی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے گیان چند جین اپنے مضمون 'خدائے تدوین' میں فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کی تدوین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ 'اگر تدوین کوئی ملت ہوتی تو یہ کتابیں اس کے دو مقدس صحیفے قرار پاتے اور ان کا

مدون ان کا نہیں، لیکن میں انھیں بےشبہ تدوین کہنے پر قانع نہیں، انھیں خدائے تدوین کہوں گا گو اس پر کتنے زعما چیں بہ جبیں ہوں۔" (مشمولہ رشید حسن خاں، کچھ یادیں کچھ جائزے ص 64)

باب چہارم 'رشید حسن خاں بحیثیت نقاد' ہے۔ اس باب میں مصنف نے رشید حسن خاں کی تنقید نگاری کو موضوع بحث بنایا ہے۔ یوں تو رشید حسن خاں کی بیشتر تحریروں میں تنقیدی عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن انھوں نے باقاعدہ تنقید سے متعلق دو کتابیں 'تلاش و تعبیر' اور 'تفہیم' تصنیف کی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحمید نے ان دونوں کتابوں کی روشنی میں رشید حسن خاں کی تنقیدی بصیرت اور اردو ادب میں رائج تنقید کے تئیں ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

باب پنجم 'زبان و قواعد کے ذیل میں رشید حسن خاں کی خدمات' ہے۔ اس باب میں اصلاح املا، صحت الفاظ اور زبان و قواعد میں رشید حسن خاں کی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔

باب ششم 'رشید حسن خاں کی خطوط نگاری' ہے۔ اس باب میں رشید حسن خاں کی شخصیت کو ان کے خطوط کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی علمی اور غیر علمی نثر میں کیا فرق ہے۔ جب کوئی شخص کسی علمی و ادبی معاملہ میں ان سے مشورہ طلب کرتا تھا تو وہ کس انداز میں اس کا جواب دیتے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی کیسی تھی۔ جن لوگوں سے ان کے نظریاتی اختلافات تھے یا جنھوں نے ان کی تحریروں پر تنقید کی تھی ان کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا۔ ان تمام باتوں کو ان کے خطوط کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ خطوط دراصل رشید حسن خاں کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں جن میں ہم رشید حسن خاں کی سیاسی، سماجی، معاشی، ادبی، تہذیبی، ذاتی اور گھریلو زندگی کے حالات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

'رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق' رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر اپنی نوعیت کی پہلی ایسی کتاب ہے جس میں ان کی حیات اور ادبی خدمات کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علم و ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے یہ کتاب ایک گراں قدر سرمایہ سے کم نہیں ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہوں گی۔ خاص طور پر رشید حسن خاں پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ بے حد قیمتی اور معلوماتی ذخیرہ ثابت ہوگی۔

مجلّہ غالب نامہ، نئی دہلی (خصوصی شمارہ بیاد علی سردار جعفری)

مدیر اعلیٰ: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

شمارہ نمبر: 1، جلد: 38، جنوری 2015

صفحات: 504، قیمت: 200 روپے

ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی

مبصر: معصوم عزیز کاظمی، آئی پی ایس (ریٹائرڈ)

کاظمی ہاؤس، وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا (بہار)

علی سردار جعفری کو اردو شعر و ادب میں کئی امتیازات حاصل ہیں۔ انھوں نے مروج اصول و ضوابط، نظریات و اقدار اور انداز و اسلوب کو علیٰحدہ کہن گردانا اور زندگی آمیز و زندگی آموز ادب کے داعی رہے۔ وہ ایک متنازعہ ادبی شخصیت تھے لیکن بشریت اور آفاقیت کے ثناخواں تھے۔ ان کی ادبی تخلیقات کی فہرست طویل ہے۔

1967 میں انھوں نے ایک معیاری سہ ماہی رسالہ 'گفتگو' شائع کرنا شروع کیا جس کی زندگی مختصر رہی۔ (1) دیوان غالب (2) دیوان میر (3) کبیر بانی (4) پریم وانی کا دولسانی ایڈیشن مرتب کیا جس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ جدید اردو شعرا پر ٹی وی سیریل 'کہکشاں' کے علاوہ انھوں نے ڈاکومینٹری فلمیں بھی بنائیں جس میں اقبال پر بنائی گئی ڈاکومینٹری فلم بھی شامل ہے۔ 'روشنی اور آواز' کے عنوان سے تیار کردہ شوز کی اسکرپٹ اور مکالمے بھی انھوں نے لکھے۔

مجلّہ 'غالب نامہ' نئی دہلی کا جنوری 2015 کا شمارہ سردار جعفری کی حیات و خدمات کے لیے وقف ہے۔ غالب اکادمی نے 2013 میں سردار جعفری پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس میں ملک اور بیرون ملک کے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی یہ شمارہ میں اس سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں پر مبنی ہے جن کی کل تعداد 31 ہے۔

پانچ مقالے شخصیت پر ہیں۔ ان میں سردار جعفری کی شخصیت اور ان کی کاوشوں کا مخلصانہ ذکر ہے۔ شخصیت پر علی احمد فاطمی کا مقالہ 'علی سردار جعفری: حیات و خدمات' 38 صفحات پر محیط ہے اور خوب ہے۔ محمد ضیاء الدین احمد شکیب کا مضمون 'یادوں کے ہجوم میں' ایک تاثراتی مضمون ہے۔ اس مضمون میں سردار جعفری سے زیادہ مصنف حاوی ہے۔ مصنف نے اس میں منتشر یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوشش سردار جعفری کی مکمل شبیہ پیش کرنے میں قاصر ہے۔ کشور ناہید کا مضمون تشنہ ہے اور شاید عجلت میں لکھا گیا ہے۔

مرزا حامد بیگ کا مقالہ 'ترقی پسندانہ شعری روایت اور سردار جعفری' کا موضوع اہم ہے لیکن اس میں اقتباس و حوالوں کی کثرت ہے۔ اس مضمون میں ترقی پسند عہد کا منظرنامہ بخوبی پیش کیا گیا ہے۔

'اودھ کی خاک حسین' (سید محمد عقیل)، 'نوک قلم سے ابھری سرداری یادیں' (صغیر افراہیم)، 'نئی دنیا کو سلام: پس نوآبادیاتی تنقید اظہار' (مولا بخش) اور 'ترقی پسند ادب: علی سردار جعفری' (سرور الہدیٰ) میں سردار جعفری کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان مضامین میں سب سے اہم مضمون سرور الہدیٰ کا ہے جو سردار جعفری کی ایک اہم نثری تصنیف 'ترقی پسند ادب' پر مرکوز ہے۔ سید محمد عقیل کا مضمون نظم 'اودھ کا خاک حسین' کا تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے اور تاثراتی تنقید کا تاثر دیتا ہے۔ صغیر افراہیم کا 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' کا جائزہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سردار جعفری نے اس کتاب میں آپ بیتی کے توسط سے جگ بیتی کی شکل دکھائی ہے۔ مولا بخش نے اپنے مضمون 'نئی دنیا کو سلام: پس نوآبادیاتی تنقید اظہار' کو اردو میں لکھی گئی طویل نظموں کی روایت میں ایک ناقابل فراموش اضافہ قرار دیا ہے۔

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اپنے مقالے 'سردار جعفری بحیثیت نقاد' میں سردار جعفری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ خود کو نقادوں کی صف میں شامل نہیں کرتے ہیں اور انھوں نے پیشہ ورانہ نقادوں کا رویہ کبھی اختیار نہیں کیا ہے۔ یہ قول صداقت پر مبنی ہے کیونکہ سردار جعفری نے اپنی تحریروں میں تنقیدی مباحث سے زیادہ نظریہ سازی یا ذہن سازی کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اقبال پر سردار جعفری کی تنقید کا جائزہ عمیر منظر نے اپنے مقالہ 'سردار جعفری کی اقبال شناسی' میں لیا ہے۔ 'سردار جعفری کی غالب شناسی' (خالد علوی)، 'سردار جعفری کا دیوان میر' (انیس اشفاق)، 'سردار جعفری کی میر تنقید' (احمد محفوظ) میں سردار جعفری کے مرتب کردہ دولسانی دواوین غالب اور دیوان میر کے دیوانوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ان مقالوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سردار جعفری نے اردو کے کلاسیکی شعرا کا مطالعہ ترقی پسند نظریات کے دائرے میں رہ کر کیا ہے۔ ان مقالوں میں اردو کے کلاسیکی شعرا کے بارے میں سردار جعفری کے خیالات و تجزیات کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔

'سردار جعفری کے کلام میں شعری عمل کی سطحیں' (عتیق اللہ) اس شمارہ کا ایک اہم مضمون ہے۔ عتیق اللہ نے سردار جعفری کو کسی ایک اسلوب کا شاعر نہیں گردانا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سردار جعفری نے پابلو نرودا، ناظم حکمت، اراگاں، پال ایلیوا کے ساتھ اقبال، جوش اور فیض کے اثرات قبول کیے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سردار جعفری کے شعری تجربوں میں طول کلامی نے انھیں نقصان پہنچایا ہے۔ عتیق اللہ نے اپنے مقالہ میں یہ بھی کہا ہے کہ سردار جعفری اپنی شاعری میں تصویروں سے کلام کرتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں انھوں نے حوالوں اور اقتباسات کا سہارا لیا ہے۔ طلیق انجم نے اپنے مضمون میں سردار جعفری کی اردو دوستی اور جرأت اظہار کو بیان کیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی

(سردار جعفری اور مارکسی جمالیات)، زبیر رضوی (سردار جعفری کا اسلوب شعر)، قاضی جمال حسین (ترقی پسند تصور حسن)، ناصر عباس نیر (ترقی پسند اور نوترقی پسند جمالیات)، ابوظہیر ربانی (سردار جعفری کا فکری تناظر)، انور معظم (ترقی پسند تحریک، ترقی پسند ادب اور ترقی پسندی) کے مقالے قابل مطالعہ ہیں۔ ان مقالوں میں ترقی پسند ادب کے نظریات و تصورات کے مختلف پہلوؤں کی مخلصانہ وضاحت کی گئی ہے۔

گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ ادب وہی ہے جو زندگی کی حرارت اور حرکت سے جڑا ہے۔ سردار جعفری کے تخلیق کردہ ادب میں یہ اوصاف ہیں۔ انھوں نے بہت کام کیا اور معرکے سر کیے۔ مجلہ غالب نامہ کا یہ شمارہ سردار جعفری کی خدمات کے اعتراف کی ایک قابل قدر کوشش ہے۔ اس کی حیثیت دستاویزی ہے۔ اس شمارہ میں اگر (1) زندگی نامہ (2) تصانیف و اعزازات کی تفصیل (3) مشاہیر کی رائے (4) سردار جعفری کی افسانہ نگاری (5) عہد اور ہمعصر (6) رسائل کے خصوصی شمارے اور کتابوں کی فہرست شامل کر دی جاتی تو اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

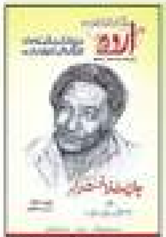

سہ ماہی 'اردو' (جاں نثار اختر نمبر)

مدیر: وسیم فرحت (علیگ)
جلد نمبر: 5، جون 2015، قیمت: 600، قیمت: 500 روپے
ناشر: مدیر 'اردو' دبستان، کہکشاں کالونی، ودلگاؤں روڈ، امراوتی
مبصر: شعیب احمد

'اردو' کے اس شمارے میں مدیر اعلیٰ وسیم فرحت کی اچھوتے عنوانات والی کم و بیش ایک درجن کتابوں کے اشتہارات حیرت میں ڈالتے ہیں۔

مشمولات کی جانب بڑھیں تو 'نقم خانۂ اختر' (فہرست) میں ادبی ستاروں کی کہکشاں آباد ہے۔ خاص نمبر کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کو حسب سابق ایک بامعنی و پرکشش عنوان دیا ہے۔ اس اہم نمبر کا انتساب منور پیر بھائی اور ممتاز منور صاحبہ کے نام ہے۔ واضح ہو کہ منور پیر بھائی 'اردو' کے سرپرست بھی ہیں جنھیں اداریہ میں بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ خاص نمبر کی ابتداء میں جاں نثار اختر کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جسے وسیم فرحت نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔

اول باب 'حیات اختر' ہے جس میں جاں نثار اختر کے دوستوں نے اور متعدد ادبی شخصیات نے اختر کی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اختر کا زمانۂ علی گڑھ، گوالیار کی نوکری، صفیہ سے شادی، بھوپال کی نوکری، بمبئی کی جد وجہد، صفیہ کا انتقال، خدیجہ سے شادی، بمبئی میں گیت نگاری، سیما سازی غرض کہ اختر کی زندگی کے ہر گوشے پر اس باب میں بہت عمدگی سے ہر بات پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں جوش ملیح آبادی، عصمت چغتائی، جگن ناتھ آزاد، فکر تونسوی، پرکاش پنڈت، اختر الایمان، سہیل عظیم آبادی، جوگندر پال، واجدہ تبسم، ندا فاضلی، نعیم کوثر، یوسف ناظم، انتظار حسین، خلیق انجم، کشور سلطان اور حامد اقبال صدیقی شامل ہیں۔ اس خاص نمبر کا سب سے قیمتی حصہ 'جہات اختر' ہے، جس میں جاں نثار اختر کی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اختر کی ترقی پسند شاعری، آخری عمر والی جدید شاعری، گھر آنگن کی رباعیات قطعات وغیرہ پر ایک مکمل اور مبسوط تنقیدی تجزیہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ ہر زاویۂ فکر کے ناقدین نے اختر صاحب کو اپنی تحریروں سے خراج پیش کیا ہے۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو ازل سے ترقی پسند تحریک کے خلاف رہے ہیں اور وہ بھی جنھوں نے اس تحریک کی تردید میں اک نئی فضا قائم کی۔ اس ایک کتاب میں مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے بھی یکجا ہو گئے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی سہ ماہی 'اردو' کا یہ نمبر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس باب کے لکھنے والوں میں فراق گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، ظ انصاری، علی سردار جعفری، باقر مہدی، راہی معصوم رضا، کرشن چندر، مغنی تبسم، محمد حسن، عتیق حنفی، خواجہ احمد عباس، خواجہ احمد فاروقی، قمر رئیس، وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، فضیل جعفری، بشر نواز، علی احمد فاطمی، شمیم طارق، قمر جہاں، وقار صدیقی، کلیم ضیا، کوثر مظہری، عارف جونپوری، راشد انور راشد شامل ہیں۔

اس طویل باب میں اختر کی شاعری کا بہر طور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تعین قدر کے ذیل میں اس باب سے گریز ممکن نہیں۔ 'دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرہ'۔ مذکورہ باب میں شامل وقار صدیقی کا مضمون قومی اردو کونسل کے تحقیقی رسالے 'فکر و تحقیق' میں چھپ چکا ہے جبکہ عارف جونپوری اور راشد انور راشد کے مضامین ہندوستان کے موقر جریدے اردو دنیا میں جاں نثار صدی کے موقع پر شائع ہوئے گوشے ماخوذ ہیں۔

اس باب کے بعد 'نغمات اختر' شامل رسالہ ہے۔ اس باب میں اختر کی سیما نغمہ نگاری کا خاکہ پیش کیا ہے۔ فلم سی آئی ڈی کا نغمہ 'جاتا کہاں ہے دیوانے' اور رضیہ سلطان کا نغمہ 'اے دل ناداں' جاں نثار اختر کا ایک انٹرویو پیش کیا گیا ہے جس میں انھوں نے اپنی سیما گیت نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ اس باب کے لکھنے والوں میں جاں نثار اختر، نوشاد، خیام، عنوان چشتی شامل ہیں۔ 'گھر آنگن' کے عنوان سے ایک بہت ہی قیمتی باب قائم کیا گیا ہے جو حاصل شمارہ ہے۔ اس میں جاں نثار اختر صاحب کی آپ بیتی شامل ہے۔ 13 صفحات پر مشتمل 16 خطوط جاں نثار اختر بنام صفیہ اختر سے اختر کی زندگی کے کئی باب وا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد 44 صفحات کو محیط 19 خطوط جاں نثار اختر بنام خدیجہ اختر بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو ادب کی ایک لافانی محبت کی کہانی 'صفیہ، اختر' سیما کی ریل کی مانند نظر کے سامنے دوڑنے لگتی ہے، یہ اصل زندگی کی کہانی خطوط صفیہ بنام جاں نثار اختر ہے۔ صفیہ کے 25 خطوط کے ہر ہر حرف سے اپنے خاوند کے لیے محبت ٹپک رہی ہے۔ ایک اہم ضمنی باب انٹرویو پر مشتمل ہے جس میں جاں نثار اختر کی اولادوں سے مدیر نے انٹرویوز لیے ہیں۔ ان میں جناب جاوید اختر بمبئی، جناب شاہد اختر بمبئی، محترمہ عمیرہ اختر امریکہ شامل ہیں۔ ان انٹرویو سے اختر صاحب کی نجی زندگی کے متعلق جانکاری ملتی ہے۔ اس باب کے آخر میں اختر صاحب کی ایک مشہور نظم 'آخری لمحہ' شامل ہے جو انھوں نے اپنی بیٹی عمیرہ اختر کے لیے لکھی تھی۔

'نگار خانۂ اختر' باب میں جاں نثار اختر کی 36 غیر مطبوعہ تصاویر آرٹ پیپر پر نہایت خوبصورتی سے شائع کی گئی ہیں۔ تصاویر میں اختر صاحب کے اہل خانہ کی بھی تصاویر ضروری اطلاعات کے ساتھ شامل ہیں۔ تصاویر میں ایک جگہ مدیر لکھتے ہیں: "سلمان اختر (فرزند جاں نثار) کے شعری مجموعہ 'کوبہ کو' 1976 کا پیش لفظ جاں نثار اختر نے بڑے فخر و حمائیت کے ساتھ تحریر کیا تھا۔" 'ثبات اختر' کے تحت جاں نثار اختر کا 200 صفحاتی عمدہ انتخاب نظم و نثر شامل ہے۔ انتخاب نثر کے ذیل میں 'ہزاروں باتیں' میں جاں نثار اختر صاحب کی یادداشتوں پر مشتمل واقعات و لطائف کا مزےدار انتخاب مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ یہ لطائف اردو بلٹز بمبئی میں آج سے پچاس سال قبل شائع ہوئے تھے، جواب نایاب ہیں۔ اس کے بعد جاں نثار کا تحریر کردہ مضمون 'مجاز اور تاج بھوپالی' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی سے متصل اختر صاحب کی ایک بے حد اہم نگارش 'ہندوستانی شاعری' بھی شامل نمبر ہے۔ اس طویل مضمون میں جاں نثار اختر نے ہندوستان کی مکمل شاعری کا بے حد عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ قومی شاعری، رسومات، و دیگر پر دلی دکنی تا کیفی اعظمی تقریباً ہر شاعر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انتخاب شاعری کے تحت جاں نثار اختر کی غزلیات، منظومات، قطعات، رباعیات کا انتخاب شامل ہے جسے جناب ندا فاضلی اور وسیم فرحت نے ترتیب دیا ہے۔ 'جاں نثار اختر نمبر' کے آخری صفحے پر اعجاز صدیقی (مدیر 'شاعر' بمبئی) کا تحریر کردہ قطعہ تاریخ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

600 صفحاتی 'جاں نثار اختر نمبر' کا کاغذ دبیز اور عمدہ ہے اور قیمت 500 روپے کسی طور زیادہ نہیں ہے۔ ■

عالمی اردو نامہ

12 کتابوں کا مصنف رکشہ ڈرائیور

پاکستان کے صنعتی مرکز فیصل آباد کے بازاروں میں یوں تو سیکڑوں رکشہ ڈرائیور مل جاتے ہیں لیکن ان میں سے ایک محمد فیاض ماہی 'رکشے والا' انوکھی شخصیت کا مالک ہے۔ فیاض اپنے لوڈر رکشے پر تاجروں کا کپڑا ہی ایک سے

دوسری مارکیٹ میں منتقل نہیں کرتے بلکہ اپنے گاہکوں کو زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان سے جڑے کرداروں سے بھی ہم آہنگ کرواتے ہیں۔ 45 سالہ فیاض رکشہ ڈرائیور ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب ہیں اور اب تک 12 ناولوں سمیت ایک سو سے زائد ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے کام کی مقبولیت اس قدر زیادہ ہے کہ اب تک شائع ہونے والے کل 12 میں سے 11 ناول تین تین بار دوبارہ شائع ہوکر فروخت ہو چکے ہیں۔ فیاض بتاتے ہیں کہ وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے اور میٹرک کی 40 روپے داخلہ فیس نہ ہونے کے باعث اپنی رسمی تعلیم مڈل سے آگے نہ بڑھا سکے تاہم غربت کو کتابیں پڑھنے کے شوق پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ "میری تعلیم چھٹی تو میں نے اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے ریڑھی پر چھلیاں بیچنا شروع کیں۔ چونکہ مجھے کتابوں کا جنون کی حد تک شوق تھا اس لیے میں تھوڑے بہت پیسے جمع کرتا رہا اور ایک دن اس قابل ہوگیا کہ اپنی لائبریری بنالی اور وہاں بیٹھ کر زندگی کی حقیقتوں کو قلمبند کرنا شروع کر دیا۔"

فیاض کا پہلا ناول 'کنکر و اور کشکول' 2005 میں شائع ہوا جس میں انھوں نے طوائفوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے ساتھ ناروا معاشرتی برتاؤ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا سفر کنکر و اور کشکول سے گیلے پتھر، کاغذ کی کشتی، کانچ کا مسیحا، ناداں عشق، عین شین قاف، موم کا کھلونا، ٹھہرے پانی، میرا عشق فرشتوں جیسا، لبیک اے عشق، شیشے کا گھر اور پتھر کے لوگ تک لکھ کر ختم نہیں ہوا بلکہ 'گستاخ اکھیاں' کے عنوان سے تیرہواں ناول بھی رواں سال کے آخر تک شائع ہوجائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنی 4 بچیوں کا پیٹ پالنے اور گھر کا ماہانہ 6 ہزار روپے کرایہ ادا کرنے کے لیے رکشہ چلانا ان کی مجبوری ہے۔ یوں تو فیاض کو اپنے تمام ہی ناول بہت پسند ہیں تاہم 'عین شین قاف' جس کی اب تک لگ بھگ 33 سو کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں، کو وہ اپنی بہترین کاوش قرار دیتے ہیں۔ فیصل آباد میں قائم ایجوکیشنل یونیورسٹی میں طلبا کو فیاض ماہی کی زندگی کے بارے میں درس دیا جاتا ہے۔ تعلیمی میدان میں ان کی جدوجہد اور محنت سے بھرپور زندگی سبھی کے لیے ایک اعلیٰ مثال ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مذکورہ یونیورسٹی میں ایم فل سطح کے طالب علم ان کے کام پر مقالے لکھ رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ادبی میدان میں انھیں اعلیٰ مقام حاصل ہو اور لوگ ان کی زندگی سے سبق حاصل کریں کہ تعلیم جیسے گوہر کو اگر پانے کا ارادہ پختہ ہو تو اسکول جائے بغیر بھی یہ مشکل نہیں۔

روزنامہ خبریں دہلی، 9 اگست 2015

پاکستان میں پہلی بار ہندی میں ایم فل

علی گڑھ: پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کسی یونیورسٹی نے ہندی میں ایم فل کی ڈگری دی ہے۔ جس میں تحقیق کا موضوع آزادی کے بعد ہندی ناولوں میں عورت کا تصور تھا۔ پاکستانی فوج کی طرف سے چلائی جانے والی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز نے شاہین ظفر کو یہ ڈگری دی ہے۔ یہ یونیورسٹی اسلام آباد میں ہے۔ شاہین نے افتخار حسین عارف کی نگرانی میں تحقیق کی ہے لیکن پاکستان میں ہندی کے اچھے عالم نہ ہونے کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دو ماہرین کی اس میں مدد لی گئی۔ پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے شاہین کو ایم فل کرنے کی اجازت دی تھی۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس نئی دہلی، 2 ستمبر 2015

اردو اکادمی برطانیہ کے زیر اہتمام عالمی سیمینار اور مشاعرے کا انعقاد

لندن: اقبال مرزا مرحوم کی یاد میں ایک یادگار تقریب اردو اکادمی برطانیہ کے زیر اہتمام منعقد کی گئی۔ پروگرام کے تحت اردو اکادمی کے چیئرمین رشید حسین منظر نے اردو اکادمی کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے تعارفی کلمات سے

تقریب کا آغاز کیا۔ سامعین کی اطلاع کے لیے مشاعرہ اور سیمینار کے ساتھ مرحوم اقبال مرزا کی غزلوں پر مبنی شام غزل کی تفصیلات سے انھیں آگاہ کیا۔ اس کے بعد مشاعرے کے صدر شاہد ماہلی کو جو بطور خاص دہلی سے تشریف لائے تھے، اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ اس موقعے پر صفدر جعفری، ڈاکٹر حسن شکیل مظہری اور سوہن راہی مہمانان خصوصی کی حیثیت سے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے۔ ناظم کی حیثیت سے ڈاکٹر حسن زیدی نے فرائض انجام دیے اور مشاعرہ شروع کرتے ہوئے رخسانہ رخشی کو دعوت سخن دی۔ اس کے بعد باسط کانپوری، حامد مرزا، سارہ بتول، رح س واحد اور سوہن راہی نے اپنا کلام پیش کیا جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔ آخر میں صدر مشاعرہ نے بھرپور تقریر کی اور اقبال مرزا مرحوم سے اپنے تعلقات تفصیل سے بیان کیے اور ان کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے کے فوراً بعد سیمینار کا آغاز ہوا جس کی نظامت رشید حسن منظر نے کی۔ مرحوم اقبال مرزا کے نئے مجموعہ کلام 'تلاش ناتمام' کی تقریب رونمائی کے بعد عزالحسین، شاہانہ صادق اور رشید حسین منظر نے اپنے مضامین پڑھے۔ اس کے بعد ضیا شکیب اور رضا علی عابدی نے مختصر تقریریں کیں۔

روزنامہ ہمارا سماج دہلی، 21 اگست 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

کونسل طب یونانی کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کرے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں یونانی میڈیسن پینل کی ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تمام مہمانان کا استقبال کیا اور میٹنگ کی غرض و غایت بیان کی۔ میٹنگ میں طب یونانی کی مطبوعات کی

قومی اردو کونسل میں یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ کا منظر

اشاعت کے سلسلے میں کئی اہم تجاویز پیش کی گئیں۔ ڈائرکٹر نے کہا کہ کونسل، طب سے متعلق نصابی اور دیگر اہم طبی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے میٹنگ میں کئی اہم نکات کو زیر بحث لاتے ہوئے کہا کہ طب یونانی قدیم طریقہ علاج ہے، جو موجودہ دور میں بھی بے حد کامیاب ہے۔ ہمیں اس طریقہ علاج کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

پروفیسر زین العابدین نے اس موقع پر کہا کہ اردو کے بغیر طب یونانی کی تعلیم حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس کے لیے کونسل کو چاہیے کہ وہ تمام یونانی کالجوں میں اردو تعلیم کا ایک مرکز قائم کرے تاکہ ایسے اردو داں طلبہ جو طب یونانی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اردو زبان سے واقف ہوسکیں۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس تجویز کی ستائش کی اور کہا کہ جنوبی ہند کے یونانی اداروں میں ایسے مراکز کی سخت ضرورت ہے اور اس تجویز پر آئندہ میٹنگ میں غور و خوض کیا جائے گا۔ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب شمس اقبال نے پرانے اطبا کی شخصیت و خدمات پر کتابیں شائع کرنے کی بھی سفارش کی تاکہ نئی نسل ان کے کارناموں سے واقف ہو سکے۔

اس موقع پر ڈاکٹر منور حسین نے طب یونانی کے شعبے میں کونسل کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کونسل ایک باوقار ادارہ ہے، جو طب یونانی کی سرپرستی کر رہا ہے اور اس کو مزید ترقی دینے کی سمت میں کوشاں ہے۔

میٹنگ میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن، ڈاکٹر منور حسین، ڈاکٹر ایس کے اے وحید، ڈاکٹر سیما اکبر، پروفیسر زین العابدین، جناب حامد احمد، جناب محمد علی مرزا، جناب شبیر احمد، کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ اور پروجیکٹ اسسٹنٹ شاہد اختر وغیرہ موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2015

بچوں کے ذہن میں نئی دنیا آباد ہونی چاہیے: رتن سنگھ

قومی اردو کونسل میں 'بچوں کا ادب' پر سہ روزہ ورکشاپ

نئی دہلی: آج جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں وہ بچوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ایک ایسی دنیا تخلیق کی جانی چاہیے جو تصوراتی دنیا سے زیادہ حسین ہو۔ ہر علاقے کی لوک کہانیاں جمع کی جائیں تو اس سے بچوں کے ذہن میں ایک نئی دنیا آباد ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار بزرگ افسانہ نگار رتن سنگھ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام صدر دفتر میں منعقدہ 'بچوں کا ادب' سے متعلق ذکر کیا اور کہا کہ بچوں کے ادیبوں کو بچوں کی ذہنی سطح اور ان کی عمر کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ بچوں کے معروف ادیب غلام حیدر نے کہا کہ صرف کہانیوں پر نہیں نان فکشن پر بھی توجہ ضروری ہے۔ انیس اعظمی نے اس موقعے پر اپنے تجربات شیئر کرتے ہوئے کہا کہ 'بچہ' کبھی 'بچہ' نہیں ہوتا۔ بچوں میں حسیت کی کمی نہیں ہے۔ ان کے اندر بہت تخلیقی قوت ہے۔ انھیں موقع دیا جائے تو وہ اچھی تخلیقات پیش کر سکتے ہیں۔ فاروقی، غلام حیدر، ڈاکٹر اقبال برکی، انیس اعظمی، قاسم خورشید، محسن خان، وکیل نجیب اور فراغ روہوی نے اپنی تخلیقات سنائیں۔ بچوں کی نفسیات اور لفظیات کے حوالے سے ان متون کو پرکھا گیا۔ زیادہ تر شرکا نے کہا کہ بچوں کے ادب کے تعلق سے ایک اجتماعی اور منظم جدوجہد قومی اردو کونسل کی ایک نئی اور مثبت پہل ہے۔ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ قومی اردو

کونسل کے صدر دفتر میں 'بچوں کا ادب' کے سہ روزہ ورکشاپ کا منظر

سہ روزہ ورکشاپ کے افتتاحی سیشن میں کیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اس ورکشاپ کی معنویت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ بچوں کے لیے ادب لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے سینئر لکھنے والے بچوں کا ادب لکھنا کسر شان سمجھتے ہیں جبکہ اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے لیے 'بچوں کا ادب' تخلیق کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ ہمیں بدلتے ہوئے ماحول میں سائنس و ٹکنالوجی اور دیگر موضوعات پر مبنی بچوں کا ادب پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ذکیہ مشہدی نے کہا کہ بچوں کے لیے ایسا ادب لکھا جانا چاہیے جس میں انبساطی عناصر ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں السٹریشن کے علاوہ رنگین صفحات اور اختصار کو ملحوظ رکھا جائے۔ انھوں نے بچوں کی عمر کے تعین کا بھی

ورکشاپ کے دوسرے اور تیسرے دن کے سیشن میں شرکا نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اردو زبان میں بچوں کے لیے اوریجنل تخلیقات کی بے حد کمی ہے۔ بچوں کے متعلق زیادہ تر کتابیں ترجمہ کی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے ہم اپنی ثقافتی روایات اور مظاہر کی بہتر طور پر ترسیل میں ناکام رہتے ہیں۔ تین روزہ ورکشاپ میں 'بچوں کا ادب' تخلیق کرنے کے لیے نئی سمتوں کا تعین کیا گیا اور ایک مربوط لائحہ عمل تیار کرتے ہوئے اس بات پر زیادہ تر شرکا نے زور دیا کہ ہمیں معاصر زبانوں میں لکھے گئے بچوں کے ادب کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیے اور عصر حاضر کے چیلنجز کا سامنا کرتے ہوئے بچوں کا ادب تخلیق کرنا چاہیے۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے چیلنجز ہیں، جن میں ایک بڑا چیلنج بچوں کی معصومیت کا تحفظ ہے۔

سہ روزہ ورکشاپ میں رتن سنگھ، ذکیہ مشہدی، شمس الاسلام

کونسل بچوں سے متعلق اوریجنل تخلیقات کی اشاعت کو اولیت دے گی اور کوشش ہوگی کہ اس سال کے اواخر تک ورکشاپ میں پیش کی گئی اوریجنل تخلیقات کتابی شکل میں خوبصورت السٹریشن کے ساتھ منظر عام پر لائی جائیں تاکہ عالمی منظر نامے پر بچوں کے ادب کے تعلق سے اردو زبان کی اپنی ایک الگ شناخت قائم ہو۔

قومی اردو کونسل کے اس ورکشاپ میں جناب رتن سنگھ، محترمہ ذکیہ مشہدی، ڈاکٹر ایس آئی فاروقی، جناب غلام حیدر، جناب انیس اعظمی، جناب قاسم خورشید، ڈاکٹر اقبال برکی، جناب وکیل نجیب، جناب محسن خان، جناب فراغ روہوی، ڈاکٹر فوزیہ چودھری، السٹریٹر شاہنواز اور کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، جناب محمد معصوم، محترمہ شہناز اختر اور ڈاکٹر شاہد اختر بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 تا 16 ستمبر 2015

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام قومی کونسل کے نو منتخب ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ساتھ ایک ملاقات

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو کا ایک بڑا علمی سرکاری ادارہ ہے۔ اس کے ذریعے اردو کو مزید فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اس ادارے کی کوشش یہ ہونی چاہئی کہ ادب اور زبان کو فروغ ملے۔ ان خیالات کا اظہار غالب انسٹی ٹیوٹ میں قومی کونسل کے نو منتخب ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر شاہد مہدی نے کیا۔ پروفیسر شاہد مہدی نے کہا کہ اسکولوں میں اردو کو کیسے فروغ دیا جائے اور اس کے تعلیمی معیار کو کیسے بہتر بنایا جائے، اس کے لیے ایک اسٹریٹیجک سوچ کے ساتھ زبان کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ 'پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ساتھ ایک ملاقات' میں دہلی کی تینوں یونیورسٹیوں کے اردو و فارسی اساتذہ کے علاوہ تمام اردو اداروں کے سربراہوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس خاص جلسے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیے۔ قبل ازیں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے اپنے افتتاحی کلمات میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو دنیا میں ایک بڑے نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ہمیں پوری امید ہے کہ وہ نئے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی اہم رول ادا کریں گے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ ارتضیٰ کریم دلچسپی کے ساتھ کام کریں گے اور اردو کی رگوں میں تازہ خون دوڑانے کی کوشش کریں گے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ یہ ہمارا اخلاقی فرض بھی بنتا ہے کہ ہم نئے ڈائرکٹر کی ہمت افزائی کریں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاد پروفیسر معین الدین جینابڑے نے پروفیسر ارتضیٰ سے اپنی پرانی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ارتضیٰ کریم کا ایک جملہ ہمیشہ یاد آتا ہے، جب انھوں نے مجھ سے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ ''ادارے ارادے سے چلتے ہیں'' اور یہ ارادے کے پکے ہیں، اس لیے ہمیں امید ہے کہ یہ اس ادارے کو بلندیوں تک لے جائیں گے۔ اس موقعے پر دہلی اردو اکادمی کے نئے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ این سی ای آر ٹی کے طرز پر قومی کونسل کے کتابوں کی قیمت بھی کم ہونی چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوسکیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر عراق رضا زیدی نے کہا کہ فارسی زبان اردو زبان کی پاسدار ہے اس لیے کونسل کے سربراہ کو چاہیے کہ وہ اردو والوں کے ساتھ ساتھ فارسی کے اسکالرز کو بھی ادارے سے وابستہ کریں۔ دہلی یونیورسٹی شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ اردو زبان اسی وقت ترقی کے منازل طے کرے گی، جب ہم اس کو فارسی سے بھی جوڑ کر دیکھیں۔ ہفتہ وار 'چوتھی دنیا' کی ایڈیٹر ڈاکٹر وسیم راشد نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کو نئے منصب کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کئی اہم مسائل کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس موقعے پر کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر قدوس جاوید، چندر بھان خیال، این آئی او ایس ایڈمنسٹریٹیو آفیسر ڈاکٹر شعیب رضا خاں، ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف، انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری اطہر فاروقی، گلشن نگار پیغام آفاقی وغیرہ نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی توجہ اردو زبان کے فروغ کی طرف دلائی۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کو ان کے اس نئے منصب کی مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اردو دنیا کو پروفیسر ارتضیٰ کریم سے کافی توقعات وابستہ ہیں اور ہمیں پوری امید ہے کہ یہ ہماری توقعات پر پورے اتریں گے۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں صحافی، ریسرچ اسکالرز، یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے علاوہ معتبر افراد موجود تھے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر، دہلی، 22 اگست 2015

کونسل کے ڈائرکٹر کا روزنامہ راشٹریہ سہارا کے دفتر کا دورہ

نوئیڈا: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے روزنامہ راشٹریہ سہارا کے مرکزی دفتر نوئیڈا میں صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ہمیں جو کرنا چاہیے تھا اس میں ہم پیچھے رہے ہیں اس لیے اہل اردو کو اپنا احتساب کرنا چاہیے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اہل اردو کے گھروں میں اردو اخبارات کی رسائی نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج اہل اردو انگریزی اخبار پڑھنا اپنی شان سمجھتے ہیں اور اردو کا اخبار پڑھنا ان کے نزدیک معیوب

ہے۔ انھوں نے کہا کہ صورت حال کو بدلنے کے لیے اردو والوں کو سماج کے ایک ایک گھر میں اردو کو پہنچانے کی مہم چلانی ہوگی تبھی ہم اردو کو اس کا جائز مقام دے سکیں گے۔ اس موقعے پر سہارا میڈیا کے چیف ایڈمنسٹریٹر راجیش کمار نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو اور ہندی کا درد کم و بیش یکساں ہے، یہ دونوں زبانیں توجہ کی مستحق ہیں، انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی اسی وقت ہوگی جب اسے اقتصادیات اور روزگار سے جوڑا جائے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا و عالمی سے نیوز چینل کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے گلدستہ پیش کرکے پروفیسر ارتضیٰ کریم کا استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل نے اردو کے فروغ کے لیے نمایاں کام کیا ہے اور اس کی ایک روشن تاریخ ہے اور اب ہم یہ امید کرتے ہیں کہ اس ادارے کے فعال و مستعد ڈائرکٹر فروغ اردو کے مفید منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیز گامی کا ثبوت دیں گے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 3 ستمبر 2015

بنگلور میں سہ لسانی لغت کے اجرا کا منظر

بنگلور میں سہ لسانی لغت کا اجرا

بنگلور: زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، بزیر انتظام کرناٹک اردو اکادمی، بنگلورو، بمقام نیتا ہال، کنڑا بھون، جے سی روڈ میں سہ لسانی لغت کا اجرا اور پروفیسر ارتضی کریم ڈائرکٹر این سی پی یو ایل کی تہنیت بدست عزت مآب ڈاکٹر قمرالاسلام صاحب عمل میں آئی۔ ڈاکٹر رگھوتم راؤ ویائی کو تہنیت پیش کی گئی۔ ان کی کوششوں کو سراہا گیا۔ اردو کنڑا اور انگریزی زبان میں یہ لغت تقریباً دس سال کی ان تھک محنت کا صلہ ہے۔ ڈاکٹر وہاب عندلیب، سابق صدر کرناٹک اردو اکادمی و کرناٹک اردو اکادمی کے سابق رجسٹرار خلیل احمد نے اس لغت کا مختصراً جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر ارتضی کریم نے جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے بیان میں اردو زبان کے فروغ کی ضرورت، اہمیت اور آج کے شمالی ہند کے مقابل جنوبی ہند کے اداروں کی تعریف کی۔ زبان اردو کے بولنے والوں میں آپسی تعلق کے فقدان کو انھوں نے اس طرح سمجھایا کہ لفظ اردو کے حروف جس طرح ایک دوسرے سے ملتے نہیں اسی طرح اردو زبان کے بولنے والوں میں دوری پائی جاتی ہے۔ مگر اردو کے فروغ کے لیے ہمیں مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر انھوں نے چیئرپرسن ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی کاوشوں کو اور اکادمی کے کاموں کی ستائش کی۔ ڈاکٹر قمرالاسلام نے کرناٹک اردو اکادمی کو ہندوستان کی ایک فعال اکادمی بتایا اور اقلیتی شعبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آج ہندوستان میں کرناٹک کا اقلیتی محکمہ پہلے مقام پر ہے۔ اخیر میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے مہمانوں کی تعریف وتوصیف کی اور NCPUL کے کام کاج پر اکادمی کی جانب سے مبارکباد دیتے ہوئے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ ناطق علی پوری نے پروقار انداز میں پروگرام کی نظامت کی۔ روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 19 اگست 2015

کونسل کے ذریعے چلائے جارہے کورسز کو سرکاری سطح پر منظوری کی وکالت

علی گڑھ: ملت بیداری مہم کمیٹی کے سکریٹری اور معروف تعلیمی وسماجی کارکن ڈاکٹر جسیم محمد نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی ایرانی کو تحریر کردہ مکتوب میں ان کی توجہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا کہ یکم اپریل 1996 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تشکیل ملک میں اردو زبان کے فروغ اور اسے جدید تعلیم جیسے سائنس و ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی غرض سے کی گئی تھی۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے مرکزی وزیر کو لکھا ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنی ذمے داریوں کو نہایت احسن طریقے سے انجام دے رہی ہے اور اردو داں طبقہ کے لیے ڈپلوما ان اردو لینگویج، سی اے بی اے ایم ڈی ٹی پی، ڈپلوما ان کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائننگ، ڈپلوما ان فنکشنل عربک اور سرٹیفکیٹ کورس ان عربک لینگویج جیسے کورسیز بھی چلا رہی ہے۔ جو اردو داں طبقے کے علاوہ حاشیے پر کھڑے طبقات کے لیے نہایت سودمند ہیں اور انھیں تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کی توجہ مبذول کراتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ طلبا و طالبات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مذکورہ کورسیز کررہے ہیں مگر ان کا مستقبل تاریک ہے کیونکہ ان کورسیز کو اعلی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کے لیے منظوری حاصل نہیں ہے۔ ڈاکٹر جسیم نے مرکزی وزیر سے درخواست کی ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے چلائے جارہے کورسیز کو ان کی وزارت کے تحت آنے والے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے منظوری دلائی جائے تاکہ مذکورہ کورسیز کے طلبا و طالبات ان کورسیز کے بعد اعلی اور سرکاری ملازمتوں میں ان سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور ڈگریوں کا استعمال کرنے کے مجاز ہوں اور ان کا مستقبل روشن ہوسکے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر، 1 ستمبر 2015

قومی سطح پر تمل ناڈو کے تعلیمی اداروں کی علمی ادبی اور اردو خدمات

چنئی: شعبہ اردو دی نیو کالج چنئی میں 11 اور 12 اگست 2015 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے قومی سطح پر تمل ناڈو کے تعلیمی اداروں کی علمی ادبی اور اردو خدمات کے زیر عنوان ایک دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ ڈاکٹر محمد اظہر حیات، چیئرمین پی اوایس ناگپور یونیورسٹی ناگپور نے بطور مہمان خصوصی

سامعین سے خطاب کرتے ہوئے چنئی میں اپنی آمد کو پر مسرت بتایا اور کہا کہ میں نے ہندوستان بھر کے کالجوں کا دورہ کیا ہے لیکن نیو کالج چنئی میں شعبہ اردو کی صورت حال دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ یہاں اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد زیادہ ہے اور ان میں دلچسپی، ذوق و شوق سے پتہ چلا کہ یہاں اردو زبان کا مستقبل روشن ہے۔ جناب الحاج اے محمد اشرف صاحب معتمد اعزازی نیو کالج نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ نیو کالج میں ریاست تمل ناڈو کی علمی ادبی اور اردو خدمات کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ پروفیسر سجاد حسین صدر شعبہ اردو وفارسی وعربی مدراس یونیورسٹی نے اپنے کلیدی خطبے میں تمل ناڈو میں علمی ادبی اور اردو خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ جناب نذر محمد صاحب، سکریٹری مظہر العلوم آمبور، جناب الحاج امان اللہ شاہ صاحب، چیئرمین اسٹیٹ مینجمنٹ کمیٹی، چنئی بطور مہمان اعزازی شریک تھے۔ جناب نذر محمد صاحب نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ایک عالم گیر زبان ہے لیکن اردو زبان پر ریاست تمل ناڈو میں اسکولی سطح پر روک لگی ہوئی ہے۔ اس کی بحالی کے لیے اردو برادری کی ذمے داری ہے کہ وہ اس مسئلے پر غور وفکر کریں اور اردو کے فروغ کے لیے کوشش کریں۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سید مظفرالدین پروفیسر شعبہ اردو نیو کالج نے کی اور پروفیسر خیات احمد شعبہ اردو نیو کالج نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ دو روزہ سیمینار کی چھ نشستوں کے تحت کئی اہم مقالے پڑھے گئے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر امان اللہ ایم بی، شعبہ عربک، پرشین اینڈ اردو، یونیورسٹی آف مدراس، مرینہ کیمپس چنئی، 24 اگست 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

وزیراعظم کی تین کتابوں کا اجرا

نئی دہلی: وزیراعظم نریندر مودی کی تین کتابوں کا دس اگست کو یہاں ایک تقریب میں اجرا کیا گیا۔ ان میں ان کی نظموں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی

کے صدر امت شاہ نے مسٹر مودی کی انگریزی میں لکھی گئی دو کتابوں اور ہندی میں لکھی ایک کتاب کا اجرا کیا۔ تقریب کی صدارت وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ نے کی۔ یہ کتابیں پربھات پرکاشن نے شائع کی ہیں۔ سوشل ہارمونی (سماجی خیر سگالی) عنوان کی کتاب میں مسٹر مودی کے انگریزی میں لکھے گئے مضامین کا ترجمہ ہے جبکہ جیوتی پونج میں آر ایس ایس کے پرچارکوں کی یادیں ہیں جو انگریزی میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان کی تیسری کتاب 'ساکشی بھاؤ' ہندی میں ہے۔ اس میں ان کی 16 طویل نظمیں ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 10 اگست 2015

مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کی جنرل باڈی میٹنگ

نئی دہلی: اقلیتی امور کی مرکزی وزیر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ

کی صدارت میں مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی جنرل باڈی نے ری اسٹرکچرنگ کو اپنی منظوری دے دی ہے۔ فاؤنڈیشن کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہے جب اس کی کارکردگی کو مزید فعال بنانے کے لیے اس طرح کے اقدام کیے جارہے ہیں۔ میٹنگ میں اقلیتی امور کی مرکزی وزیر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے بنیادی مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں کی جارہی ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی ری اسٹرکچرنگ کے بعد تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کے مختلف تعلیمی چیلنجوں پر کام کیا جائے گا جس کے نتیجے واضح طور پر نظر آئیں گے او ریسرچ، ڈاکومینٹیشن اور ایڈووکیسی پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ واضح رہے کہ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن ایک خودمختار ادارے کے طور پر 1989 میں قائم کیا گیا تھا لیکن انتظامی، مالی اور افراد کی کمی کی وجہ سے فاؤنڈیشن اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں مؤثر کردار ادا نہیں کرسکا۔ 2006 میں جب وزارت اقلیتی امور کا قیام ہوا تب فاؤنڈیشن کو ایک خودمختار ادارے کے طور پر اس وزارت کے تحت لایا گیا۔ نریندر مودی کی قیادت والی سرکار میں وزارت برائے اقلیتی امور نے فاؤنڈیشن کے طریقہ کار کا جائزہ لیا اور اس سال کے آغاز میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز (ٹی آئی ایس ایس) کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی تاکہ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی ری اسٹرکچرنگ کے بعد تعلیمی طور پر اسے پسماندہ اقلیتوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے ایک پیشہ ورانہ انداز میں موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ TISS نے 9 جولائی 2015 کو وزارت کو اپنی رپورٹ پیش کی تھی۔

روزنامہ 'جدید خبر' 20 اگست 2015

مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کو سات منزلہ عمارت کا تحفہ

نئی دہلی: مولانا آزاد کے نام پر مرکزی حکومت نے اقلیتی وزارت کی آزاد تنظیم مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے لیے ملٹی اسٹوری بلڈنگ تحفہ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ چیلمس فورڈ روڈ پر واقع 1.3 ایکڑ اراضی پر مجوزہ 7 منزلہ بلڈنگ میں نصف حصہ مولانا آزاد فاؤنڈیشن کو دیا جائے گا۔ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن (ایم اے ای ایف) کو نصف حصہ دینے کا یہ فیصلہ 16 جولائی کو وزارت برائے سماجی انصاف، وزارت برائے اقلیتی امور اور نیشنل بلڈنگ کنسٹرکشن کارپوریشن کے درمیان ہوئی اعلیٰ سطح کی میٹنگ کے درمیان ہوا ہے، جس میں چیلمس فورڈ روڈ پر 145 کروڑ روپے کے تخمینی بجٹ سے ایک خوبصورت 7 منزلہ عمارت تعمیر کرنا طے پایا ہے۔ ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے لیے ضروری کلیئرنس لینے کی کارروائی بھی شروع کردی گئی ہے اور عمارت کا نقشہ بھی تیار ہوگیا ہے۔ مجوزہ عمارت کا زیرتعمیر علاقہ 245000 اسکوائر فٹ ہے۔ اس عمارت میں گراؤنڈ فلور کے علاوہ 7 منزلیں ہوں گی، جس میں کارپوریٹ ہاؤس طرز کی تمام سہولیات موجود ہوں گی۔ اقلیتی امور کی وزیر نجمہ ہپت اللہ نے انقلاب کے ساتھ ایک خصوصی گفتگو میں بتایا کہ چیلمس فورڈ روڈ پر ایک تاریخی عمارت ہے جو شاید 1930 کے آس پاس انگریزوں نے 'لیڈی ہارڈنگ سرائے' کے طور پر تعمیر کرائی تھی، اس عمارت کا کیمپس تقریباً 1/3 1 ایکڑ اراضی پر مشتمل ہے اور اس کے درمیان ایک بہت ہی پرانی عمارت ہے جس میں مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کا دفتر تھا۔ ایک سال قبل تک یہ پورا کیمپس وزارت برائے سماجی انصاف (منسٹری آف سوشل جسٹس اینڈ امپاورمنٹ) کے قبضے میں تھا مگر وزارت برائے اقلیتی امور اور سماجی انصاف کی وزارت کے درمیان ہوئی متعدد میٹنگ کے بعد اس بلڈنگ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا اور آدھا حصہ سماجی انصاف کی وزارت کے پاس رہ گیا۔ معاہدہ میں عمارت کا جو حصہ مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے حق میں آیا اس کے اردگرد صورت حال اتنی خراب تھی کہ صفائی، ستھرائی اور مرمت کے باوجود پوری عمارت کباڑ خانہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے اقلیتی امور کی وزارت اور سماجی انصاف کی وزارت نے مل کر ایک 7 منزلہ عمارت بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس میں آدھا حصہ ایم اے ای ایف کو دیا جائے گا۔ جبکہ آدھا حصہ سماجی انصاف کے پاس رہ جائے گا۔ یہ پوری بلڈنگ نیشنل بلڈنگ کنسٹرکشن کارپوریشن تعمیر کرے گی، جو کہ خود ایک سرکاری ادارہ ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ جب مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی

تشکیل ہوئی تب اس کے کئی مقاصد تھے۔ ایم اے ای ایف کی تشکیل کے 14 اہداف میں سے اب تک صرف 2 ہدف (اقلیتی طالبات کو اسکالرشپ اور اقلیتی تعلیمی اداروں کو مالی مدد) ہی پورے ہو رہے ہیں جبکہ باقی اہداف پر کام نہیں ہو پا رہا ہے یعنی فاؤنڈیشن کے دیگر مقاصد میں اسکولوں کے قیام، قومی تعلیمی پالیسی کے نفاذ پر تعاون کی فراہمی، کاؤنسلنگ سینٹرز کا قیام، تعلیمی بیداری چلانا، لائبریریوں کا قیام اور تعلیمی مسائل سے اقلیتی طبقات کو آگاہ رکھنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس پر کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہو پا رہی ہے۔ اس کی وجہ انفراسٹرکچر کی کمی ہے اس لیے ہم نے فاؤنڈیشن کو پوری طرح ہائی ٹیک بنانے کا فیصلہ کیا ہے، جس پر کام جلد شروع ہو جائے گا۔''

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 10 اگست 2015

پٹنہ میں پہلے مدرسہ اسکل ڈیولپمنٹ سینٹر کا افتتاح

پٹنہ: مولانا آزاد نیشنل اکادمی فار اسکلس (MANAS) نے اقلیتوں کے روایتی تعلیمی اداروں جیسے مدارس، مکاتب، وغیرہ کو اقلیتی فرقوں کے لیے مہارتوں کی تربیت کے ساتھ جوڑنے کی اسکیم کا آغاز کیا ہے۔ اس موقعے پر وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے سلطان گنج، پٹنہ اور ریموٹ ویڈیو لنک کے ذریعے مدرسہ انجمن اسلامیہ رفاہ المسلمین، موتیہاری میں مہارت کی تربیت کے مراکز کا افتتاح کیا۔ ان مراکز کا افتتاح وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ اور وزیر زراعت رادھا موہن سنگھ نے مشترکہ طور پر کیا۔ اس موقعے پر مسز نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ مہارتوں کی تربیت کے مراکز کا آغاز ملک کے طول و عرض میں اقلیتی فرقوں کو رفتار، پیمانے اور معیارات کی مہارتوں سے لیس کرنے کے مقصد کے حصول میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسکیم بھی فریقین یعنی خصوصی تربیت دینے والوں، سرکردہ صنعتی اداروں، کمیونٹی کے رہنماؤں اور تربیت پانے والوں کو ایک مقام پر لانے کا کام کرے گی۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ ہندوستان کو دنیا کا اسکل کیپٹل بنانے کے وزیر اعظم نریندر مودی کے خواب کے مطابق اقلیتی فرقوں کو خصوصی توجہ کی ضرورت ہے تاکہ انھیں ضروریات کے مطابق ادارہ جاتی انتظامات کے وسیلے سے مارکیٹ کے مطالبوں کے مطابق اعلیٰ درجے کی مہارتوں کی تربیت فراہم کی جا سکے۔ MANAS اس سلسلے میں سہولیات فراہم کرنے کا کام کرے گا جس میں اقلیتوں کے روایتی تعلیمی اداروں جیسے مدارس/ مکاتب/ خانقاہوں وغیرہ کو شامل کیا جا سکے گا جن کے پاس خالی جگہیں/ عمارات موجود ہیں تاکہ اس پروجیکٹ پر عمل درآمد کرانے والی ایجنسیوں (PIAs) کے ساتھ تعاون کیا جا سکے جو تربیت دینے کی اعلیٰ درجے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ MANAS سی سی ٹی وی کے لائیو کوریج اور جی پی ایس کے بائیومیٹرک آلات کے ذریعے پورے ترتیبی پروگرام کی نگرانی کرکے تربیت کے اعلیٰ معیار کو یقینی بنائے گا۔ PIA اس بات کو یقینی بنائے گی کہ کورس کا نصاب/ سیشن پلان/ کورس کے مشمولات اپنے اپنے سیکٹر کی اسکل کونسل (SSC) یا NCVT سے مطابقت رکھتے ہوں۔ MANAS نے اس پروجیکٹ کے لیے 3.6 کروڑ روپے کا بجٹ مختص کیا ہے جس سے MANAS اپنی PIAs کے ذریعے تین مدرسوں میں مہارتوں کی تربیت کے مراکز کے پائلٹ پروجیکٹ تیار کر سکے اور اقلیتی فرقوں کے لیے مہارتوں کے فروغ اور اضافے کے پروگرام چلا سکے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 ستمبر 2015

ظفر سریش والا کا مانو کے عہدے داران کے ساتھ تبادلۂ خیال

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، اردو زبان اور اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ کی پابند ہے۔ ساتھ ہی ہمیں

اپنے طلبہ کو انگریزی میں مہارت کے حصول پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ روزگار کے حصول کے معاملے میں وہ دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو یونیورسٹی کے چانسلر جناب ظفر سریش والا نے یونیورسٹی کیمپس میں مختلف فیکلٹی کے ڈین اور مراکز کے ڈائرکٹرس کے ساتھ تبادلہ خیال کے دوران کیا۔ پروفیسر خواجہ محمد شاہد، وائس چانسلر انچارج اور پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار انچارج اس موقعے پر موجود تھے۔ انھوں نے سبکدوش وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں کے بشمول تمام سابق وائس چانسلرز کی خدمات کا اعتراف کیا جنھوں نے اس نوخیز یونیورسٹی کے آغاز، فروغ اور استحکام میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ چانسلر نے کہا کہ خود احتسابی، آگے بڑھتے رہنے کا ایک بہترین زینہ ہے۔ جناب سریش والا نے بمبئی اسٹاک ایکسچینج (BSE)، UFO اور دیگر اداروں کے ساتھ طے پائی یادداشت مفاہمت پر عمل آوری کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ پیشہ ورانہ کورسز کے طلبہ جب تک مارکیٹ کا مشاہدہ نہ کریں انھیں وہاں کے تقاضوں کا اندازہ نہیں ہوگا۔ ممبئی میں حال ہی میں منعقدہ کانفرنس 'تعلیم کی طاقت' کا حوالہ دیتے ہوئے جناب سریش والا نے کہا کہ اس کے ذریعے مہاراشٹر کی اقلیتوں اور حکومت کے درمیان ایک رابطے کا آغاز ہوا ہے۔ چیف منسٹر مہاراشٹر مسٹر دیویندر فڈنویس نے کانفرنس میں اردو اسکولس کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ جناب ظفر سریش والا کے مطابق 'تعلیم کی طاقت' کے موضوع پر ہندوستان کے دیگر شہروں میں بھی سیمینار ہو چکے ہیں بہت جلد حیدرآباد، بنارس اور پٹنہ میں اس طرح کے سیمینار منعقد ہوں گے تاکہ اقلیتوں کو تعلیم کے ذریعے طاقتور بنایا جا سکے۔ چانسلر نے اردو یونیورسٹی کے اضافی فنڈس کی اجرائی کے لیے مرکزی حکومت سے نمائندگی کا بھی تیقن دیا تاکہ اورنگ آباد، بیدر، نوح اور دیگر مقامات پر پی ایڈ کالجس کی عمارتوں کی تعمیر ہو سکے۔ وائس چانسلر انچارج پروفیسر خواجہ محمد شاہد نے چانسلر کو یونیورسٹی میں داخلوں کے عمل کی تفصیلات سے واقف کروایا اور فاصلاتی تعلیم کے بعض کورسس کی مسلمہ حیثیت کی بحالی کے لیے یونیورسٹی کی کوششوں پر بھی روشنی ڈالی۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ نے یو جی سی اضافی گرانٹ کے حصول میں چانسلر سے رہنمائی کی درخواست کی۔

روزنامہ 'سالار'، حیدرآباد، 8 اگست 2015

مولانا آزاد لائبریری سرکار کے 'اے' گریڈ میں شامل

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے ذریعے خریدے گئے الیکٹرانک ڈاٹا بیس کے استعمال پر ایک پرزنٹیشن اور ترتیبی پروگرام منعقد کیا گیا۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر امجد علی نے بتایا کہ یونیورسٹی نے ایچ انڈیکس میں ہائر ریٹ حصول پر بہترین مظاہرہ کرکے حکومت ہند کے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی شعبہ میں 'اے' گریڈ والے اداروں میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی پرزنٹیشن کے تحت یونیورسٹی کو پروموشن آف یونیورسٹی ریسرچ اینڈ سائنٹفک ایکسیلنس (پی یو آر ایس ای) کے تحت خصوصی مدد حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر امجد علی نے کہا کہ میقات 2009-2010 میں یونیورسٹی کو ایچ انڈیکس کے 'سی' زمرے والے اداروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ دور حاضر میں ایچ انڈیکس میں اے ایم یو 87 ویں مقام پر ہے جو کہ 2009-2010 میں

تیسواں تھا۔ ڈاکٹر امجد علی نے حال ہی میں خریدے گئے عالمی سطح کے ڈاٹا بیس جیسے پروکویسٹ، ایبسکو اور اسکوپس کی منفعت بخش رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ بھی اپنی افادیت میں اضافہ کا مظاہرہ کررہی ہیں۔ رپورٹ پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر امجد علی نے کہا کہ یونیورسٹی میں الیکٹرانک وسائل سے سیکھنے کی ایک نئی تہذیب کا آغاز ہورہا ہے۔ میسرس ایلسی ویئر پرائیویٹ لمیٹڈ کے سولیوشن کنسلٹنٹ منیش انیال نے اسکوپس کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اسکوپس پیئر ریویو لٹریچر کے ایبسٹر یکٹ اور سائیٹیشن کا سب سے بڑا ڈاٹا بیس ہے، جن میں سائنٹفک جرنلس، کتابوں اور کانفرنس کی کارروائی شامل ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس میں ہر سال تقریباً دو ملین ریکارڈ جوڑے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کو ٹائمس ہائر ایجوکیشنل نے ہندوستان میں اول مقام دیا ہے۔ یہ یونیورسٹی سے صرف 38 ڈاکومینٹس آگے ہے اور اسی ادارہ نے اے ایم یو کو دوسرے مقام پر رکھا ہے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 1 ستمبر 2015

شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام بین الاقوامی کانفرنس

نئی دہلی: شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام پرسو انڈیکا کی تیسری دو روزہ کانفرنس بعنوان 'عہد سلطنت اور ابتدائی مغل دور' کا انعقاد کانفرنس ہال میں کیا گیا۔ پروگرام میں ملک اور بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں

سوربن یونیورسٹی بون یونیورسٹی، شمالی کیرولینا یونیورسٹی امریکہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اسکالرس نے شرکت کی۔ افتتاحی پروگرام میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر دنیش سنگھ، وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے کہا کہ ایران و ہند کے قدیم تعلقات رہے ہیں اور ہندوستان کے مختلف مذہبی، دینی، علمی اور سنسکرت کے اہم قلمی نسخوں کو فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے ایران و ہند کے تجارتی تعلقات کا تفصیلی ذکر کیا۔ صدر شعبۂ فارسی، پروفیسر چندر شیکھر کو ایک متحرک شخصیت قرار دیتے ہوئے ان کی اس کاوش کو سراہا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر چندر شیکھر نے 'پرسو انڈیکا' اس تیسری کانفرنس پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئے نسخوں کی تفصیل پیش کی اور پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی تقریب میں شمالی کیرولینا یونیورسٹی (امریکا) کے پروفیسر کارل ارنسٹ، سوربن کے پروفیسر فبیر یزیو، بون یونیورسٹی کی پروفیسر ایوا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پہلا اجلاس قدرتی اور سائنس کے موضوع پر ہوا جس میں تین تحقیقی مقالات پیش کیے گئے۔ کازیو-کا کی نے سائنس کی آواز سے تعلق رکھنے والا ہندوستانی نسخہ 'سیاس وارد ویا'، سید محمد رضاء اللہ انصاری اور ایوا آرتھمن نے ترجمہ 'باراہی' کے تعلق سے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس میں میڈیکل تعلیم کے موضوع پر تین مقالے پیش کیے گئے۔ فبیر یزیو نے شہاب الدین ناگوری اور آرزی دخت نے طب سکندر شاہی پر اپنے مقالے پیش کیے جبکہ سونیا نے قدیم راہسیہ اور لذت النساء جیسی کتابوں کے تراجم کے تعلق سے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔

واضح رہے کہ پرسو-انڈیکا قدیم ہندوستانی کتابوں کے تعلق سے کام کرنے والی اہم تنظیم ہے۔ اس پروگرام کے انعقاد میں جرمن ریسرچ فاؤنڈیشن (ڈی ایف جی)، اے این آر، سوربن یونیورسٹی (پیرس)، بون یونیورسٹی (جرمنی) کا مالی تعاون شامل رہا۔ پروگرام میں پروفیسر اقتدار حسین صدیقی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر یونس جعفری، پروفیسر شرما، پروفیسر بھاردواج، پروفیسر علیم اشرف خان، پروفیسر راجندر کمار، ڈاکٹر مہتاب جہاں، ڈاکٹر علی اکبر شاہ کے علاوہ کثیر تعداد میں اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 4 ستمبر 2015

جامعہ میں 9 روزہ 'قرآن مجید اور اسلامی آرٹ و کرافٹ' نمائش اختتام پذیر

نئی دہلی: ایران کلچر ہاؤس، نور مائکرو فلم سینٹر اور پریم چند آرکائیوز اینڈ لٹریری سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے جامعہ کے ایم ایف حسین آرٹ گیلری میں 'قرآن مجید اور اسلامی آرٹ و کرافٹ' کے عنوان سے 6 اگست سے جاری نمائش کی۔ اختتامی تقریب میں ایران کلچر ہاؤس کے معاون کلچرل کونسلر احمد عالمی، پریم چند آرکائیوز کی ڈائرکٹر صبیحہ انجم زیدی، شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر عراق رضا زیدی، مجید احمدی کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات شریک تھے۔ اس موقعے پر احمد علی نے کہا کہ ہندوستان میں بھی اب قرآنی ادبیات کی نمائش پر توجہ دی جانے لگی ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اس نمائش کو بہت پسند کیا گیا۔ نمائش کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایران کے اسلامی طرز کی خطاطی، ایرانی معاشرے میں رائج حرفت اور ایران کی ذہانت کو خاص طور پر دکھایا گیا۔ یہاں پیش کی جانے والی نمائش کی ساری خطاطی ایرانی طرز کے مطابق ہندوستانی خطاط نے کی ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کا سب سے بڑا قرآن بھی ایران کلچر ہاؤس میں ہی تیار کیا گیا ہے۔ کلچر ہاؤس میں باضابطہ اس کا ایک شعبہ ہے جس میں ہندوستان کے خطاط ایرانی طرز کے مطابق اسلامی خطاطی اور پینٹنگ کو فروغ دے رہے ہیں۔ نمائش میں اسلامی اور قرآنی آرٹس پر زیادہ زور دیا گیا ہے، خاص طور سے ہند و ایران کی باہمی ثقافت کو دکھایا گیا ہے۔ نمائش میں 5×3 سائز کا سب سے لمبا قرآن، دس فٹ کے کپڑے کے ایک ٹکڑے پر مکمل قرآن، ایرانی آرٹ پر مبنی بہترین طرز کی لکڑی کے باکس، مختلف قسم کے قرآن کی نمائش، خط کوفی، نستعلیق، ثلث، رقع، دیوان اور خط غبار میں تحریر آیات قرآنی کو نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ خاص ایرانی طرز کے مطابق مختلف آیات کے ذریعے اور مخصوص انداز میں پیش گوئی کرنے والی کنڈلی بھی نمائش کے لیے رکھی گئی تھی۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 16 اگست 2015

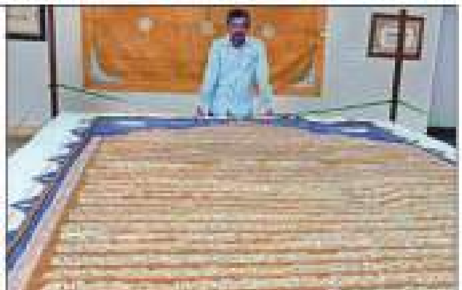

'کیفی اعظمی فکروفن' پر یک روزہ سمپوزیم

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ساہتیہ اکادمی کے اشتراک سے 'کیفی اعظمی: فکروفن' پر ایک

روزہ سمپوزیم کا افتتاح کرتے ہوئے ممتاز شاعرو نغمہ نگار جاوید اختر نے کہا کہ 1936 میں ترقی پسند تحریک پریم چند کی قیادت اور ٹیگور کی سرپرستی میں چلی اور کیفی اعظمی اس کے ایک بڑے سپاہی تھے۔ کیفی اعظمی کے قول وعمل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ انھوں نے سماج کی بے بسی اور مجبوری کو اپنی شاعری کا عنوان بنایا اور اپنے قلم کو تلوار کی طرح استعمال کیا۔ جاوید اختر نے کہا کہ کیفی اعظمی نے فقیرانہ زندگی گزاری۔ انھوں نے کہا کہ کیفی نے انقلابی نظموں کے ساتھ رومانی شاعری بھی کی ہے۔ انھوں نے کیفی اعظمی کی یاد میں اپنی نظم 'وہ عجیب آدمی' پیش کی۔ ممتاز فلم اداکارہ اور کیفی اعظمی کی صاحب زادی شبانہ اعظمی نے کہا کہ ان کے بابا نے جب اسکول میں داخلہ کرایا، وہاں ماں باپ کو انگریزی جاننا بہت ضروری ہوتا تھا۔ انھوں نے علی سردار جعفری کی اہلیہ سلطانہ جعفری کو میری والدہ اور منس نرائن سکسینہ کو والد بنا کر پیش کیا۔ بعد میں ان کے ابا نے فلموں میں گانے لکھنے شروع کیے اور ان کے فوٹو اخبار میں چھپنے لگے تو انھوں نے بڑے فخر سے کہا کہ یہی میرے ابا ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ میرے ابا کی سب سے بڑی طاقت ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے والد کیفی اعظمی سے متاثر ہوکر ہی جگی جھونپڑیوں کی جانب رخ کیا اور دہلی سے میرٹھ تک پدیاترا کی جو فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف تھی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ (ریٹائرڈ) نے ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کیفی اعظمی ایک عظیم انسان تھے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کیفی اعظمی غلام ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آزاد ہندوستان میں جیے وہ کہا کرتے تھے کہ سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا۔ ان کے نام سے کیفیات ایکسپریس ٹرین چلتی ہے۔

سمپوزیم کے مہمان اعزازی مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) نے کہا کہ نظیر اکبرآبادی کے بعد کیفی اعظمی نے غریب عوام کے لیے لکھا۔ قلم کے ذریعے اپنی بات گھر گھر اور گاؤں گاؤں تک پہنچائی۔ انھوں نے ہمیشہ ہی فرقہ پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور وہ سچے محب وطن تھے۔ بریگیڈیئر سید احمد علی نے کہا کہ اردو کو سب سے زیادہ فروغ ہندوستان کی فلم انڈسٹری نے دیا اور آج فلم انڈسٹری کی دو ممتاز شخصیات یہاں تشریف فرما ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ترسیل عامہ کے پروفیسر اور معروف نقاد پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ کیفی اعظمی ہمارے عہد کے ممتاز شاعر تھے۔ ان کی شاعری احتجاج کی شاعری ہے۔

ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مسلم یونیورسٹی نے ہمیشہ سے ہی ساہتیہ اکادمی کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر مشتاق صدف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر مولانا آزاد لائبریری کی ڈاکٹر شائستہ بیدار کے ذریعہ مرتب کردہ کیفی اعظمی کلیکشن کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جاوید اختر اور شبانہ اعظمی نے مولانا آزاد لائبریری میں کیفی اعظمی کلیکشن کا افتتاح کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 اگست 2015

شیخ الشریف مصطفےٰ فواد شافعی کا مولانا آزاد لائبریری کا دورہ

علی گڑھ: نبی کریم کے خاندان سے تعلق رکھنے والے سعودی عرب سے تشریف لائے شیخ الشریف مصطفےٰ فواد شافعی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کا دورہ کیا اور وہاں موجود نادر مخطوطات اور کتب کا معائنہ کیا۔ اپنے اس دورے میں انھوں نے یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود نہایت اہم ترین 18ویں صدی سے جڑے خصوصی طور پر مکہ مدینہ اور اسلام کی تاریخ سے وابستہ نہایت نادر و نایاب دستاویزات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی کہ وہ ہندوستان آکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور تاج محل دیکھیں۔ انھوں نے ابن عربی کی فتوحات مکیہ کا معائنہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں اسلامی وراثت کو تسکین کرنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیے جا رہے طریقوں سے وہ بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ جناب الشریف مصطفےٰ نے کہا کہ انھوں نے اسلامی ممالک میں مصر اور ترکی کی لائبریریوں کا بھی دورہ کیا لیکن جس طرح مولانا آزاد لائبریری میں دستاویزات کو محفوظ رکھا گیا ہے وہ دیگر کسی ملک کی لائبریری میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ انھوں نے ہندوستان میں امن اور خوش حالی کی دعا کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ زمین ہے جہاں جنت سے حضرت آدم کو اتارا گیا اور یہیں سے حضرت انسان کی تمام دنیا میں توسیع ہوئی۔ اس موقعے پر مولانا آزاد لائبریری کے لائبریرین ڈاکٹر امجد علی نے شیخ الشریف کو مخطوطات اوویژن میں رکھے عرب ممالک خصوصی طور پر مکہ و مدینہ کے جغرافیہ اور تاریخ سے وابستہ دستاویزات بھی دکھائے جن کو معزز مہمان نے کافی سراہا۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 23 اگست 2015

دھلی:

اردو اکادمی دہلی کی سابق گورننگ کونسل کی الوداعی تقریب

نئی دھلی: اردو زبان ہندوستان کی ہے اس کا جنم یہیں ہوا اور یہ یہیں پلی بڑھی ہے اس کا تعلق کسی مذہب یا فرقے سے نہیں ہے۔ اردو کی ترقی و فروغ کے لیے دہلی کے کونے کونے میں مختلف پروگرام منعقد کیے جانے چاہئیں جو عوام کی دلچسپی کے ہوں تاکہ لوگ اس زبان کو نہ صرف سنیں بلکہ پڑھنے لکھنے کی طرف بھی راغب ہوں اور یہ زبان براہ راست عوام تک پہنچ سکے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی کے وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال نے انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر میں اردو اکادمی دہلی کی سابق گورننگ کونسل کی خدمات کے اعتراف میں دی گئی ایک الوداعیہ تقریب میں کیا۔ اس تقریب کا اہتمام وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس میں دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا، سابق وزیر فن، ثقافت والسنہ کپل مشرا اور محکمہ فن، ثقافت و السنہ دہلی سرکار کے سکریٹری ریمیش تیواری کے علاوہ اردو کی سابق اور نومنتخب گورننگ کونسل کے وائس چیئرمین اور ممبران نے شرکت کی۔ اردو اکادمی کی نئی باڈی کی سربراہی نومنتخب وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور سابق گورننگ کونسل کی قیادت پروفیسر خالد محمود کر رہے تھے۔ اس موقعے پر کیجریوال نے مزید کہا

اردو اکادمی دہلی کی سابق گورننگ کونسل کی الوداعی تقریب کا منظر

کہ دہلی سرکار اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے تیار ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی سرکار چاہتی ہے کہ اکادمی جہاں ادب کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے وہ ضرور کیے جائیں۔ سابقہ گورننگ کونسل کے وائس چیئرمین اور اراکین کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ان حضرات نے واقعتاً اردو اکادمی کو ایک بلند مقام تک پہنچایا ہے اور ہمیں اردو کے فروغ کے لیے ان لوگوں کے تعاون کی ہمہ وقت ضرورت ہے۔ انھوں نے نئی گورننگ کونسل کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے اور انھیں ساتھ لے کر چلنے کی بھی تلقین کی۔ اس موقعے پر نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے کہا کہ وہ اردو کی ان عظیم شخصیات کے تعاون سے نہ صرف دہلی بلکہ پورے ہندوستان کو خوبصورت بنانا چاہتے ہیں اور اس کی خوبصورتی یہی ہے کہ یہاں قومی یکجہتی کی فضا قائم ہو۔ اس تقریب میں وزیر اعلیٰ نے ایک نئی روایت قائم کرتے ہوئے سابق گورننگ کونسل کے اراکین کو ایک یادگاری نشان اور پھول پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جی آر کنول، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر شہزاد انجم اور معصوم مرادآبادی نے بھی اظہار خیال کیا۔ آخر میں دہلی سرکار کے سکریٹری ثقافت اشیش تیواری نے اظہار تشکر کرتے ہوئے اکادمی کے اراکین کو سرکاری سطح پر ہر تعاون کا یقین دلایا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 28 اگست 2015

دہلی اردو اکادمی غیر مسلم علاقوں میں 10 اردو سینٹر کھولے گی

نئی دہلی: دارالحکومت دہلی کے غیر مسلم علاقوں میں بھی اردو سینٹر کی ضرورت ہے، اس لیے دہلی اردو اکادمی اب غیر مسلم علاقوں میں اردو سکھانے کے مقصد سے 10 اردو سینٹر کھولے گی۔ ان خیالات کا اظہار دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے روزنامہ سیاسی تقدیر سے ایک خصوصی گفتگو کے دوران کیا۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ اردو کے فروغ کی ذمے داری ہماری ہے کیونکہ ہمیں اردو والوں نے عزت بخشی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم اردو والوں نے اردو کو اپنا روزگار تو بنایا، لیکن کہیں نہ کہیں ہم سے بھی کمی رہ گئی جو ہم اسے بہتر ڈھنگ سے متعارف نہیں کرا سکے۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی کے زیر اہتمام سیمینار اور مشاعرے ہوتے رہیں گے، تاہم شعرا اور ادیبوں کو دیے جانے والے وظیفے کو بڑھایا جائے گا اور ہم نے اس تعداد کو بڑھا کر اب 25 کر دیا ہے اور آئندہ دنوں پر اس پر مزید غور کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ مشاعروں میں آنے والے شعرا کی رقم کو 5 ہزار سے بڑھا کر دہلی سرکار نے 15 ہزار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ریسرچ بھی پڑھنے والوں کی رقم کو بھی ہم نے دوگنا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اردو اساتذہ کی کمی کے تعلق سے کہا کہ اکادمی نے 50 لوگوں کی کمیٹی بنائی ہے۔ یہ کمیٹی پوری دہلی کا جائزہ لے گی اور اگر وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد ہے، تو وہاں اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی میں صحافیوں کو ایوارڈ دیے جاتے تھے، لیکن ہم نے اردو کے پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کے نام سے ایک اردو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے، جو اس سال سے باضابطہ شروع کیا جائے گا۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے مزید کہا کہ اردو کی خدمت کرنے والوں کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے اور اسی اعتراف کے مقصد سے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر سال اردو صحافیوں کو ایوارڈ دیا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ صحافیوں کو دیے جانے والے ایوارڈ میں اردو چینل کو بھی شامل کیا جائے گا کیونکہ اردو چینل بھی اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ روزنامہ سیاسی تقدیر دہلی، 31 اگست 2015

دہلی یونیورسٹی میں پہلا قمر رئیس میموریل لیکچر

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں راجندر سنگھ بیدی کے صد سالہ یوم پیدائش کی مناسبت سے منعقد کیے گئے پہلے قمر رئیس میموریل لیکچر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے بیدی کو فطری فنکار قرار دیا اور کہا کہ ان کی تخلیقات میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت جنم لیتی ہے۔ بیدی نے اردو فکشن کو 'ایک چادر میلی سی' اور 'لاجونتی' جیسی لازوال تخلیقات سے نوازا۔ انھوں نے قمر رئیس میموریل لیکچر کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس کے بغیر فکشن تنقید کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ پروفیسر قمر رئیس میموریل لیکچر کا آغاز اردو ادب میں ان کی مجموعی خدمات کا اعتراف ہے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے راجندر سنگھ بیدی کے فکر و فن پر خطبہ پیش کیا۔ افتتاحی تقریر میں پروفیسر عبدالحق نے قمر رئیس میموریل لیکچر کے انعقاد پر صدر شعبۂ اردو کو مبارکباد پیش کی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی صدر شعبۂ سنسکرت پروفیسر بھارد واج نے اپنی تقریر میں تمام زبان والوں کو اپنی لڑائی مل کر لڑنے کے لیے کہا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر مظہر احمد نے ادا کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 2 ستمبر 2015

ساہتیہ اکادمی میں کتھا سندھی پروگرام

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے زیر اہتمام اکادمی کے آڈیٹوریم میں منعقدہ کتھا سندھی پروگرام میں اردو کے ممتاز فکشن نگار نورالحسنین نے اپنے تخلیقی عمل کے حوالے

سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کہانی لکھنا میرے لیے ایک تپسیا سے کم نہیں ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنی کہانی 'پیپل کی چھیاں' پیش کی جو مذہبی منافرت اور مذہب کے نام پر انسانی تعلقات میں زہر گھولنے کے خلاف لکھی گئی ہے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف فکشن نگار مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ نورالحسنین کا فن بہت پختہ ہے، 80 کی دہائی کے بعد انھوں نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ شعیب رضا فاطمی نے کہا کہ ان کا افسانہ فسادات کے موضوعات پر افسانہ لکھنے والے ادیبوں کے لیے منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ نگار عظیم نے نورالحسنین کی تعریف کی۔ قبل ازیں اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے پروگرام کے آغاز میں نورالحسنین کا مختصر تعارف پیش کیا۔ اس تقریب میں دہلی کی

انجمن فکر رفعت سروش کے تحت تقسیم انعام کا منظر

متعدد سرکردہ شخصیات نے شرکت کی جس میں تسیم احمد تسیم، خورشید عالم، سید تنویر حسین، سہیل انور، سفیان احمد، ہادی رہبر، انصاری اطہر حسین، موسیٰ رضا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ انقلاب دہلی 18 اگست 2015

'انجمن فکر رفعت سروش' کے تحت تقسیم انعام

نئی دہلی: 'انجمن فکر رفعت سروش' اور سوشل کونسلرس کونسلنگ اینڈ گائڈنس سینٹر کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کے نادار طلبہ کے لیے ایک جلسہ تہنیت کا انعقاد کیا گیا جس میں ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز، شہید بھگت سنگھ کالج کے سابق پرنسپل نفیس صدیقی، پروفیسر ناصر رضوی، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی اور معصوم مرادآبادی نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔ پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر شبانہ نذیر تھیں جبکہ نظامت کے فرائض تبسم یاسمین نے ادا کیے۔ اس موقعے پر گلزار دہلوی نے کہا کہ تعلیم کے شعبے میں توازن اور اعتدال بہت ضروری ہے۔ بچوں کو فرقہ پرستی، تنگ نظری اور عصبیت کے خلاف تعلیم دینی چاہیے۔ اس موقعے پر معصوم مرادآبادی، نفیس صدیقی نے اپنے خیالات پیش کیے۔ آخر میں ڈاکٹر شبانہ نذیر نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر اردو میڈیم اسکولوں میں 12 ویں جماعت میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔ نشان رفعت سروش اسپیشل انعام سے اردو میں 100 فی صد نمبر حاصل کرنے والی نیبہ شکیل اور گل فشاں کو نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سے طلبا و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 19 اگست 2015

چھٹا منشی پریم چند یادگاری لیکچرس

نئی دہلی: جامعہ تحفظ پریم چند و ادبی سنٹر کی طرف سے ٹیگور ہال، دیار میر تقی میر میں چھٹا منشی پریم چند یادگار لیکچر پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ہرش ترویدی نے شرکت کی۔ جبکہ اس کی صدارت کی ذمے داری پروفیسر شمیم حنفی نے ادا کی۔

پروفیسر ہرش ترویدی نے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند جہاں دیدہ شخص کے مالک تھے۔ ان کے خیالات کی پرواز کافی اونچی تھی۔ انھوں نے اردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھا مگر ان کا یہ کمال علم ہی تھا کہ دونوں کے مواد اور موضوع ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے صدارتی خطاب کے دوران کہا کہ منشی پریم چند کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا رول ماڈل مانا جانا چاہیے۔ اس موقعے پر پروفیسر اسدالدین، پروفیسر انیس، پروفیسر خالد جاوید، ڈاکٹر سرور الہدیٰ کے ساتھ ساتھ جامعہ کے مختلف شعبوں کے طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ ہمارا سماج دہلی 27 اگست 2015

دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر محمد ہاشم کا خصوصی لیکچر

نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر سید محمد ہاشم کے خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں سید محمد ہاشم نے اردو تحقیق کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی نے سائنٹفک تحقیق کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس شعبے سے اردو کی اہم شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی، رشید حسن خاں، تنویر احمد علوی ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے اردو کے تحقیقی معیار کو بلند کیا۔ رشید حسن خاں نے تحقیقی اصول وضوابط پر نہ صرف کتابیں لکھیں بلکہ فسانۂ عجائب، باغ و بہار، سحرالبیان جیسی کتابوں کی تدوین کرکے عملی تحقیق کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے سرسید احمد خاں، محمود خاں شیرانی، مالک رام، قاضی عبدالودود، اور امتیاز علی عرشی جیسی اہم شخصیات کی خدمات پر بھی اظہار خیال کیا۔ موجودہ دور کے ریسرچ کے تعلق سے کہا کہ جامعات میں تدوین کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ جس کی طرف ریسرچ اسکالرس کو آنا چاہیے۔ انھوں نے کلاسکی ادب اور مخطوطات پر تحقیقی کام کرنے کے لیے فارسی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیات کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آغاز میں شعبہ کے صدر پروفیسر ابن کنول نے مہمان خصوصی کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ پروگرام کے اخیر میں ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ اس پروگرام میں شعبہ کے اساتذہ کے علاوہ طلبا و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 21 اگست 2015

اتر پردیش:

بیگم اختر ایوارڈ ہر برس ایک گلوکار کو دیا جائے گا

لکھنؤ: وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو کی صدارت میں کابینہ کی ایک اہم میٹنگ ہوئی جس میں متعدد فیصلے کیے گئے۔ کابینہ نے اتر پردیش میں دادرا، ٹھمری اور غزل کے شعبے

میں باصلاحیت اور مخصوص گلوکاروں کو بیگم اختر ایوارڈ سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں سابقہ سرکاری حکم نامہ کے رہنما اصولوں میں چند ترامیم کرکے بیگم اختر انعام کے ترمیم شدہ نئے رہنما اصول کے نفاذ کو منظوری دی گئی ہے جس کے تحت ہر برس ایک پروقار تقریب میں ایک قابل گلوکار کو بیگم اختر ایوارڈ سے نوازا جائے گا اور اس موقعے پر ایک یادگاری مجلہ شائع کرنے کی تجویز کو بھی منظوری دے دی گئی ہے۔ کابینہ نے حالانکہ ہر برس صرف ایک گلوکار کو بیگم اختر ایوارڈ سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن یہ گنجائش بھی رکھی ہے کہ صلاحیت کی بنیاد پر ایوارڈ کی تعداد میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایوارڈ کے تحت پانچ لاکھ روپے، شال اور توصیفی سند پیش کی جائے گی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 12 اگست 2015

غیر مسلم طلبا نے بلند کیا اردو کا پرچم

گورکھپور: اردو کو مٹانے اور اسے ختم کرنے کے ناپاک عزائم کے درمیان کچھ غیر مسلم برادران وطن نے اس کی آبیاری کرکے چمن میں پھول کھلانے کی کوشش کی ہے۔ دین دیال اپادھیائے گورکھپور یونیورسٹی سے اردو میں تعلیم حاصل کر رہے ان غیر مسلموں نے اس شمع کو روشن کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ تفصیلات کے مطابق گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں کئی غیر مسلم طلبا زیر تعلیم ہیں۔ انھیں میں سے ایک کوشل کمار ہیں، جو ضلع دیوریا کے ایک گاؤں کوٹوا مسر کے رہنے والے ہیں۔ والد اوما شنکر کھیتی کرتے ہیں۔ کوشل بتاتے ہیں کہ ان کے والد تعلیم سے نابلد ہیں، لیکن وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ

سرسید کے ویژن 'ہر ضلع میں ایک اسکول' پروگرام کا منظر

کرنے کے لیے پرعزم ہیں۔ وہ اردو کے بھی دلدادہ ہیں اور ان کی خواہش تھی کہ ان کا ایک بچہ اردو پڑھے اور اسی زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ایک روز اردو کا استاد بنے۔ والد کی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے انھوں نے دو سال قبل گورکھپور یونیورسٹی کا رخ کیا اور یہاں کے شعبہ اردو میں داخلہ لیا۔ وہ فی الحال بی اے سال دوم کے طالب علم ہیں اور وہ پی ایچ ڈی دہلی یونیورسٹی یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ کوشل کا کہنا ہے کہ اردو ایک شیریں زبان ہے، جو دلوں کو جوڑتی ہے اور اسی چیز نے انھیں اس زبان کو سیکھنے پر مجبور کردیا۔ تین بھائی، دو بہن میں تیسرے نمبر کے کوشل کے مطابق اردو سیکھنے کے لیے انھوں نے اپنے گاؤں کی مسجد کے ذمے دار مولانا قدوس سے رابطہ کیا۔ مولانا نے بھی ان کی اس خواہش کا احترام کیا اور اپنی جانب سے بھرپور تعاون کیا۔ کوشل کی طرح جتیش پرساد بھی ہیں، وہ بھی شعبۂ اردو میں بی اے سال دوم کے طالب علم ہیں۔ گاؤں کلوا کے رہنے والے جتیش کے والد رام دھاری صفائی ملازم ہیں، لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کو اردو زبان میں تعلیم دلا رہے ہیں۔ جتیش کے مطابق ان کے گاؤں کے ایک شخص راجندر پرساد نے ان کے والد کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچے کو اردو میں تعلیم دلائیں۔ ایک سوال کے جواب میں جتیش کہتے ہیں کہ یہ تاثر غلط ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، بلکہ یہ تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ اردو یہیں پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھی، لوگوں کے دلوں پر راج کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ جتیش کی خواہش بھی اردو کا استاد بننے کی ہے اور اس کے لیے وہ پوری محنت بھی کررہے ہیں۔ واضح رہے کہ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ہر سال تقریباً نصف درجن غیر مسلم طلبا و طالبات فارغ ہوتے ہیں۔ فی الحال اس شعبہ میں 10 ایسے طلبا زیر تعلیم ہیں، جن میں ایک ریسرچ اسکالر نیلم لتا بھی شامل ہیں۔ روزنامہ انقلاب دہلی، 3 ستمبر 2015

سرسید کا ویژن 'ہر ضلع میں ایک اسکول'

نئی دہلی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کہا ہے کہ اتر پردیش کے ہر ضلع میں ایک معیاری اسکول قائم کرنے کا سلسلہ جلد ہی شروع کیا جارہا ہے۔ انھوں نے یہ بات انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر اور اے ایم یو کی ایکسٹرل کورٹ کے ممبران کی جانب سے سرسید کے ویژن 'ہر ضلع میں ایک اسکول' کے موضوع پر منعقد سیمینار میں اس تعلق سے منصوبہ کا خاکہ بیان کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر ضلع میں کم سے کم 12 ایکڑ زمین کی ضرورت ہے اور بہت سے افراد نے اس سلسلے میں اپنا دست تعاون بڑھا دیا ہے۔ وائس چانسلر نے مزید بتایا کہ ان اسکولوں پر براہ راست نگرانی سرسید ایجوکیشن فاؤنڈیشن رکھے گا اور داخلہ جاتی اور تعلیمی امور پر اسی کا کنٹرول ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ تعلیمی معیار کے اعتبار سے یہ اسکول کسی بھی کونوینٹ اسکول کے مقابلے میں کھڑے ہوسکیں گے لیکن ان کی اپنی اسلامی شناخت ہوگی۔ ان اسکولوں میں بہت معمولی فیس ہوگی اور قابل استادوں کا تقرر کیا جائے گا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے اس پہل کو ایک عظیم قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو اسلامی تہذیب وتمدن کے ساتھ دی جانے والی عصری تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ نشانہ اسی وقت پورا ہوسکے گا جب خود مسلمان اپنے اسکول قائم کریں۔ اس موقعے پر اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سابق صدر مقصود احمد خان نے بھی اظہار خیال کیا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 23 اگست 2015

جامعہ اردو علی گڑھ کو اوپن یونیورسٹی بنانے کی کوشش

علی گڑھ: مرکزی حکومت کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے نیشنل کمیشن فار مائنارٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنس کی تشکیل کردہ 'ہندوستان میں اردو زبان اور روزگار کے فروغ کے لیے کمیٹی' کے مقامی اراکین کی میٹنگ مزمل منزل کامپلیکس میں واقع میڈیا سینٹر پر منعقد ہوئی جس میں ہندوستان میں تعلیمی معاملات پر گفت و شنید کی گئی۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کمیٹی کے مقامی سینئر رکن پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ موجودہ حکومت ہندوستان کی تمام زبانوں کے ساتھ اردو زبان اور اردو داں طبقے کے روزگار کے فروغ کے تعلق سے بے حد سنجیدہ ہے جس کے لیے اس نے 'ہندوستان میں اردو زبان اور روزگار کے فروغ کے لیے کمیٹی' قائم کی ہے جو ملک میں اردو زبان کی صورت حال اور اردو داں طبقہ کے لیے اردو میں روزگار کے مواقع مہیا کرانے میں حکومت سے معاونت کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں جامعہ اردو سے زیادہ کسی ادارے نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کام نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مذکورہ کمیٹی کے ذمے داران کی نگاہیں جامعہ اردو علی گڑھ کی خدمات پر مرکوز ہیں جس کے بہتر نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کمیٹی کے ایک دیگر سینئر رکن ڈاکٹر شبھ ناتھ تیواری نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ نے گذشتہ 76 سال میں اردو زبان کے فروغ اور حاشیہ پر کھڑے محروم طبقات کو تعلیم مہیا کرانے میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ کمیٹی حکومت ہند سے جامعہ اردو علی گڑھ کو اوپن یونیورسٹی بنائے جانے کی سفارش کرے گی۔ 'ہندوستان میں اردو زبان اور روزگار کے فروغ کے لیے کمیٹی' کے رکن/سکریٹری ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ کمیٹی کی کوشش ہے کہ ملک کے وہ تمام ادارے جو اردو زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کررہے ہیں ان کو ان کی خدمات کا واجب حق ادا کیا جائے۔ روزنامہ صحافت دہلی، 13 اگست 2015

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا برج کورس

علی گڑھ: فارغین مدارس کو یونیورسٹی کے مین اسٹریم سے جوڑنے کے لیے قائم کیے گئے برج کورس کے دوسرے بیچ کے طلبا و طالبات نے سو فیصد کامیابی حاصل کرکے خوشگوار تاثر دیا ہے۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ فارغین مدارس کے روشن مستقبل کی آبیاری کے لیے جو کورس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دو سال قبل قائم کیا گیا تھا، اس نے اب اپنے پھول اور پھل دینے شروع کردیے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد احمد، انچارج رابطہ عامہ برج کورس نے اپنے ایک پریس اعلامیہ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ برج کورس نے فارغین مدارس کے لیے وہ تمام دروازے کھول دیے ہیں جو کسی عام طالب علم کے لیے کھلے ہیں۔ آرٹس، سوشل سائنس، قانون/ LLB، کمپیوٹر ایپلیکیشن اور سوشل ورک وغیرہ کے بھی دروازے فارغین برج کورس کے لیے بھی کھل چکے ہیں، ان کورسز کی مدد سے ہمارے یہ طلبا سول سروسز میں عام طلبا کی طرح جانے کے مجاز ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ کے برج کورس کے قیام کے لیے اقدامات کو تمام حلقوں میں تحسین کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ ڈاکٹر احمد نے کہا کہ برج کورس کے اس دوسرے بیچ نے جو سو فیصد کامیابی حاصل کی ہے اس نے ہمارا سر فخر سے اونچا کردیا ہے۔ ان کی کامیابی ان کے پسندیدہ کورسز میں ان کے داخلہ حاصل کرنے سے ظاہر

ہوتی ہے۔ چنانچہ 5 بچوں نے قانون میں 23 بچوں نے انگلش میں، 7 بچوں نے اکنامکس میں، ایجوکیشن، پولیٹکل سائنس، فلاسفی، ہوٹل مینجمنٹ، اردو اور اسلامک اسٹڈیز میں دو دو، بی سی اے، سوشیالوجی، جغرافیہ اور تاریخ میں ایک ایک طلبا و طالبات نے داخلہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی کی اس رفتار سے متاثر ہوکر ہم اس سال سے سائنس تعلیم بھی شروع کرنے جارہے ہیں۔ برج کورس سائنس اسٹریم دو سال کا ہوگا۔ ہم انہی سو بچوں میں سے 30 باصلاحیت اور حوصلہ مند بچوں کا انتخاب کرکے سائنسی تعلیم کا آغاز کریں گے اور اس طرح علما کا ڈاکٹر، انجینئر اور سائنٹسٹ بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا اور ماضی کی اسپین و دمشق کی دانش گاہوں کی یاد تازہ ہوگی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 19 اگست 2015

ہماری زبان، ہماری بیٹیاں اور ان کا مستقبل

کانپور: ایس پی ایجوکیشن سینٹر باپو پوروہ کانپور جو سرکاری منظوری کے ساتھ ایس پی ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر نگرانی چل رہا ہے جس میں 488 طلبا و طالبات زیر تعلیم ہیں، سنٹر کی انتظامیہ نے فروغ اردو کے لیے ایک پروگرام منعقد کیا جس کا عنوان ہماری زبان ہماری بیٹیاں ان کا مستقبل تھا۔ مہمان خصوصی لکھنؤ کے میٹنگ ڈائرکٹر سابق جناب ایم پی باجپئی جی، حلیم مسلم انٹر کالج کے استاد جناب نظام الحق صاحب نے شرکت کی۔ جناب باجپئی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بتایا کہ اردو زبان کو کسی فرقے سے نہیں جوڑنا چاہیے۔ اس معاملے میں لوگوں کا نظریہ بالکل غلط ہے۔ انھوں نے کہا کہ پانگشر نسیم، فراق گورکھپوری، کرشن بہاری، نور کنور مہندر سنگھ بیدی، تمام غیر مسلم شعرا و مصنف ہوئے ہیں جنھوں نے فروغ اردو کی کوششیں کی ہیں۔ حلیم مسلم کالج کے استاد نے کہا کہ اردو کو روزی روٹی سے منسلک کرنے کی غرض سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کے کورسز شروع کردیے ہیں۔ ہماری بیٹیاں اور ان کے مستقبل پر طالبات نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ڈاک سے، پرنسپل ایس پی ایجوکیشن سینٹر باپو پوروہ کانپور، 11 اگست 2015

'تہذیب الاخلاق' کی مکمل فائل

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے جاری کردہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کی مولانا آزاد لائبریری میں دستیاب فائل کے کئی غیر موجود شماروں کی فوٹو کاپی حاصل کرلی گئی ہے۔ اس طرح اب رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کی مکمل فائل کا مولانا آزاد لائبریری میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر عطا خورشید نے بتایا کہ انھوں

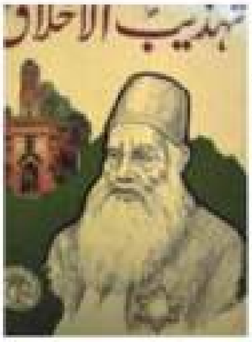

نے سخت محنت اور بڑی کاوش کے بعد تہذیب الاخلاق رسالہ کے مختلف 12 شماروں کی کاپیاں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مذکورہ شماروں کے موجود نہ ہونے سے اب تک لائبریری میں تہذیب الاخلاق کی فائل نامکمل تھی۔ ڈاکٹر خورشید نے کہا کہ سرسید کے شائع کردہ دوسرے اہم رسالے 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کی فائل بھی مکمل نہیں ہے اور اس کے کئی شمارے موجود نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جلد ہی وہ اس رسالے کے گمشدہ شماروں کی کاپیاں حاصل کرکے مولانا آزاد لائبریری کو مہیا کرادیں گے۔

روزنامہ خبریں، دہلی، 25 اگست 2015

اردو اور ہماری ذمہ داریاں

موناتھ: اردو زبان کی زبوں حالی کے لیے ہم خود ذمے دار ہیں جب ہم خود اردو پڑھنا پڑھانا پسند نہیں کرتے تو اردو کی ترقی کیسے ممکن ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا سلیم قریشی ندوی نے ماکارتی ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام 'اردو اور ہماری ذمہ داریاں' پر منعقدہ سیمینار میں کیا۔ وہ بطور مہمان خصوصی پروگرام میں شریک ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ جب اردو کو اترپردیش سرکار نے دوسری سرکاری زبان قبول کرلیا ہے تب بھی ہماری توجہ اس طرف نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمارے معاشرے میں اردو کو نظرانداز کیا جارہا ہے جو بہت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اردو ٹیچر ندیم اختر نے کہا کہ اردو کی ہر دور میں اہمیت رہی ہے۔ جنگ آزادی میں بھی اخبارات نے آپسی رابطوں میں ایک اہم رول نبھایا ہے۔ اس موقعے پر مرزا منہاج الدین، ڈاکٹر ایم ڈی ہاشمی، شمیم غازی، جمیل احمد شاد وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 27 اگست 2015

ثقافت، ادب اور ناگر جی

لکھنؤ: امرت لال ناگر کہا کرتے تھے کہ اردو بھی سب سے اچھی زبان ہے۔ اس میں مٹھاس ہے۔ معروف شاعر اور سابق ممبر پارلیمنٹ بیکل اتساہی نے امرت لال ناگر صدی تقریب کے موقعے پر مذکورہ خیالات ظاہر کیے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کسی مخصوص شخص کی نہیں ہوتی ہے۔ 'ثقافت، ادب اور ناگر جی' موضوع پر اترپردیش ہندی سنستھان میں ہونے والی اس تقریب میں بیکل اتساہی نے ناگر جی کے سلسلے میں اپنی کئی یادیں سنائیں۔

وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کر رہے تھے۔ ہندی سنستھان کے صدر اودے پرتاپ سنگھ یادو نے کہا کہ ناگر جی کا اصول تھا کہ انسان اور انسان کے بیچ فرق نہیں ہونا چاہیے۔ آنے والی نسلیں ہمیشہ ان کی ممنون رہیں گی۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے موجود ڈاکٹر اچلا ناگر نے ناگر جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بابو جی کا فلموں کے میدان میں بھی بڑا اہم کردار رہا۔ انھوں نے ناگر جی کے لکھے ہوئے کئی خط بھی پڑھ کر سنائے۔ ڈاکٹر سوریہ پرساد دیکشت، سوم ٹھاکر، ڈاکٹر پربھا کر نے بھی اظہار خیال کیا۔ اترپردیش ہندی سنستھان کی جانب سے منعقد اس دو روزہ مذاکرے کے موقعے پر بھات کھنڈے کی طالبات کی جانب سے موسیقی ریز پروگرام پیش کیا گیا۔ سنستھان کی سہ ماہی میگزین کے امرت لال ناگر نمبر کا اجرا بھی کیا گیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 19 اگست 2015

مخدوم ملت ٹرسٹ کے زیر اہتمام عصری تعلیم کا نظام

سنبھل: مدرسے کے بچوں کو اب عربی فارسی کی تعلیم کے ساتھ ان کو سی بی ایس سی نصاب کے مطابق ہندی انگریزی، میتھ اور سائنس کے سبجیکٹ کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ مخدوم ملت ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام میں پانچویں سطح کی کلاسیں شروع کرائی گئیں۔ چودھری سرائے میں واقع مدرسہ دارالعلوم مخدومیہ میں بدھ کو منعقدہ پروگرام میں مولانا فاضل مصباحی نے مخدوم ملت ٹرسٹ کی طرف سے مدرسے کے طلبا کو دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم سے جوڑنے کے مقصد سے سی بی ایس سی پیٹرن پر نئی کلاس کو شروع کرانے کی معلومات دی۔ انھوں نے کہا کہ دنیاوی تعلیم کے تئیں بیدار کرنے کے لیے فاؤنڈیشن نے تعلیم کے میدان میں نئی پہل کی ہے۔ مولانا سلیمان اشرف حامدی نے کہا کہ فاؤنڈیشن کی اس پہل سے طلبا دینی و دنیاوی تعلیم کے ساتھ اپنا مستقبل سنوار سکیں گے۔

روزنامہ صحافت، دہلی، 14 اگست 2015

صد سالہ یوم پیدائش پر اپٹا کے تحت ہندی سنستھان میں تقریب کا انعقاد

لکھنؤ: عصمت چغتائی کو دکھاوا قطعی پسند نہیں تھا، انھوں نے سماج کی فرسودہ رسوم پر وار کیا صرف خواتین ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ہر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ خواتین کو مظلوم، روتا ہوا دیکھنے کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان خیالات کا اظہار مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر صبیحہ انور نے کیا۔ موصوفہ ہندی سنستھان کے نشی پریم چند آڈیٹوریم میں 'عصمت چغتائی' کے صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں ہوئی تقریب سے خطاب کر رہی تھیں۔ انڈین پیوپلز تھیٹر

پٹنہ میں اردو مشاورتی کمیٹی کی پہلی میٹنگ کا منظر

ایسوسی ایشن (اپنا) کے تحت ہوئی تقریب کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر صبیحہ انور نے عصمت چغتائی کے ساتھ گزارے برسوں کے واقعات پر مفصل روشنی ڈالی۔ اس سے قبل تقریب کے ناظم رئیس نے مختلف حوالوں سے ان کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ شبنم رضوی نے عصمت چغتائی کے ناولوں میں نسوانی کردار پر مقالہ پیش کیا۔ تقریب میں عابد سہیل، افسانہ نگار رتن سنگھ، ہندی کے نقاد ویریندر یادو وغیرہ نے عصمت چغتائی کی 'گرم ہوا'، 'قلم جنون' میں ان کی اداکاری، ان کی کہانی 'لحاف' کے علاوہ بچی کہانی فسادی سمیت متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ تقریب میں اردو ہندی کے قلمکاروں اور ادب دوستوں نے شرکت کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 16 اگست 2015

مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں تکنیکی تعلیمی پروگرام

دیوبند: مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں ٹیکنیکل تعلیم سے متعلق ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر انسٹی ٹیوٹ کے بانی مولانا حسیب صدیقی نے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ دور تکنیک اور ہنرمندی کا دور ہے جو نوجوان کسی بھی طرح کی ہنرمندی سے واقف ہوتے ہیں اور عملی طور پر 100 فیصد سے زیادہ صلاحیت دکھاتے ہیں، انھیں ملک کی مشہور کمپنیاں ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں۔ انھوں نے طلبا کو بتایا کہ گذشتہ 25 برسوں میں ادارہ سے 1394 طلبا تکنیکی تعلیم سے سرفراز ہوکر جاچکے ہیں اور اپنی بہترین صلاحیتوں کی بنا پر 95 فی صد طلبا ملک اور بیرون ملک اچھی ملازمتوں میں ہیں۔ حسیب صدیقی نے کہا کہ دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے یہ ادارہ تکنیکی تعلیم دینے میں اہم کردار ادا کررہا ہے اور کم پڑھے لکھے نوجوانوں کو کم مدت میں ٹریننگ دے کر روزگار کے قابل بنا رہا ہے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 13 اگست 2015

بہار:

پٹنہ میں اردو مشاورتی کمیٹی کی پہلی میٹنگ

پٹنہ: اردو کے مسائل اور سرکاری زبان اردو کی راہ میں حائل عملی مشکلات پر غوروفکر کے لیے محکمہ راج بھاشا کی اردو مشاورتی کمیٹی کی پہلی میٹنگ تھی اور ارکان بڑی تعداد میں شریک تھے۔ کمیٹی کے چیئرمین شفیع مشہدی کی صدارت میں منعقد اس میٹنگ میں وائس چیئرمین ڈاکٹر مشتاق احمد، ارکان ریحان غنی، میجر بلبیر سنگھ، ڈاکٹر سید احمد قادری، افضل حسین، اسد رضوی، پروفیسر قمر جہاں، شاہ جلال احمد قادری، ششکر کیموری، ڈاکٹر عبدالحنان سبحانی، پروفیسر توقیر عالم، اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری اور کمیٹی کے ممبر سکریٹری امتیاز احمد کریمی (ڈائرکٹر اردو)، ڈپٹی ڈائرکٹر خورشید اکبر اور اردو ڈائرکٹوریٹ کے دیگر افسران شریک تھے۔ میٹنگ کے ایجنڈے میں سرکاری اسکولوں میں اردو کی ابتدائی تعلیم کی صورت حال، انگلش میڈیم اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا نظم کیے جانے کی ضرورت اور بحیثیت ثانوی سرکاری زبان اردو کی صورت حال اور اس کے مسائل پر غوروخوض شامل تھا۔ ارکان نے پرائمری، اپر پرائمری اور سیکنڈری اسکول میں اردو اساتذہ کی کمی پر تشویش کا اظہار کیا۔ اس بابت کمیٹی کے ارکان کا ایک وفد وزیراعلیٰ سے مل کر ان مسائل کو رکھے گا۔ میٹنگ میں ان اضلاع، سب ڈویژنوں اور بلاکوں میں اردو عملہ کی تقرری کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا جہاں ابھی تک راج بھاشا کی یونٹ کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 25 اگست 2015

انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام ڈیجیٹل انڈیا مہم کا آغاز

پٹنہ: انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام ڈیجیٹل انڈیا خواندگی مہم کا آغاز انجمن ترقی اردو بہار کے کانفرنس ہال میں کیا گیا۔ خورشید اکبر نے پروگرام میں شریک ہونے والے طلبا وطالبات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج کے جدید دور میں کمپیوٹر کی تعلیم سبھی کے لیے ضروری ہے۔ بہت ہی انہماک کے ساتھ طلبا وطالبات کو کمپیوٹر سیکھنے کے لیے اپنا وقت لگانے کی ضرورت ہے تاکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی وہ اس تعلیم سے فائدہ حاصل کرسکیں۔ مشتاق احمد نوری سکریٹری، بہار اردو اکادمی نے اس موقعے پر بچوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علم سیکھنے کا عمل بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر صفدر امام قادری نے طلبا کو کمپیوٹر کی افادیت سے روشناس کرایا۔ عبدالقیوم انصاری نے اپنے صدارتی خطبے میں قومی ڈیجیٹل خواندگی مشن، محکمہ الیکٹرانکس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی، منسٹری آف کمیونی کیشن، حکومت ہند کے سلسلے میں طالب علموں کو کمپیوٹر کی بنیادی معلومات فراہم کیں۔ اس میں روزانہ کمپیوٹر کے استعمال کی اہمیت، کمپیوٹر پر کام کرنے کا طریقہ، پرنٹر، اسکینر اور دوسرے کمپیوٹر پارٹس کی جانکاری دی جائے گی۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ، ویب سائٹ، بلاگ کی جانکاری، ای۔ میل، نیٹ سرفنگ، کمپیوٹر سے چیٹنگ کے متعلق جانکاریاں دی جائیں گی۔ یہ کورس ایک مہینہ کا ہے اور جو طالب علم اس کورس کو کریں گے انھیں سرٹی فکیٹ دیا جائے گا۔

تقریب کی صدارت عبدالقیوم انصاری، سکریٹری، انجمن ترقی اردو بہار نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے خورشید اکبر ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ راج بھاشا، حکومت بہار اور مہمان اعزازی کے طور پر مشتاق احمد نوری سکریٹری بہار اردو اکادمی و جناب پروفیسر صفدر امام قادری اکیڈمک پروگرام کوآرڈی نیٹر، انجمن ترقی اردو بہار اور مشہور افسانہ نگار اور ایس سی آر ٹی ای کے پروگرام افسر قاسم خورشید شریک ہوئے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 25 اگست 2015

مارواڑی کالج میں کتابوں کی اہمیت پر مذاکرہ

بھاگلپور: مارواڑی کالج میں کتابوں کی اہمیت وافادیت پر ایک روزہ مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر تلکا مانجھی بھاگل پور یونیورسٹی کے پرو وی سی ڈاکٹر اے کے رائے نے طلبا واساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کتابوں کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہونے والی ہے خواہ کتنی بھی

ترقی ہوجائے۔ انھوں نے کہا کہ انٹرنیٹ پر وہ چیزیں نہیں دستیاب ہوں گی جو لائبریری میں دستیاب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ وطالبات و اساتذہ کتابوں کو اپنا دوست بنائیں اور لائبریری میں بھی اپنا وقت گزاریں۔ انھوں نے کہا کہ طلبا اب انٹرنیٹ کے ذریعے ہر ایک چیز کو تلاش کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ علم کو انٹرنیٹ پر نہیں بلکہ لائبریریوں اور اساتذہ سے حاصل کریں۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں ڈیجیٹلائزیشن کی بات کی جارہی ہے۔ اس سے دنیا کی ہر چیز نہیں حاصل کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ طلبا اپنے استادوں کی سنیں اور ان کی باتوں پر عمل کریں۔ انھوں نے کہا کہ اگر صلاحیت پیدا کرنی ہے تو طلبا کتابوں سے اپنا رشتہ مضبوط کریں۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 15 اگست 2015

تلنگانہ

مجتبیٰ حسین کی تخلیقات اب ویب سائٹ پر

حیدرآباد: ایڈیٹر روزنامہ سیاست زاہد علی خاں نے کہا کہ اردو والوں نے اردو کو زندہ رکھنے کے لیے بہت بڑا

کارنامہ انجام دیا ہے جس طرح ہم گذشتہ کئی برسوں سے اردو کے فروغ کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں اسی طرح مستقبل میں انھیں اسی جذبے سے اردو کے فروغ کے لیے خدمات انجام دینی چاہئیں۔ زاہد علی خاں برصغیر کے نامور طنز ومزاح نگار پدم شری ڈاکٹر مجتبیٰ حسین کی تخلیقات پر مشتمل ویب سائٹ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ قبل ازیں سافٹ ویئر انجینئر اصغر علی خاں نے بٹن دبا کر ویب سائٹ کا افتتاح کیا۔ اس ویب سائٹ کو انھوں نے تیار کیا تھا۔ زاہد علی خان نے کہا کہ ریاستی اور مرکزی حکومت کی سرپرستی میں اردو ترقی کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پدم شری مجتبیٰ حسین نے جو گذشتہ 53 سال کے دوران سیاست میں لکھا ہے اس کے تمام کالم اور مضامین اسی ویب سائٹ پر دستیاب رہیں گے۔ پدم شری مجتبیٰ حسین نے ان کے خاکے، کالم و دیگر تخلیقات کو ویب سائٹ پر پیش کرنے پر مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر تحریر کردہ مضمون بھی پڑھ کر سنایا۔ اس موقعے پر چیف ایڈیٹر شگوفہ پروفیسر مصطفیٰ کمال، سابق صدر شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی پروفیسر بیگ احساس نے خطاب کیا۔ انھوں نے پدم شری مجتبیٰ حسین کی جانب سے اردو زبان کے فروغ کے لیے کی گئی خدمات پر روشنی ڈالی۔ عابد صدیقی نے خیر مقدمی تقریر کی اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر مینیجنگ ایڈیٹر روزنامہ سیاست ظہیر الدین علی خاں کے علاوہ دیگر عمائدین شہر موجود تھے۔

روزنامہ منصف، حیدرآباد، 19 اگست 2015

تحریک اردو راجستھان ریلی کا منظر

راجستھان

تحریک اردو راجستھان

کوٹہ: سوشل ڈیموکریٹک پارٹی آف انڈیا کے صوبائی صدر اور تحریک اردو راجستھان کے کنوینر حافظ منظور علی خاں نے کوٹہ شہر میں ہوئی تاریخ ساز ریلی کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے 'تحریک اردو راجستھان' ریاست میں اردو اساتذہ، طلبہ اور لیکچررس کے ساتھ جو حق تلفی ہوئی اس کو بحال کرنے تک اس جدوجہد کو جاری رکھے گی۔ ایس ڈی پی آئی کے صوبائی صدر حافظ منظور علی خان نے راجستھان میں اردو کے ساتھ ہورہی ناانصافی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ راجستھان میں تقریباً 700 اردو اساتذہ کا تبادلہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اردو اسکولوں میں اساتذہ کا فقدان ہے اور اردو پڑھنے والے طلبا وطالبات اپنی مادری زبان پڑھنے سے محروم ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاستی سرکار نے گجرال کمیشن کی سفارشات کو بھی نظرانداز کیا ہے۔ حافظ منظور علی خاں نے اس بات کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ راجستھان میں RPSC کی جانب سے 4000 لیکچررس کی تقرری ہوئی ہے جس میں 221 اردو لیکچررس کو عدالت کے ذریعے Stay order لے کر ان کی تقرری پر روک لگائی گئی ہے۔ حافظ منظور علی خان نے کوٹہ شہر کے قاضی اور 'تحریک اردو راجستھان' کے سرپرست الحاج انوار احمد صاحب کی پرخلوص اقدامات کی ستائش کی۔ تحریک اردو راجستھان کے سرپرست الحاج انوار احمد نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد سے بدقسمتی سے اردو زبان تعصب کا شکار ہوتی رہی ہے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر، دہلی، 4 ستمبر 2015

مہاراشٹر

اردو کی شعری ونثری اصناف

اورنگ آباد: شعبۂ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے یوم تاسیس کے ضمن میں مختلف تقریبات کا انعقاد عمل میں آیا۔ بطور خاص شعبۂ اردو میں طلبا و طالبات کی کارکردگی، تحقیق وتصنیف اور دیگر علمی وادبی کارناموں کو پوسٹرس کے ذریعے پیش کیا گیا۔ اسی سلسلے میں شعبہ اردو کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طالب وطالبات کے لیے 'بعنوان: اردو کی شعری ونثری اصناف' ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں طلبا وطلبا نے مختلف موضوعات کے تحت اپنے مقالات پیش کیے۔ یونیورسٹی کے بی سی یو ڈی کے ڈائرکٹر اور دیگر شعبہ جات کے اساتذہ نے بھی شعبہ اردو کے اساتذہ اور طلبا وطالبات کی فروغ اردو کی کاوشوں کو سراہا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے اساتذہ پروفیسر غیاث الدین، او ایس ڈی اور سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر صدیقی محی الدین، ڈاکٹر مسرت فردوس اور ڈاکٹر کرتی مالینی جاوے نے بھی طلبا وطالبات کی رہنمائی کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر شیخ صدیقی محی الدین، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد، 31 اگست 2015

مدھیہ پردیش

سرفروشانِ جنگ آزادی

برھانپور: ملک کی آزادی میں علماء کرام اور مسلم قائدین کا کردار سنہرے حروف میں درج کرنے کے قابل ہے۔ مسلم قائدین نے جس اخلاص کے ساتھ ملک کے لیے اپنی قربانیاں پیش کیں وہ نئی نسل کے لیے بڑا سبق ہے۔ ان خیالات کا اظہار برہان پور، مدھیہ پردیش میں 'سرفروشان جنگ آزادی' کے عنوان کے تحت منعقد پروگرام میں ڈاکٹر ہری سنگھ گور یونیورسٹی ساگر کے استاذ ڈاکٹر افضل مصباحی نے کیا۔ یہ پروگرام عبدالقادر صدیقی ہال خیراتی بازار اردو اسکول برہان پور میں منعقد ہوا، جس کی صدارت پیرزادہ سید مصطفیٰ علی ساغر نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض ماسٹر طاہر نقاش اور محمد وکیل انصاری

نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ اس موقعے پر ایڈوکیٹ خلیل احمد اشرفی انصاری اور صحافی سید علی انجم رضوی نے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کا انعقاد برکاتی مشن بریلی کے زیر اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح ایڈوکیٹ عبید شیخ کے ہاتھوں کیا گیا۔ اس موقعے پر برکاتی مشن کے ڈائرکٹر جناب محمد تنویر رضا برکاتی کی ترتیب کردہ ایک کتاب 'جنگ آزادی میں علما اہل سنت کا کردار' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سیمینار میں شہر کے کالجز، اسکول کے اساتذہ، طلبہ اور بڑی تعداد میں عوام الناس نے شرکت کی۔ پروگرام کے انعقاد میں لیکچرر رفیق انصاری، محمد شفیق حارث، ڈاکٹر عمران، ڈاکٹر جمال انور وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2015

عارف عزیز کی صحافتی و ادبی خدمات

بھوپال: مولانا برکت اللہ بھوپالی ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے منعقد ایک پرشکوہ تقریب میں عارف عزیز کی طویل صحافتی اور ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ شہر کی مقتدر دینی و علمی شخصیت مولانا پیر محمد سعید مجددی کی زیر صدارت تقریب بعنوان 'تقریب اعتراف 40 سالہ قلمی خدمات-عارف عزیز' میں مدھیہ پردیش کے وزیر داخلہ بابو لال گور نے عارف عزیز کی شخصیت اور خدمات پر مضامین کے ضخیم مجموعہ 'عارف عزیز - ایک تجزیہ' کی رسم رونمائی انجام دی۔ مولانا محمد سعید مجددی اور ڈاکٹر عزیز قریشی نے اس عمل میں ان کے ساتھ اشتراک کیا۔ ڈاکٹر عزیز قریشی بحیثیت مہمان خصوصی جلوہ افروز تھے۔ کانگریس ایم ایل اے سید عارف عقیل نے شال اوڑھا کر جناب عارف عزیز کا استقبال کیا۔ بابو لال گور نے اس موقعے پر کہا کہ عارف عزیز نے صحافت کو کبھی اقتصادی فائدے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ وہ سادہ لوح اور خوش مزاج زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے خیالات اعلیٰ قدروں کے حامل ہیں۔ مسٹر گور نے زبان کے حوالے سے کہا کہ ہندی جہاں پیاری زبان ہے وہیں اردو سے زیادہ میٹھی زبان کوئی نہیں۔ تقریب میں مہمان خصوصی ڈاکٹر عزیز قریشی نے اردو اخبارات اور اردو صحافیوں کو دیگر زبانوں کے مساوی حقوق دیے جانے پر زور دیا۔ روزنامہ 'جدید خبر' کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی نے کہا کہ عارف عزیز کی شخصیت کا سب سے بڑا پہلو ان کی قناعت پسندی ہے۔ اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سراج نقوی نے کہا کہ عارف عزیز کی تحریریں گواہ ہیں کہ انھوں نے صحافت کی اعلیٰ قدروں کو قائم رکھا ہے۔ بھوج اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر طارق ظفر نے مولانا برکت اللہ ایجوکیشن سوسائٹی اور یونیورسٹی کی جانب سے تہنیتی سپاس نامہ عارف عزیز صاحب کی نذر کیا۔ راجد حانی کی ہندی صحافت میں ایک معتبر نام مسٹر راج کمار کیسوانی نے کہا کہ عارف عزیز صاحب نے بڑی خاموشی اور پوری ایمانداری سے صحافت کی قدروں کو نہ صرف زندہ و قائم رکھا بلکہ انھیں بلندیوں تک پہنچایا اس پر ہمیں ناز ہے۔ اس موقعے پر کتاب مذکورہ کے مرتبین انعام اللہ لودھی اور مرضیہ عارف نے بھی کتاب کی ترتیب کی روداد بیان کرتے ہوئے قلمی معاونین کے تئیں شکریہ ادا کیا۔ اس باوقار تقریب کے آخر میں کنوینر مولانا برکت اللہ ایجوکیشن سوسائٹی کے سرپرست ایڈوکیٹ حاجی ہارون نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 ستمبر 2015

تہذیب و ثقافت

ریختہ اسٹوڈیو میں مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد

نئی دہلی: اردو شعر و ادب کی سب سے بڑی ویب سائٹ ریختہ کے زیر اہتمام ایک 'مزاحیہ مشاعرہ' کا انعقاد کیا گیا۔ جو اپنی توقعات سے بڑھ کر کئی معنوں میں یادگار

مشاعرہ ثابت ہوا۔ واضح ہو کہ ریختہ کے بانی سنجیو صراف نے شعر و ادب کے تحرک و توانائی کو عام اردو شائقین تک پہنچانے کے لیے اس طرح کی تقریبات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسی کڑی میں یہ ریختہ اسٹوڈیو نوئیڈا میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام تھا۔ ریختہ ویب کے مشیر خاص اور ممتاز شاعر نعمان شوق نے تقریب کا آغاز اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجہ میں کیا۔ شعرائے کرام میں رضی امروہوی نے قہقہہ انگیز اشعار سنا کر محفل کا رنگ جما دیا۔ اس کے بعد نشتر امروہوی کے دل کو چھو جانے والے اشعار سے سامعین محظوظ ہوئے۔ مسرور شاہجہاں پوری نے دلچسپ کلام سنا کر داد پائی۔ اس کے بعد پاپولر میرٹھی نے اپنے مخصوص انداز میں سیاست پر طنز کیا۔ ان کے کلام پر سامعین نے جی بھر کر داد دی۔ آخر میں بزرگ شاعر اسرار جامعی کو یہ کہہ کر مدعو کیا گیا کہ ایک نوجوان شاعر کی گل فشانیاں اور زندہ دلی کو سماعت فرمائیں۔ اسرار جامعی نے اپنے مخصوص انداز میں مزاحیہ کلام سنا کر محفل کو گرما دیا۔ انھوں نے اپنے پرانے اور نئے مزاحیہ اشعار سنا کر قہقہوں کی جھڑی لگا دی۔ مشاعرہ میں موجود قابل ذکر لوگوں میں حقانی القاسمی، ڈاکٹر نایاب، سید اشرف قمر، نجمے تیواری، انیل

کمار سنگھ، سدھیر، امرجیت، پرشانت کمار وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2015

سنہرے سال موسیقی کے رنگ اردو سروس کے سنگ

نئی دہلی: آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے پچاس برس مکمل ہونے کے موقعے پر اردو سروس، ایکسٹرنل سروسز ڈویژن کے زیر اہتمام آکاش وانی میں کلاسیکل موسیقی بعنوان 'سنہرے سال موسیقی کے رنگ اردو سروس کے سنگ' کا انعقاد آکاش وانی براڈ کاسٹنگ ہاؤس اسٹوڈیو نمبر 1 میں کیا گیا۔ اس راگ کی موسیقی کو بین الاقوامی شہرت یافتہ فنکار پنڈت راجن مشرا اور پنڈت ساجن مشرا نے پیش کیا۔ جس میں بڑی تعداد میں فنکاروں اور موسیقی کے دیوانوں نے شرکت کی۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل ای ایس ڈی راج شیکھر ویاس اور ایکسٹرنل سروس کے ڈائرکٹر امان جیوتی مزومدار نے فنکاروں کو گلدستہ پیش کرکے کیا۔ اس موقعے پر ان کے علاوہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر پنڈت وشوناتھ، اے ڈی جی آل انڈیا ریڈیو منوج کمار پیٹریا اور ڈی ڈی جی آل انڈیا ریڈیو وجیت سہدیو بھی موجود تھے۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں ریڈیو ایف ایم کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہوا ہے لیکن ہندوستانی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کا کام دیگر ریڈیو اسٹیشنوں کے ذریعہ ممکن نہیں ہو پا رہا ہے۔ ان ریڈیو اسٹیشنوں میں مغربی موسیقی کو فروغ دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا۔ اردو سروس کا آغاز پچاس برس قبل محض آدھے گھنٹے کے لیے ہوا تھا مگر آج آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس نے زبردست شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ اردو سروس کے ذریعے کلاسیکل موسیقی کو فروغ دیا جاتا رہا ہے۔ اردو سروس کے پچاس برس مکمل ہونے کے موقعے پر 'سنہرے سال موسیقی کے رنگ اردو سروس کے سنگ' کا آغاز کیا گیا ہے اور آگے بھی ایسے پروگرام منعقد ہوتے رہیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اگست 2015

بچوں کا مشاعرہ

امروہہ: اردو اکادمی اترپردیش نے طالبات میں اردو کو فروغ دینے کے لیے ایک منفرد شروعات کی ہے صوبے بھر میں حالیہ دنوں اکادمی کی جانب سے بچوں کا مشاعرہ کے عنوان سے مشاعروں کا انعقاد کیا جا رہا ہے اسی سلسلے کا تیسرا مشاعرہ امروہہ میں چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر نواز دیوبندی کی سرپرستی میں اترپردیش اردو اکادمی کے ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے زیر انتظام امروہہ مسلم گرلس انٹر کالج

میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر طالبات نے عالمگیر شہرت یافتہ شعرا کرام کے کلام اپنے خوبصورت انداز لب ولہجے ترنم و تحت کے ساتھ پیش کیے مشاعرہ کی صدارت انجمن ترقی اردو اترپردیش کے صوبائی کنوینر منظور حسن شوق امروہوی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے شرکت کی ان کے علاوہ چیئرمین نگر پالیکا پریشد امروہہ ڈاکٹر افسر پرویز مہمان ذی وقار کے بطور مشاعرہ میں موجود رہے۔ شمع افروزی معروف شاعرہ پرنسپل امام المدارس انٹر کالج امروہہ ڈاکٹر جمشید کمال نے کی۔ مشاعرے میں کلام پیش کرنے والی طالبات کو اردو اکادمی و ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کی جانب سے انعامات و توصیفی اسناد سے سرفراز کیا گیا۔ روزنامہ سیاسی تقدیر دہلی، 31 اگست 2015

شاعر افتخار راغب کے اعزاز میں شعری نشست

کولکاتا: عالمی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کولکاتا آئے ہوئے دوحہ قطر کے مہمان شاعر افتخار راغب کے اعزاز میں شاندار شعری وادبی محفل کا انعقاد ہوٹل مون گیسٹ ہاؤس زکریا اسٹریٹ میں 31 جولائی بروز جمعہ کولکاتا سے شائع ہونے والے رسالہ صورت کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے منزل کے سکریٹری سید عثمان جاوید، استاد شاعر ضمیر یوسف، خورشید دلدار نگری صاحبان شریک ہوئے۔ جبکہ صدارت کے فرائض اہم نوا کے جنرل سکریٹری و عالمی مشاعرہ کے کنوینر جناب فراغ روہوی نے انجام دیے۔ شعری محفل کی نظامت کرتے ہوئے عمران راقم نے سب سے پہلے مہمان شاعر جناب افتخار راغب کا تعارف پیش کیا۔ افتخار راغب کے تین مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ 'لفظوں میں احساس' 2004 میں آیا جس کی تجدید اشاعت 2011 میں ہوئی۔ دوسرا مجموعہ غزل 'خیال چہرہ' 2007 میں شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ کلام 'غزل درخت' عالم ادب میں اپنی انفرادی لہجے کی بنا پر داد و تحسین حاصل کر رہا ہے۔ افتخار راغب 1990 سے تاحال دوحہ قطر میں مقیم ہیں اور گزشتہ دس برس سے عرب انجینئرنگ بیورو کمپنی میں سول انجینئر اور پروجیکٹ منیجر کے عہدہ پر فائز رہتے ہوئے اردو زبان وادب کی بقا میں شب وروز لگے ہوئے ہیں۔ آپ قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزم اردو قطر کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری بھی کئی برسوں سے بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ افتخار راغب کے تعارف کے بعد مقامی شعراء کرام خصوصاً خورشید دلدار نگری (مہمان شاعر) کا بھی تعارف پیش کیا گیا۔ شعری نشست میں افتخار راغب، فراغ روہوی، ضمیر یوسف، اکبر حسین اکبر، مشتاق ہاشمی، عمران راقم، ریحانہ نواب، ارم انصاری، سحر مجیدی، اشتیاق ساحل نے اشعار پیش کیے۔

پریس ریلیز: افتخار راغب، دوحہ قطر، 23 اگست 2015

اعزاز و اکرام

ماجد دیوبندی دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین نامزد

نئی دہلی: معروف شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی ایک فعال اور متحرک شخصیت کا نام ہے۔ ان سے امید ہے کہ وہ بطور وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی کو ترقی کی نئی منازل

پر لے جائیں گے اور اردو زبان وادب کی بہترین خدمات انجام دیں گے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو اردو اکادمی کا وائس چیئرمین مقرر کیے جانے پر متعدد ادبی وتعلیمی شخصیات نے کیا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو اردو اکادمی کا وائس چیئرمین نامزد کیے جانے کو وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال کا ایک خوش آئند قدم قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ماجد دیوبندی نے اردو سفیر کے طور پر درجنوں ممالک میں ہندوستان کا نام روشن کیا ہے اور ان کے چاہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ماجد دیوبندی کو جس اعتماد کے ساتھ یہ ذمے داری سونپی گئی ہے وہ اسے پوری ایمانداری اور دیانت داری سے ادا کریں گے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر واحد نظیر نے کہا کہ ڈاکٹر ماجد دیوبندی ایک فعال، متحرک اور باہنر شخص ہیں۔ ان سے امید ہے کہ وہ اردو اکادمی اور اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے بہترین کام انجام دیں گے۔ جے این یو کے استاذ اور اکادمی کی گورننگ کونسل کے سابق رکن ڈاکٹر توقیر احمد نے اپنے خیالات پیش کیے۔ انجمن محبان وطن کے جنرل سکریٹری جمیل انجم دہلوی، وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال، کپل مشرا نے بھی خوش آئند پیغام دیا۔ اس موقعے پر جمیل انجم دہلوی نے کہا کہ امید ہے کہ ڈاکٹر ماجد دیوبندی اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے بہترین خدمت گار بھی ثابت ہوں گے اور اردو اکادمی دہلی کی تمام سرگرمیوں کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کریں گے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 18 اگست 2015

خورشید اکبر نے ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کا عہدہ سنبھالا

پٹنہ: بہار انتظامی خدمات کے سینئر ڈپٹی کلکٹر، اردو کے معروف ومقبول شاعر و ادیب خورشید اکبر نے ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی حیثیت سے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے

اردو ڈائرکٹوریٹ میں اپنے عہدے کی ذمے داریاں سنبھال لی ہیں۔ جناب اکبر اپنی اصول پسندی اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کے سبب نمایاں شناخت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی ذمے داریاں سنبھالتے ہی تمام رفیق کاروں سے کہا کہ ہمیں اپنی منصبی ذمے داریوں کو پوری ایمانداری اور لگن کے ساتھ ادا کرنا چاہیے تاکہ اردو ڈائرکٹوریٹ کو مزید معنویت حاصل ہو اور اردو زبان کے مزید فروغ و اشاعت کا کام ہو سکے۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ انھیں صدر نشیں اردو مشاورتی کمیٹی بہار کی شکل میں جناب شفیع مشہدی جیسی اردو کی عبقری شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے۔ جناب امتیاز کریمی جیسے فعال اور اردو پرور ڈائرکٹر کے ساتھ اردو کی خدمت کا موقع ملا ہے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 20 اگست 2015

ڈاکٹر رضا حیدر انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر اردو گھر نئی دہلی میں 7 اگست کو پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں مجلس عاملہ کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر رضا حیدر کو انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کا رکن اور خازن مقرر کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رضا حیدر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انھیں انجمن کے عہدہ داروں نے اس اہم منصب سے سرفراز کیا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آنے والے دنوں میں نہ صرف انجمن ترقی اردو ہند اور غالب انسٹی ٹیوٹ بلکہ دلی اور

بیرون دلی اردو کے تمام بڑے ادارے مل کر اردو زبان و ادب اور ملک کی تہذیب و ثقافت اور روایات کو آگے بڑھائیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اگست 2015

پاپولر میرٹھی فخرِ ملت اعزاز سے سرفراز

دہلی: شاعری کی دنیا میں طنز و مزاح کے حوالے سے عالمی پیمانے پر ہندوستان کا نام روشن کرنے والے اعجاز الدین شاہ پاپولر میرٹھی کو دہلی کے ایل ٹی جی آڈیٹوریم میں پرائیڈ

آف نیشن اعزاز سے سرفراز کیا گیا جس پر اتر پردیش اردو ادب سوسائٹی کی جانب سے ان کو مبارکباد پیش کی گئی۔ سوسائٹی کے صدر کوثر علی عباسی کی جانب سے اس سلسلے میں کہا گیا ہے کہ پوری دنیا میں طنز و مزاح کے حوالے سے پاپولر میرٹھی اپنی ایک منفرد شناخت قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری جہاں ہمیں ہنسنے کا موقع فراہم کرتی ہے تو دوسری جانب ان کی شاعری میں ایک طنز بھی ہوتا ہے جو سماج کی ایک کڑوی حقیقت ہے۔ انجمن فلم اکادمی کے چیئرمین سندیپ مارواہ اور ممبر آف پارلیمنٹ آر کے سنہا کے دست مبارک سے حاصل ہونے والا پرائڈ آف نیشن قیمتی اعزاز ان کی محنت کا پھل ہے، پاپولر میرٹھی کو کئی قومی و عالمی سرکاری و غیر سرکاری اعزاز سرزمین ہندوستان اور بیرون ملک میں حاصل ہو چکے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 اگست 2015

ڈاکٹر وارثی کو پرواسی بہاری سمان ایوارڈ

نئی دہلی: ماہر لسانیات اور واشنگٹن یونیورسٹی میں درس

و تدریس کا فریضہ انجام دینے والے ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی کو سری رام سینٹر آڈیٹوریم میں بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کے ہاتھوں 'پرواسی بہاری سمان' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار نقد، ایک شال اور توصیفی سند پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر وارثی کو سیلاب متاثرہ اپنے گاؤں اور علاقے کو خود انحصار بنانے کے لیے مسلسل جد و جہد کی وجہ سے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ وہ اپنے گاؤں اور علاقے کے مسائل پر ہمیشہ لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے مضامین/رپورٹ کی بنیاد پر انتظامیہ کی نظر اس علاقے کی جانب ہوئی۔ ڈاکٹر وارثی ہر سال چار پانچ ماہ انڈیا میں گزارتے ہیں اور انتہائی خاموشی سے بہار اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے عملی قدم اٹھاتے رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر وارثی کو 2012 میں میکلیا ڈیفیکلٹی ایوارڈ 2005 میں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے کی جانب سے 'ان سنگ ہیرو' اور 2003 میں بنگال اردو اکادمی کی طرف ان کی کتاب 'ڈیلوسمان کمیونیکیشن اپلی کیشن ان ملٹی لنگول DTP' پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ عالمی سطح پر لسانیات کے لیے معروف و مقبول ڈاکٹر وارثی واشنگٹن یونیورسٹی میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ وہ یونائیٹڈ اسٹیٹ میں جنوبی ایشیا کی زبان و کلچر کے فروغ کے لیے بھی کوشاں ہیں۔ ڈاکٹر وارثی جنوبی ایشیائی زبان و ثقافت پر بنی تصانیف کی وجہ سے علمی دنیا میں معروف ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 9 اگست 2015

اشرف استھانوی کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ

پٹنہ: بہار کے معروف صحافی، مصنف اور عوامی اردو نفاذ کمیٹی بہار کے سربراہ اشرف استھانوی کے اعزاز میں

لسانی تنظیم ایوان اردو مجلس (رجسٹرڈ) پٹنہ کے زیر اہتمام پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق سیشن آفیسر بدر احمد خاں کی رہائش گاہ واقع لنگوٹی باغ میں 'ایک شام اشرف استھانوی کے نام' کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں کثیر تعداد میں موجود اردو کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے ان کی صحافتی اور تصنیفی خدمات نیز اردو کی ترویج و ترقی میں ان کے گراں قدر کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر انھیں لائف اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مہمان خصوصی بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین پروفیسر شمشاد حسین نے کہا کہ تقریباً تین دہائیوں سے اشرف استھانوی صحافت سے منسلک ہیں اور ادھر ایک درجن سے زائد کتابیں ان کی منظر عام پر آ چکی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 اگست 2015

ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور اختر الاسلام ندوی کے اعزاز میں استقبالیہ

نئی دہلی: اردو پریس کونسل آف انڈیا کے زیر اہتمام ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں ریاض (سعودی عرب) میں مقیم معروف سماجی کارکن اختر الاسلام ندوی کو اعزاز سے نوازا گیا اور معروف شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو اردو اکادمی کا وائس چیئرمین بنائے جانے پر استقبالیہ دیا گیا۔ پہلی نشست کی صدارت ڈاکٹر مجتبیٰ فاروقی، جبکہ دوسری 'شعری نشست' کی صدارت ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کی۔ اس موقعے پر اختر الاسلام ندوی نے اس بات پر زور دیا۔ ہمیں قول و فعل کے تضاد سے بچنا چاہیے اور اپنے بچوں کی پرورش خالص اسلامی اصول کے مطابق کرنی چاہیے تاکہ ایک صالح معاشرہ تشکیل پائے۔ کونسل کے چیئرمین عبدالماجد نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے اور کونسل کے مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروگرام میں مقامی ممبر اسمبلی امانت اللہ خان بطور خاص شریک ہوئے۔ کنوینر کمل عارفی اور معین شاداب نے نظامت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اگست 2015

رسم اجرا:

تاریخ ادب اردو

علی گڑھ: 'علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ' کے زیر اہتمام ڈاکٹر محمد فاروق خاں کی ترتیب کردہ کتاب 'تاریخ ادب اردو' کا امروہہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر اجرا کرتے ہوئے اتر پردیش کے صوبائی وزیر برائے مادھیمک شکشا جناب محبوب علی نے کہا کہ سماجوادی پارٹی روز اول سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے تعلق سے

سنجیدہ رہی ہے اور اردو کو اس کا جائز مقام دلانا ہم لوگوں کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی سمت میں بھی اہم اقدامات پر غور کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ دیگر معیاری کتب کے ساتھ ہی بچوں کے لیے معیاری کتب اور طلبا و طالبات کے لیے درسی کتب کے ساتھ ہی نیٹ اور جے آر ایف اور اسی قبیل کے دیگر باوقار امتحانات کی تیاری کے لیے بھی کم قیمت پر معلوماتی کتب

شائع کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر فاروق خاں نے جو کتاب ترتیب دی ہے وہ اردو کی تاریخ کو سمجھنے میں معاونت کرے گی۔

روزنامہ سیاسی تقدیر، دہلی، 19 اگست 2015

رسالہ 'فکر و تحریر'

معروف شاعر، نثر نگار و معلم پروفیسر اعزاز افضل کی یاد میں قائم شدہ 'بزم افضل' کی ایک خصوصی ادبی نشست ہوٹل بیسٹ انٹرنیشنل، تارک دتا لین، کلکتہ 19 میں بزم کے سرپرست جناب شاہ محمد قادری کی میزبانی میں منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت جناب صفدر مرزا نے کی۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر نعیم انیس (جنرل سکریٹری، بزم افضل) نے کہا کہ یہ مقام مسرت ہے کہ 'بزم افضل' کے زیر اہتمام جاری خالص ادبی قدروں کے ترجمان سہ ماہی رسالے 'فکر و تحریر' کا پانچواں شمارہ منظر عام پر آ گیا ہے اور اسی کے ساتھ ہمارے رسالے نے اپنی زندگی کا ایک سال پورا کر لیا ہے۔ اس قلیل مدت میں 'فکر و تحریر' کا شمارہ ملک اور بیرون ملک کے ادبی حلقوں میں پہنچنے لگا ہے اور ادبی حلقوں سے اس کی پذیرائی بھی ہو رہی ہے۔ میزبان نشست جناب شاہ محمد قادری نے 'فکر و تحریر' کے پانچویں شمارے کی رونمائی کے بعد پروفیسر اعزاز افضل سے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے سامنے میں جو لب کشائی کی جرأت کر رہا ہوں وہ صرف اور صرف میرے استاذی محترم پروفیسر اعزاز افضل کی دین ہے۔ شاہد اقبال نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ جلسے کے دیگر شرکا میں اختر حسین (صدر بزم)، جاوید اختر، محمد سجاد الدین، محمد راشد حسین، ساجد پرویز، ساجد خان، شیخ پرویز، عارف بیگ، محمد شمشیر وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ اخبار مشرق، کولکاتا، 30 اگست 2015

انشائیہ کی روایت: مشرق و مغرب کے تناظر میں

ناگپور: "اردو انشائیہ کے ساتھ یہ مسئلہ رہا ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور ہر قسم کی تحریروں کو انشائیہ سمجھ لیا گیا ہے جبکہ یہ مضمون کی ایک ایسی قسم ہے جس میں انوکھی اور گہری

باتیں بھی ہلکے پھلکے انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے اس صنف کی خصوصیات اور فنی باریکیوں کو سمجھ کر انشائیے تحریر کیے اور انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں' نامی کتاب میں انھوں نے اردو کے نمائندہ انشائیہ نگاروں کی تخلیقات کے عمدہ نمونے جمع کر کے ان کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے کی تحقیقات میں یہ ایک اہم تصنیف ہے۔" ڈاکٹر غلام السیدین ربانی، ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ نے ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی تصنیف 'انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں' کے جشن رونمائی کے دوران کیا۔ بزم اردو ناگپور کی جانب سے منعقدہ اس تقریب میں جدید افسانہ نگار م ناگ اور معروف ادیب و محقق ڈاکٹر آغا غیاث الرحمن مہمانان خصوصی تھے۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے انجام دیے۔ ڈاکٹر ساحل نے اپنے صدارتی خطبے میں افسانہ نگار م ناگ کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیا اور انھیں اردو کا ایک اہم افسانہ نگار قرار دیا اسی طرح انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں، کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ محمد اسد اللہ نے اپنے انشائیوں کے اولین مجموعہ 'بوڑھے کے رول میں' کی اشاعت سے اپنی شناخت قائم کی تھی اور اب اس کتاب میں انھوں نے انشائیہ نگاری کی تاریخ کو مبسوط ارتباط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس مجلس میں جدید افسانہ نگار م ناگ نے جو ممبئی سے تشریف لائے تھے، اپنا ایک افسانہ پیش کیا جسے بے حد پسند کیا گیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اسد اللہ، 30 گلستان کالونی، ناگپور، 24 اگست 2015

گئو دان کے بعد

علی گڑھ: ادارہ 'تہذیب الاخلاق' اور یو جی سی ایچ آر ڈی سی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک پروقار تقریب میں ضامن

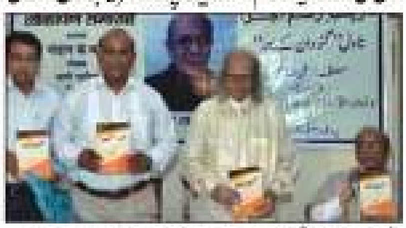

علی کے ناول 'گئو دان کے بعد' کا اجرا کیا گیا۔ صدر جلسہ معروف فکشن نگار پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہا کہ 'گئو دان کے بعد' ایک نئی کوشش ہے۔ ضامن علی نے کرداروں کے ساتھ انصاف کیا ہے اس کو ایک آزاد ناول کی حیثیت سے بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند بڑے افسانہ نگار تھے اس لیے ان کی تخلیق گئو دان مقبول تو ہوئی لیکن عالمی ادب میں گئو دان کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو ہندوستان میں ہے۔ شعبہ اردو کے پروفیسر صغیر افراہیم نے 'گئو دان کے بعد' کے تخلیق کار علی ضامن کاظمی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ان کی پہلی تخلیق ہے انھوں نے جب پہلی بار پریم چند کی تصنیف گئو دان کا مطالعہ کیا تھا تو وہ بے حد متاثر ہوئے، ناول کے کردار 'ہوری' کے انجام پر آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انھوں نے طے کیا کہ وہ اس کو آگے بڑھائیں گے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ علی ضامن کا 'گئو دان' ناول نگاری کی دنیا میں ایک انفرادی کام ہے۔ معروف استاد پروفیسر مولا بخش نے کہا کہ گئو دان کے بعد اردو میں پہلی کوشش ہے۔ ضامن علی نے آج کے گاؤں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے جو قابل ستائش ہے۔ مہمان خصوصی پرو وائس چانسلر سید احمد علی نے کہا کہ 'گئو دان کے بعد' ایک نیا تجربہ ہے۔ توقع ہے کہ شائقین میں مقبول ہوگا۔ ڈاکٹر سیما صغیر نے 'گئو دان کے بعد' کے سلسلہ میں کہا کہ ناول نگاری کی دنیا میں ایک انوکھا تجربہ ہے۔ جبکہ ڈاکٹر فائزہ عباسی نے بھی مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے 'گئو دان کے بعد' کے خالق علی ضامن کا استقبال کیا۔ اس موقع پر پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، پروفیسر محمد ظفر، انجینئر فرقان سنبھلی، ڈاکٹر محمد قمر، سید عتیق الرحیم، منوج علی گڑھی کے ساتھ علی ضامن کے خاندان کے افراد بھی موجود تھے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 29 اگست 2015

ادب پنجاب

مالیر کوٹلہ: ڈاکٹر رحمان اختر اسسٹنٹ پروفیسر پنجابی یونیورسٹی کی نئی تصنیف 'ادب پنجاب' کی رسم اجرا چنڈی گڑھ کی ایک پروقار تقریب میں وزیر خزانہ جناب پرمیندر سنگھ ڈھینڈسہ کے ہاتھوں کی گئی۔ اس موقعے پر سردار پرمیندر سنگھ ڈھینڈسہ نے ڈاکٹر رحمان اختر کو ان کی اس کاوش پر مبارک باد دیتے ہوئے اردو اور پنجاب کے اٹوٹ رشتے پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب کی سرزمین اردو کی جنم بھومی ہے۔ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ زبان ہے جس نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو قوت بخشی تھی اور ہندوستان میں مشترکہ تہذیب بنانے اور قومی شعور میں بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

روزنامہ ہند سماچار، چنڈی گڑھ، 25 اگست 2015

آواز کا سفر

رامپور: متعدد ناولوں اور افسانوں کی خالق معروف ادبی شخصیت انجم بہار شمسی کی نئی کاوش ایک افسانوی مجموعہ 'آواز کا سفر' کا اجرا اتر پردیش کے وزیر شہری ترقیات محمد اعظم خاں کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ ضلع سہکاری بینک کے وسیع کانفرنس ہال میں منعقدہ ادبی تقریب کی صدارت معروف سینئر افسانہ نگار اور کابینہ وزیر کی ہمشیرہ نکہت افلاک نے کی۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے

ڈاکٹر حسن احمد نظامی اور ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رباب انجم نے اپنے منفرد انداز میں ادا کیے۔ اس موقعے پر شرکا کو خطاب کرتے ہوئے کابینہ وزیر محمد اعظم خاں نے کہا کہ ادبی شخص بہت حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے وہ اپنے ارد گرد سماج میں رونما واقعات کو محسوس کرتے ہوئے اس خوبصورتی سے قلم بند کرتا ہے کہ قاری اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ کابینہ وزیر نے 'آواز کا سفر' کی مصنفہ انجم بہار کی قلمی کاوش کی بھی ستائش کی۔

روزنامہ جدید خبر، دہلی، 24 اگست 2015

بے گناہ مظلوم

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری کے ہاتھوں وائس پریسیڈنٹ ہاؤس میں امروہہ سے تعلق رکھنے والے محمد یاسر عباسی ڈپٹی کمانڈنٹ (سی آر پی ایف) وزارت داخلہ کی انگریزی میں تصنیف کردہ کتاب 'بے گناہ مظلوم' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس موقعے پر محمد حامد انصاری نے کتاب کے مصنف کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب سے معاشرے میں بہتر پیغام جائے گا اور نئی نسل اس کتاب سے استفادہ کرے گی۔ یہ کتاب سماجی تانے بانے کی جدوجہد پر مبنی اور انسانی کمزوریوں کو سہل انداز میں بخوبی پیش کرتی ہے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 29 اگست 2015

غزل: ردیف قافیہ اور ویاکرن

میرٹھ: ڈاکٹر کرشن کمار بیدل کی کتاب 'غزل: ردیف قافیہ اور ویاکرن' ہندی شعرا کے لیے فال نیک ہے۔ ہندی میں غزل کے عروض اور قواعد پر میرٹھ سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے۔ زمانے سے ہندی کے حلقوں میں کسی ایسی کتاب کی کمی محسوس کی جا رہی تھی، جس سے شاعری کے فن میں پختگی آسکے۔ ڈاکٹر بیدل کی کتاب نے اس بڑی کمی کو بہت حد تک پورا کیا ہے۔" یہ الفاظ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے تھے۔ وہ چیمبر آف کامرس میں بین الاقوامی ساہتیہ کلا منچ کے بینر کے تحت ڈاکٹر کرشن کمار بیدل کی ہندی میں شائع شدہ کتاب 'غزل: ردیف قافیہ اور ویاکرن' کی رسم اجرا کے موقعے پر بطور مقرر خصوصی اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ "کرشن کمار بیدل نے کتاب ہذا میں عمدگی سے اردو کی شعری اصناف، غزل کی روایت، قافیہ، تضمین، عیوب شعر، بحر، بحر کی اقسام، تقطیع وغیرہ کو تفصیل سے مع مثال سمجھایا ہے۔" جلسے کی صدارت برکلے یونیورسٹی کے پروفیسر وید پرکاش بنگ نے کی۔ الہ آباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر نور نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ کرشن کمار نے ہندی والوں پر احسان کیا ہے۔ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر اور ناظم کمار پنکج نے خوبصورتی سے انجام دیے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر، دہلی، 25 اگست 2015

خورشید الاسلام ایک شاعر ایک ناقد

حیدرآباد: خورشید الاسلام اردو ادب کا ایک جانا پہچانا نام ہے، نقاد کی حیثیت سے ان کی خدمات کا شہرہ ہے، تاہم شاعر کے طور پر ان کی شخصیت سے عوام پوری طور پر آگاہ نہیں تھے۔ ڈاکٹر ظفر گلزار کی کتاب نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد شاہد شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کتاب 'خورشید الاسلام، ایک شاعر ایک ناقد' کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے اپنے صدارتی خطاب میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کی جانب سے مرکز کے سیمینار ہال میں اس تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر حیدرآباد کے ممتاز اسکالرس پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر مجید بیدار اور ڈاکٹر حبیب نثار کے علاوہ پروفیسر وہاب قیصر اور ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی نے اس تحقیقی کتاب کا دلچسپ انداز میں جائزہ پیش کیا۔ حبیب اللہ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ ترجمہ کی تلاوت اور ترجمہ سے جلسے کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر ظفر گلزار کے کلمات تشکر پر جلسے کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ جدید خبر، دہلی، 27 اگست 2015

وفیات:

مجاز کی بہن حمیدہ سالم

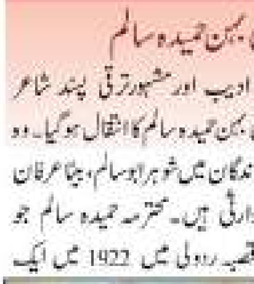

نئی دھلی: ممتاز ادیب اور مشہور ترقی پسند شاعر اسرار الحق مجاز کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم کا انتقال ہوگیا۔ وہ 93 برس کی تھیں۔ پسماندگان میں شوہر ابو سالم، بیٹا عرفان سالم اور بیٹی سنبل وارثی ہیں۔ محترمہ حمیدہ سالم جو اتر پردیش کے مشہور قصبہ ردولی میں 1922 میں ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی خاتون پوسٹ گریجویٹ تھیں۔ ان کی تصنیفات شورش دوراں، ہم ساتھ تھے، پرچھائیوں کے اجالے اور ہر دم رواں ہے زندگی، کو اردو کے ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ اپنے بھائی مجاز کے انتقال کے بعد ان کی زندگی پر مبنی طویل سوانحی مضمون 'جگن بھیا' کو کافی سراہا گیا تھا، جس کے ایک ایک جملے سے بہن کی محبت ٹپکتی تھی۔ حمیدہ سالم کے انتقال پر کانگریس کے جنرل سکریٹری شکیل احمد سمیت دیگر ادبی اور سماجی شخصیات نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ شکیل احمد نے کہا کہ حمیدہ سالم کی موت ادبی دنیا کا بڑا خسارہ ہے۔ انھیں جامعہ نگر اوکھلا قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 17 اگست 2015

راکیش اہلوالیہ

نئی دھلی: پورے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی کتابیں سپلائی کرنے والے 'اہلوالیہ بک ڈپو' کے مالک راکیش کمار اہلوالیہ کا اپنی رہائش گاہ واقع پیتم پورہ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 63 سال تھی، ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے ہمانشو اہلوالیہ اور دوسرے پرانشو اہلوالیہ ہیں۔ ان کا جسد خاکی ان کی وصیت کے مطابق مولانا آزاد میڈیکل کالج کو سونپ دیا گیا۔ ان کے والد جانکی ناتھ اہلوالیہ 1954 سے ہی اردو کی خدمت کر رہے تھے، ان کے انتقال کے بعد انھوں نے کام کو سنبھالا۔ وہ ایماندار، محنتی، منکسار اور بااخلاق انسان تھے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے پٹنہ، لکھنؤ، ممبئی، حیدرآباد، کرناٹک، کولکاتا اور ملک کے دیگر شہروں میں خاص طور سے اردو ادب کی کتابیں سپلائی کرتے تھے۔ ان کے اچانک انتقال سے اہل اردو میں رنج و غم ہے۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی تقریباً نصف صدی سے اردو کی خدمت کرنے والا یہ گھرانہ اردو سے محروم ہوگیا کیونکہ اب ان کے وارثین کو ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ان کے دونوں صاحب زادے بینک میں ملازمت کرتے ہیں۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 8 ستمبر 2015

شاعر و ادیب نثار احمد کلیم

بیدر: کرناٹک کے ضلع بیدر سے تعلق رکھنے والے مشہور شاعر و ادیب مسٹر نثار احمد کلیم کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 85 برس تھی۔ انھیں اس سال کرناٹک اردو اکادمی سے ایوارڈ ملا تھا۔ نثار احمد کلیم نے اردو اور ہندی میں دو درجن سے زائد کتابیں تحریر کی تھیں۔ انھوں نے کئی دہائیوں سے ہندی راشٹر بھاشا کورس کی امتحانی کمیٹی کے صدر کے طور پر خدمات انجام دی تھیں۔ ان کی نماز جنازہ جامع مسجد بیدر میں ادا کی گئی اور تدفین آبائی قبرستان عقب مسجد حسینی

تکیہ موضع بگدل شریف (باغ عدل) میں عمل میں آئی۔ نثار احمد کلیم کو کئی ایوارڈس سے نوازا گیا تھا جن میں دہلی میں 2012 میں بیسٹ سٹیزنس آف انڈیا ایوارڈ 2012 میں دہلی میں راج بھاشا ایوارڈ، گوگن رام ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی ہریانہ کی جانب سے دیا گیا ایوارڈ بھی شامل ہے۔ انھیں 2013 میں ڈکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کی جانب سے سینئر پرچارک ایوارڈ پیش کیا گیا۔ علاوہ ازیں ادب اسلامی ظہیر آباد کی جانب سے بیسٹ سٹیزن ایوارڈ ہیومن رائٹس ویلفیئر بورڈ بیجاپور سے قومی یکجہتی ایوارڈ، تنظیم تحفظ اردو آندھرا پردیش سے بیسٹ شاعر ایوارڈ کے علاوہ کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے ان کی تخلیقات پر ایوارڈ عطا کیے گئے تھے۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 20 اگست 2015

صحافی عتیق مظفرپوری

پٹنہ: روزنامہ راشٹریہ سہارا سے ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک وابستہ رہے سینئر صحافی عتیق مظفرپوری کا پٹنہ کے پارس سپر اسپیشلٹی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 62 سال تھی۔

عتیق مظفرپوری ان دنوں اپنے آبائی گاؤں مہیش استھل، ضلع مظفرپور میں تھے جہاں انھیں ڈینگو ہونے اور پلیٹ لیٹس کم ہوجانے پر پٹنہ میڈیکل لایا گیا تھا، لیکن بعد میں انھیں پارس اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔ عتیق مظفرپوری اپنے طویل صحافتی کیریئر میں ام افضل کے اخبار تو سمیت کئی اخبارات سے وابستہ رہے۔ ان میں روزنامہ راشٹریہ سہارا سے ان کی وابستگی سب سے طویل عرصے تک رہی لیکن اپنی علالت کے سبب انھوں نے مستعفی ہوکر آبائی گاؤں میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ انھوں نے ماہنامہ افسانوی دنیا اور تعمیر اراست (ہفت روزہ) بھی نکالے اور 15 روزہ سائبان بھی شائع کیا۔ ان کا ایک بیٹا صحافی اور باقی تین بیٹے ڈاکٹری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ عتیق مظفرپوری کی تین بیٹیوں میں سے دو شادی شدہ ہیں۔ عتیق مظفرپوری بیباک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ کلام شاعر بھی تھے اور ان کی غزلیں مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ عتیق مظفرپوری کی تدفین ضلع مظفرپور کے ان کے آبائی گاؤں میں ہوئی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 19 اگست 2015

صحافی منیر نیازی

کولکاتا: مشرقی ہند کے بزرگ اردو صحافی منیر نیازی کا آبائی وطن غازی پور کے گوز سرا گاؤں میں انتقال ہوگیا۔ وہ 77 برس کے تھے اور کچھ دنوں سے ان کی طبیعت ناساز چل رہی تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین شادی شدہ بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ منیر نیازی نے کلکتہ کے شہرہ آفاق اردو اخبار آزاد ہند کے ادارتی شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے دہائیوں وابستہ رہنے سے قبل ہندی پتر کار رہتا کے ذریعے اپنا کریئر شروع کیا تھا۔ آزاد ہند سے ایک مرحلے پر تعلق ختم کرکے وہ دہلی چلے گئے تھے۔ جہاں کچھ دنوں تک وہ اردو خبر رساں ایجنسی یو این آئی کی اردو سروس سے وابستہ رہے۔ کولکاتا کو خیرباد کہنے سے قبل مرحوم نے فروخت شدہ آزاد ہند کے نئے منتظمین کی دعوت پر دوبارہ اخبار سے وابستگی اختیار کی تھی لیکن صحت نے یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہنے دیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 28 اگست 2015

پروفیسر مجتبیٰ حسین موسوی

لکھنؤ: شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے سابق صدر اور پوروانچل یونیورسٹی کے سابق ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشن پروفیسر مجتبیٰ حسین موسوی کا سرفراز گنج میں واقع قیام گاہ پر جمعہ 28 اگست کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم کو ہردوئی روڈ پر واقع کربلا عباس باغ میں کثیر تعداد میں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد لحد کیا گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے شامل ہیں۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر تقریباً 85 برس تھی اور وہ کافی عرصے سے علیل تھے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین موسوی ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ہی ایک بہترین مقرر اور شاعر بھی تھے۔ نعت ومنقبت اور قصائد پر مشتمل ان کے دو مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔ انکساری اور وضع داری ان کی شخصیت کا اہم حصہ تھی۔ اپنے طلبا سے بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 31 اگست 2015

خراج عقیدت:

عتیق صدیقی کی برسی پر تعزیتی جلسہ

نئی دہلی: پرانی دہلی کی معروف شخصیت سینئر صحافی اور سماجی خدمت گار مرحوم عتیق صدیقی کی پہلی برسی کے موقع پر عتیق صدیقی چیریٹیبل فاؤنڈیشن اور تعلیمی سماجی تنظیم خدمت کی جانب سے تعزیتی جلسے کا انعقاد صدیق منزل گلی قاسم جان بلی ماران میں کیا گیا جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیات سمیت مرحوم عتیق صدیقی کے اہل خاندان اور پرانی دہلی کے معزز افراد نے شرکت کی۔ اس موقع پر گلزار دہلوی نے کہا کہ مرحوم انجمن تعمیر اردو کے سرگرم روح رواں اور ایک بہترین صحافی و وکیل تھے۔ انھوں نے اخبارات اور رسالے نکالے۔ قوم کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ کانگریس کے ترجمان اور سینئر صحافی م افضل نے مرحوم عتیق کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ صحافی ہونے کے ساتھ سیاسی علم وشعور بھی رکھتے تھے۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ مرحوم عتیق صدیقی کی زندگی کا اگر نچوڑ نکالیں تو وہ صرف خدمت خلق تھی، وہ وکیل تھے مگر انھوں نے سچائی اور خدمت خلق کو اپنا مقصد بنایا۔ دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں نے کہا کہ مرحوم کی زندگی کھلی کتاب تھی۔ انھوں نے جھوٹ فریب سے دور خدمت خلق کو اپنا مشغلہ بنایا۔ ان کی زندگی سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ بلیماران کے ممبر اسمبلی عمران حسین نے مرحوم عتیق صدیقی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مرحوم عتیق صدیقی کے صاحب زادے ڈاکٹر عامر صدیقی نے اس موقع پر کہا کہ ان کے والد قوم کے درد کو محسوس کرکے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے انھوں نے وکالت نہ کرکے قوم کی خدمت کا راستہ اختیار کیا۔ شیخ علیم الدین اسعدی نے بھی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں معزز افراد نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ روزنامہ خبریں دہلی، 10 اگست 2015

ایک شام مشتاق لکھنوی کے نام

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام جنت روز پبلک اسکول، گڑھی پیر خاں میں شہر نگاراں کے ممتاز شاعر مشتاق حسین مشتاق لکھنوی کی یاد میں بعنوان 'ایک شام مشتاق لکھنوی کے نام' علمی و ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب کی صدارت درگاہ شاہ عبدالرحمن، تیرہ گاؤں کے سجادہ نشین الحاج صوفی سید اظہار علی نے کی، جبکہ نظامت کا فریضہ خوش فکر شاعر شکیل گیاوی نے انجام دیا۔ پروگرام کو خطاب کرنے والوں میں صدر محترم کے علاوہ صاحب طرز مقالہ نگار رضوان فاروقی، ڈاکٹر ثروت تقی، مرحوم مشتاق لکھنوی کے برادر خورد سعید حسین برق، فیض حسین روحی، فرید حسین فرید کے نام قابل ذکر ہیں۔ شرکا میں مرحوم کے اہل خاندان میں محمد باقر علی باقر، محمد عمران اور شعرا میں حیدر علوی، رضا لکھنوی، عارف محمود آبادی، کمال ادیب، مظہر علی عباس اور ڈاکٹر منصور حسن خاں اور شکیل گیاوی کے نام اہم ہیں۔

روزنامہ ہمارا سماج دہلی، 20 اگست 2015

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

معالجات (جلد اول، دوم، سوم چہارم)
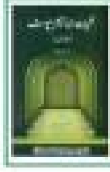
مصنف: وسیم احمد اعظمی
صفحات: 2273 (مکمل سیٹ)
قیمت: 613 روپے (مکمل سیٹ)

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر
مرتب: ڈاکٹر وہاب اشرفی
صفحات: 740
قیمت: 305 روپے

مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال
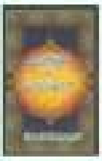
مصنف: آر پی ترپاٹھی
مترجم: ریاض احمد خاں شروانی
صفحات: 543
قیمت: 242 روپے

انیس کے سلام
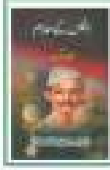
مرتب: علی جواد زیدی
صفحات: 307
قیمت: 113 روپے

تعلیمی نفسیات
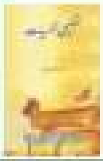
مصنف: ڈاکٹر طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/100 روپے

ہند کی مایہ ناز ہستیاں ودیگر مضامین

مصنف: بی شیخ علی
صفحات: 176
قیمت: -/35 روپے

پیسے کی کہانی
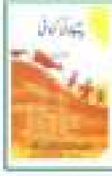
مصنف: غلام حیدر
صفحات: 80
قیمت: -/22 روپے

شماریات
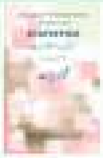
ادارہ
صفحات: 95
قیمت: -/50 روپے

حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد
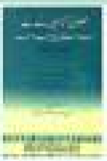
مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل
صفحات: 83
قیمت: -/24 روپے

لکھنؤ کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر

مصنف: سید عبدالباری
صفحات: 690
قیمت: -/286 روپے

شرار جستجو
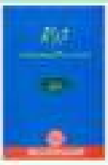
مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
صفحات: 125
قیمت: -/80 روپے

ہمارا طرز زندگی اور بیماریاں

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی
صفحات: 69
قیمت: -/42 روپے

ادبی صحافت (آزادی کے بعد)

مصنف: عبدالحی
صفحات: 414
قیمت: -/185 روپے

لکیر کا فقیر
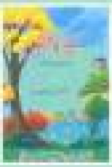
مصنف: ڈاکٹر نسرین رمضان سید
صفحات: 131
قیمت: -/30 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اول تا سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 1454 (مکمل سیٹ)
قیمت: -/420 روپے (مکمل سیٹ)

زندگی نامہ قرۃ العین

تحقیق وترتیب: جمیل اختر
صفحات: 296
قیمت: 143 روپے

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) کامرس

ادارہ
صفحات: 306
قیمت: 141 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, October-2015, Vol.17, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: 24/09/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000